



این تربیت

أنش

ایک استاد ابراہیم مہدی

توحید

قیصر عباس
ماقب نقوی



ناشر

مَصْبُحُ الْهُدَى لِكَيْشَن

۱۰. گنگارام بلڈنگ ○ شاہراہ قائد اعظم ○ لاہور

پاکستان

ایک نیا دور
انکسار و فتنہ
دیگر حضرات کی بنیاد
کے تیس سال کا طالب
کیہ نذر عباس
۱۸۵۷ء - ۱۸۵۸ء

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۱۵	۱۔ ماں باپ کی ذمہ داری	۸۱	۱۸۔	ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ	۸۱
۲۔	تربیت کرنے والوں کی آگاہی	۸۲	۱۹۔	ماں کے دودھ کی ممانعت	۸۲
۳۔	اور باہمی تعاون	۸۳	۲۰۔	دودھ پلانے کا پروگرام	۸۳
۴۔	تربیت عمل سے نہ کہ زبان سے	۸۹	۲۱۔	اگر ماں کا دودھ نہ ہو تو	۸۹
۵۔	گھر بڑا دانی بھگڑے سے پرہیز	۹۱	۲۲۔	دودھ چھڑوانا	۹۱
۶۔	ماں کی حیثیت سے زندگی کا آغاز	۹۲	۲۳۔	بیٹی یا بیٹا	۹۲
۷۔	جنین کی سلامتی میں ماں کی غذا کا اثر	۹۶	۲۴۔	بچے کا نام	۹۶
۸۔	جنین کے اخلاق پر ماں کی غذا کا اثر	۱۰۱	۲۵۔	صحت و صفائی	۱۰۱
۹۔	ماں کی غذا	۱۰۶	۲۶۔	بچے کی نیند اور آزادی	۱۰۶
۱۰۔	تنبہ کو نوشی	۱۰۸	۲۷۔	زندگی کا احساس ترین دور	۱۰۸
۱۱۔	اگر حاملہ عورت بیمار ہو جائے	۱۱۲	۲۸۔	نوزلہ اور اخلاقی تربیت	۱۱۲
۱۲۔	ماں کی نفسیاتی کیفیت کا جنین پر اثر	۱۱۶	۲۹۔	نومولود اور ذہنی تربیت	۱۱۶
۱۳۔	حاملہ خواتین کو ایک نصیحت	۱۱۹	۳۰۔	احساسِ وابستگی	۱۱۹
۱۴۔	صاف ستھری فضا	۱۲۳	۳۱۔	جب بچہ باہر کی دنیا کو دیکھنے لگتا ہے	۱۲۳
۱۵۔	استقامتِ عمل	۱۲۴	۳۲۔	محبت	۱۲۴
۱۶۔	پیدائش کی مشکلات	۱۲۲	۳۳۔	اطہارِ محبت	۱۲۲
۱۷۔	ولادت کے بعد	۱۲۶	۳۴۔	محبت کام نکلانے کا ذریعہ نہیں	۱۲۶
۱۸۔	ماں کا دودھ بہترین غذا ہے	۱۲۷	۳۵۔	محبت جو تربیت میں حاصل نہ ہو	۱۲۷

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
۲۵۰	۵۶۔ گھر کی آمدنی و خرچ	۱۳۹	۲۶۔ بگڑا ہوا بچہ		
۲۵۲	۵۷۔ قانون کا احترام	۱۴۶	۲۷۔ انگوٹھا چوسنا		
۲۵۶	۵۸۔ ادب	۱۴۹	۲۸۔ خوف		
۲۶۱	۵۹۔ چوری چکاری	۱۶۸	۲۹۔ کھیل کود		
۲۶۶	۶۰۔ حسد	۱۷۸	۳۰۔ خود نمائی		
۲۷۳	۶۱۔ غصہ	۱۷۱	۳۱۔ تقلید		
۲۷۸	۶۲۔ بد زبانی	۱۷۴	۳۲۔ تلاشِ حقیقت		
۲۸۱	۶۳۔ چغلی خوری	۱۷۹	۳۳۔ خود اعتمادی		
۲۸۶	۶۴۔ عیب جوئی	۱۸۷	۳۴۔ آزادی		
۲۸۷	۶۵۔ گھر میں بچوں کا لطائف جھگڑا	۱۹۴	۳۵۔ ضدی پن		
۲۹۲	۶۶۔ بچہ اور دینی تعلیم	۲۰۱	۳۶۔ کام اور فرض کی ادائیگی		
۳۰۰	۶۷۔ بچہ اور فرائض دینی	۲۰۹	۳۷۔ راست گوئی		
۳۰۴	۶۸۔ بچہ اور فرائض دینی	۲۱۶	۳۸۔ وفائے عہد		
۳۰۸	۶۹۔ سیاسی اور سماجی تربیت	۲۲۱	۳۹۔ ملکیت		
۳۱۰	۷۰۔ بچہ اور ریڈیو، ٹی وی	۲۲۵	۵۰۔ سخاوت		
۳۱۷	۷۱۔ جنسی مسائل	۲۳۱	۵۱۔ نیک کاموں میں تعاون		
۳۲۸	۷۲۔ کتاب کا مطالعہ	۲۳۳	۵۲۔ انسان دوستی اور بچے		
۳۳۶	۷۳۔ ناقص الخلقیت بچے	۲۳۷	۵۳۔ عدل و مساوات		
۳۴۰	۷۴۔ جسمانی منزا	۲۴۳	۵۴۔ بچوں کا احترام		
۳۴۶	۷۵۔ غیر جسمانی منزائش	۲۴۷	۵۵۔ خود شناسی اور بامقصد زندگی		
۳۵۰	۷۶۔ حوصلہ افزائی اور انعام				

انتساب

☆ حضرت علی وفاطہ سلام اللہ علیہما کی خدمت میں — کہ جو اسلام کے مثالی
ماں باپ ہیں — جنہوں نے — امام حسن، امام حسین، زینب اور ام کلثومؓ
جیسی لائق اولاد کی تربیت کی۔

☆ ان لائق احترام ماں باپ کی خدمت میں — جن کے دل میں امام خمینی
(روحی خدایہ) جیسے با بصیرت اور مضبوط موقف کے حامل رہبر کے سے خدا کا راز اور
آبرو مند بچے پروان چڑھے۔

☆ ان ماں باپ کی خدمت میں — جو اپنے تربیت یافتہ مجاہد اور جانباز
فرزندوں کی جہاد کا داغ سینے پر لگائے ہوئے ہیں — وہی خاندان جنہوں نے
اسلام کے لیے جام شہادت نوش کیا اور اپنے عزیز بچوں کو شہر کر کے انقلاب
اسلامی ایران کے چہرے کو گل رنگ کر دیا اور شجر اسلام کی آبرو باری کی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عرضِ ناشر

موجود حاضر میں جہاں حضرت انسان نے مادیت میں اس قدر ترقی کی ہے کہ اب وہ خلائی سفر کامیابی سے انجام دیتے ہوئے نظام شمسی میں دیگر سیارگان پر کمندیں ڈال رہا ہے، وہاں وہ اقدار انسانی میں مسلسل انحطاط کے مسئلہ سے بھی شدت کے ساتھ دوچار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مادی ترقی مادی تعلیم کے حصول کا منطقی نتیجہ ہے، لیکن اقدارِ حیات کی ترقی میں ایک اور چیز بھی ناگزیر ہے جس کو تربیت کہتے ہیں۔ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جو مہد یعنی مال کی گود سے شروع ہوتی ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس کی عدم موجودگی مادی تعلیم کے باوجود انسان کو اس سطح پر لے آئی ہے جہاں ترقی علوم مادی کا عملی مقصد مخالفین کی حیات کو صفحہ ہستی سے یکسر مٹا دینا ہے۔ دنیا کی بڑی طاقتوں کے وہ منصوبے اس بات کی دلیل ہیں جو بت دیکھا سائنسی تجربات کی شکل میں سامنے آ رہے ہیں۔ ان کے ذریعے کوشش کی جا رہی ہے کہ ایسے ہتھیار ایجاد کریں جن کا استعمال کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو نیست و نابود کر دے۔

ان تمام حالات کے پیش نظر تربیت انسان کی ضرورت دل بدن زیادہ محسوس ہوتی جا رہی ہے۔ کتاب ”انہ“ آئین تربیت“ ایران کے فاضل مصنف جناب ابراہیم امینی نجف آبادی

کی ایک نہایت عمدہ سچی ہے جس میں تربیت انسان کے موضوع پر اسوۂ معصومین علیہم السلام کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں عرض کیا ہے، تربیت کا پہلا مدرسہ آغوشِ مادر ہے۔ اس سلسلے میں شاعر مشرق علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

سیرتِ فرزندِ با از اُمہات جوہرِ صدق و صفا از اُمہات

کتاب ہذا میں مندرجہ ذیل امور پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جو ضروریاتِ تربیت میں شامل ہیں :-

- ۱۔ جسمانی اور نفسانی دونوں میدانوں میں تربیت کنندہ کی اُمورِ تربیت سے کما حقہ واقفیت۔
- ۲۔ بہت تربیت سے واقفیت۔

۳۔ تربیت کے لیے جن اقدار و اوضاع کی ضرورت ہوتی ہے ان سے کما حقہ واقفیت۔

فاضل مولف نے یہ سب کچھ سیرتِ معصومین کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ ہم ان کی اس کاوش کو اُردو زبان میں بطور ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اُمیدِ وثیق ہے کہ یہ کتاب والدین اور اساتذہ کے لیے تربیتِ اولاد و شاگردان میں ایسی معاون ثابت ہوگی جس سے دورِ مادیت میں قوم کو با اقدار انسان مل سکیں گے۔

قارئینِ کرام سے استدعا ہے کہ کتاب ہذا کے مطالعے کے بعد اپنی قیمتی آراء سے ادارہ مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز کو ضرور مطلع فرمائیں۔

طلب کار تعاون :

ڈائریکٹر مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز

لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

کچھ ترجمے کے بارے میں

ترجمہ کیا ہو؟ اس کی شہرہ لکھا گیا ہے؟ اس پر بہت کچھ کہا گیا ہے، کہا جاتا ہے گا اور کہا جاتا رہنا چاہیے۔

عموماً دو طریقے ترجمے کے لیے رائج ہیں،

(۱) لفظی ترجمہ

(۲) آزاد اور مفہومی ترجمہ

ان دونوں کی اپنی اپنی خوبیاں ہیں، دونوں کے حامیوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں اور دونوں کے لیے موجود وزنی دلائل کی اپنے اپنے مقام پر اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہمیں یہاں صرف — زیر نظر ترجمے کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔
”آئین تربیت“ کے خاص اسلوب نگارش اور ترجمے کے قارئین پر نظر نے ہم سے ایک جداگانہ سے طرز ترجمہ کا تقاضا کیا، سو ہم نے:

• بعض مقامات پر لفظی ترجمہ ضروری سمجھا اور بعض عبارتوں کو فقط اردو کا لباس پہنا کر آپ تک پہنچا دیا ہے۔

• بعض — بلکہ بہت سے مقامات پر آزاد ترجمے کی روش اپنائی ہے اور مفہوم عبارت منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

• بعض مقامات پر ان دونوں صورتوں سے کام نہیں لیا بلکہ ”مقصود“ پہنچانے کی کوشش

کی ہے کیونکہ وہاں ترجمے کی صورت میں مقصود، مفصل ہو جاتا اور مطلوب و مقصود کو بہر حال لفظ اور مفہوم پر فوقیت حاصل ہے۔

جیسے اردو پر یورپی زبانوں کے اثرات بے پناہ ہیں اسی طرح فارسی جیسی وسیع زبان بھی اپنا دامن اس سے بچا نہیں سکی۔ بہت سے انگریزی لفظ اور اصطلاحات فارسی ہی کے کارگ اختیار کر کے فارسی میں داخل ہو گئے ہیں یا یوں کہا جائے کہ ”فارسیا“ یہ گئے ہیں۔ اسی طرح فارسی کی اپنی اصطلاحات ہیں اور ہمارے ہاں اپنی اصطلاحات — ان سب کو تو ترجمہ کرتے ہوئے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ متبادل اصطلاحات لکھی گئی ہیں جہاں جہاں ضروری محسوس ہوتا متبادل انگریزی اصطلاحات بھی لکھ دی گئی ہیں۔

اصل کتاب میں قرآنی آیات اور روایات کی عربی عبارات نہایت ہی کم صحت کی گئی ہیں ترجمہ کرتے ہوئے خاص طور پر قرآنی آیات اپنے اصل متن کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں اور بہت سے مقامات پر روایات کی عربی عبارات بھی اصل متن کو دیکھ کر لکھ دی گئی ہیں۔

گوشش کی گئی ہے کہ عبارت رواں، سادہ اور عام فہم ہو لیکن پھر بھی یہ ترجمہ ہی ہے۔ تاہم تصنیف نہیں لہذا کہیں کہیں جو جمل پن کا احساس ہو تو قارئین معاف فرمائیں۔

کتاب چونکہ تربیتی ہے لہذا بہت سے مطالب تکراری ہیں اور یہ ترجمہ کتاب کا تقاضا بھی ہے اور خاصہ بھی — ترجمہ کرتے ہوئے اس حوالے سے قریب سے دامن بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذکورہ امور میں سے بنیادی امور پر خرم صاحب کتاب یعنی حضرت آیت ۱۰۰۰۰۔

ابراہیم امینی سے تبادلہ خیال کے بعد ہم آہنگی پا کر میں کچھ اور بھی اطمینان ہے۔
تتبعہ اور آثار کے لیے بہر حال ہم خندہ پیشانی سے منتظر ہیں — کیوں کہ کمال کا راستہ انہی وادیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔

منتزعین

پیشگفتار

تعلیم اور تربیت میں فرق ہے۔ تعلیم کا معنی ہے آموزش، سکھانا یا کسی کو کوئی مطلب یاد کرانا۔ جب کہ تربیت کا مطلب ہے شخصیت کی تعمیر اور پرورش۔ تربیت کے ذریعے سے اپنی پسند کے مطابق افراد کو ڈھالے اور تیار کیے جاسکتے ہیں اور نتیجتاً معاشرے کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

ضروری ہے کہ تربیت ایک سوچے سمجھے اور دقیق پروگرام کے تحت انجام پائے تاکہ کامیابی کے ساتھ نتیجہ بخش ثابت ہو۔ تربیت میں صرف وعظ و نصیحت اور ڈرانا و حکمانا ہی کافی نہیں بلکہ چاہیے کہ تمام حالات اور شرائط مقصد کے مطابق فراہم ہوں۔ تاکہ مقصود حاصل ہو سکے۔ تربیت کے لیے چند چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔ چاہیے کہ مربی اس شخص کو اچھی طرح پہچانتا ہو کہ جس کی اسے تربیت کرنا ہے۔ اس کی خصوصیات اور اس کے جسمانی اور نفسیاتی رموز سے آگاہ ہو۔

۲۔ مربی کی نگاہ میں تربیت کا کوئی ہدف ہونا چاہیے۔ یعنی اس کی نظر میں یہ ہونا چاہیے کہ وہ کیا انسان بنانا چاہتا ہے۔

۳۔ تربیت کے لیے مربی کے پاس کوئی پروگرام ہونا چاہیے۔ یعنی اسے جاننا چاہیے کہ جیسی شخصیت وہ پروان چڑھانا چاہتا ہے اس کے لیے کن حالات اور شرائط کی ضرورت ہے لہذا ان سب کو اسے فراہم کرنا چاہیے اور پورے غور و خوض سے کام لینا چاہیے۔ چہرہ ممکن ہو سکتا ہے کسی مثبت نتیجہ کا انتظار کرے۔

تربیت کے لئے بہترین زمانہ بچپن کا ہے کیونکہ بچے نے ابھی پوری شکل اختیار نہیں کی ہوتی اور ہر طرح کی تربیت کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ یہ حساس اور اہم ذمہ داری پہلے مرحلہ پر ہاں باپ کے ذمے ہے۔ لیکن تربیت ایک سہل اور سادہ سا کام نہیں ہے۔ بلکہ ایک انتہائی ظریف و حساس فن ہے کہ جس کے لیے کام کی شناخت، کافی اطلاعات، تجربہ، بردباری اور حوصلہ و عزم کی ضرورت ہے۔ یہ بات باعث افسوس ہے کہ اکثر ماں باپ فن تربیت سے آشنا نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر بچوں کی کسی حساب شدہ اور منظم پروگرام کے تحت پرورش نہیں ہوتی بلکہ وہ گویا خود رو پودوں کی طرح پروان چڑھتے ہیں۔

مشرق و مغرب کے ترقی یافتہ کھانے والے ممالک میں تربیت کے مسئلے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بہت تحقیقات کی ہیں، بہت سی سو مند کتابیں لکھی ہیں اور ان کے ہاں اس فن کے بہت سے ماہرین موجود ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں زندگی کے اس اہم مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ البتہ چند ایک ماہرین موجود ہیں اور تھوڑی بہت کتابیں بھی ہیں لیکن اتنا کچھ کفایت نہیں کرتا۔ دوسری زبانوں سے اس ضمن میں بہت سی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا ہے جو سب کی دسترس میں ہیں۔ لیکن ان مشرقی اور مغربی کتابوں میں دو بڑے نقص موجود ہیں۔

پہلا عیب یہ ہے کہ ان میں انسان کو فقط جسمانی حواس اور اس کی دنیاوی زندگی کے حواس سے دیکھا گیا ہے اور بحث و تحقیق کی گئی ہے۔

اور روحانی سعادت و بد بختی اور اخروی زندگی سے یا غفلت برتی گئی ہے یا اعراض کی گئی ہے۔

مغرب میں تربیت کے لیے اس کے علاوہ کوئی ہدف نہیں کہ بچے کی جسمانی طاقت ہی کی حیوانی قوتوں، اعصاب اور مغز کو صحیح طریقے سے پروان چڑھایا جائے تاکہ جس وقت وہ بڑا ہو تو آرام سے زندگی گزار سکے اور مادی فوائد اور حیوانی لذتوں سے بہرہ مند ہو سکے اور ان کتابوں میں اگر اخلاق کے بارے میں گفتگو ہوتی بھی ہے تو وہ بھی اسی دنیاوی زندگی اور مادی مفادات کے حصول سے مربوط ہے۔ ان کتابوں میں روحانی کمالات یا نقائص کا ذکر نہیں۔

اخروی خوشبختی یا بدبختی کا تذکرہ نہیں اور مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے ان میں اخلاقی اور روحانی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ مغرب والوں کے نزدیک تربیتی مسائل کا انحصار تجربات اور ثمرات پر ہے۔ دین کا ان پر کوئی رنگ نہیں۔ لہذا یہ کتابیں مسلمانوں کے نزدیک مفید، جامع اور کامل نہیں ہو سکتیں کیوں کہ ایک مسلمان کی نظر میں انسان کے دو پہلو ہیں۔ ایک جسم اور دوسرا روح۔ ایک دنیاوی زندگی اور دوسری اخروی زندگی۔ لہذا راقم نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں مطالعہ اور تحقیق کی جائے اور پھر اپنے نتیجہ کو تحریر کی صورت میں طالبین کی خدمت میں پیش کیا جائے اس کتاب کی تحریر کے لیے راقم کا اصلی ماخذ قرآن اور کتب حدیث و اخلاق ہیں۔ البتہ پیچھے کی تربیت سے متعلق اور نصیات سے متعلق دوسروں کتابیں جو فارسی اور عربی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور حفظانِ صحت سے متعلق کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ایرانی علما نے پیچھے کی تربیت کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں ان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں راقم کے اپنے بھی کچھ تجربات ہیں۔ امید ہے کہ یہ ناچیز پیش کش تربیت کرنے والوں کے مفید ثابت ہوگی اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے سودمند قرار پائے گی۔

ابراہیم امینی نجف آبادی

حوزہ علیہ قم

بہمن ماہ ۱۳۵۸ھ

جمادی ۱۹۸۰ء

مالِ باپ کی ذمہ داری

اسلام کی نظر میں مالِ باپ کا مقام بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ نے اور آئمہ معصومین علیہم السلام نے اس بارے میں بہت تاکید کی ہے اور اس سلسلے میں بہت سی آیات اور روایات موجود ہیں۔ مالِ باپ سے حسن سلوک کو بہترین عبادت میں سے شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد الہی ہے۔

وَقَضَىٰ رَبِّيَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا آيَاتُهُ وَيَالِ الْوَالِدِينَ إِحْسَانًا
اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک اختیار کرو۔ (بنی اسرائیل - ۲۳)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

تین چیزیں بہترین عمل ہیں ،
(۱) پابندی وقت کے ساتھ نماز پنگانہ کی ادائیگی ،

(۲) مالِ باپ کے ساتھ حسن سلوک اور

(۳) راہِ خدا میں جہاد۔

(اصول کافی ج ۲ ص ۱۵۸)

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مالِ باپ کو یہ مرتبہ کیوں اور کیوں کر ملا ہے ؟ کیا اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ مقام بلاوجہ عطا کر دیا ہے یا ان کے کئی قیمتی عمل کی وجہ سے ؟ مالِ باپ بچے کے لیے کون سا بڑا کام انجام دیتے ہیں کہ جس کے باعث وہ اس قدر مقام و خدمت کے لائق قرار

پاتے ہیں۔ باپ نے ایک جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ایک غلیظ حیات (LIFFCELL) رحم مادر میں منتقل کیا ہے۔ یہ سیل ماں کی جانب سے ایک اور سیل کے ساتھ مل کر مرکب ہو جاتا ہے جو ایک نئے وجود کے طور پر رحم مادر میں پرورش پاتا ہے۔ جو نو ماہ کے بعد ایک ننھے ننھے بچے کی صورت میں زمین پر قدم رکھتا ہے۔ ماں اسے دودھ اور دوسری غذا دیتی ہے۔ اسے کبھی صاف کرتی ہے کبھی کپڑے بدلتی ہے اس کی تری اور خشکی کا خیال رکھتی ہے ان مراحل میں باپ غافلانہ کے اخراجات پورے کرتا ہے اور اُن کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کیا ماں باپ کی ان کاموں کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں؟ کیا انہی کاموں کی وجہ سے ماں باپ کو اس قدر بلند مقام حاصل ہے؟ کیا صرف ماں باپ اپنی اولاد پر حق رکھتے ہیں اور اولاد اپنے ماں باپ پر کوئی حق نہیں رکھتی؟ میرے خیال میں ایسا ایک طرفہ حق تو کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔ احادیث معصومین علیہم السلام میں ایسے حقوق اولاد بھی بیان فرمائے گئے ہیں کہ جن کی ادائیگی ماں باپ کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے چند احادیث ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”چنانچہ جس طرح تیرا باپ تجھ پر حق رکھتا ہے تیری اولاد بھی تجھ پر حق رکھتی ہے۔“
 (مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۱۴۶)

۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”جیسے اولاد اپنے ماں باپ کی نافرمانی کی وجہ سے عاق ہو جاتی ہے اُسی طرح سے ممکن ہے ماں باپ بھی اپنے فریضے کی عدم ادائیگی کے باعث اولاد کی طرف سے عاق ہو جائیں۔“ بحار، ج ۱۰، ص ۹۲
 ۳۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”خدا ایسے ماں باپ پر لعنت کرے جو اپنی اولاد کے عاق ہونے کا باعث بنیں۔“ (مکرم الاخلاق، ص ۱۵)

۴۔ امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا:
 ”تیری اولاد کا حق یہ ہے کہ تو اس پر غور کر کہ وہ بڑی ہے یا اچھی ہے بہر حال

تجلی سے جو زمین اُنی ہے اور اسی دنیا میں وہ تجھی سے منسوب ہے اور تیری
 ذمہ داری ہے کہ تو اسے ادب سکھا، اللہ کی سرفت کے لیے اس کی راہنمائی کر
 اور اطاعت پروردگار میں اس کی مدد کر، تیرا سلوک اپنی اولاد کے ساتھ ایسے
 شخص کا سا ہونا چاہیے کہ جسے یقین ہوتا ہے کہ احسان کے بدلے میں اُسے
 اچھی جزا ملے گی اور بد سلوکی کے باعث اسے سزا ملے گی۔ (مکالم الاخلاق ص ۲۸۲)

۵۔ امیر المؤمنین علی علیہ السلام نے فرمایا:
 ”کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری دہر سے تیرا خاندان اور تیرے اقربا بد بخت ترین
 لوگوں میں سے ہو جائیں۔“ (غیر المحکم ص ۸۲)

۶۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”جو کوئی بھی یہ چاہتا ہو کہ اپنی اولاد کو عاق ہونے سے بچائے اُسے چاہیے کہ نیک
 کاموں میں اس کی مدد کرے۔“ (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۳۱)

۷۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”جس کسی کے ہاں بیٹی ہو اور وہ اُسے خوب ادب و اخلاق سکھائے، اسے
 تعلیم دینے کے لیے کوشش کرے، اس کے لیے آرام و آسائش کے اسباب
 فراہم کرے تو وہ بیٹی اُسے دوزخ کی آگ سے بچائے گی۔“
 (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۵۸)

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:
 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ كَمَا هُوَ حَقُّهُ ذِكْرُ مَا
 أَنشَأَ مِنَ الْإِنْسَانِ ذَكَرًا أَحَدًا

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے بچاؤ
 کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔
 (سورہ تہیم، آیت ۱۶)

بچے نے جب کہ ابھی وضع زندگی کے بارے میں کوئی راستہ متعین نہیں کیا ہوتا اور سعادت و بدبختی ہر دو کی اس میں قابلیت ہوتی ہے اُس سے ایک کامل انسان بھی بنایا جاسکتا ہے اور ایک گھٹیا درجے کا حیوان بھی۔ ہر انسان کی سعادت اور بدبختی اس کی کیفیت تربیت سے وابستہ ہے اور اس عظیم کام کی ذمہ داری ماں باپ کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ اصولاً ماں باپ کا بھائی یہی ہے۔ ماں باپ یعنی انسان ساز اور کامل بخشے والے دو وجود۔ عظیم ترین خدمت کہ جو ماں باپ اپنی اولاد کے لیے انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے اُسے خوش اخلاق، مہربان، انسان دوست، غیر غواہ، حریت پسند، شجاع، عدالت پسند، دانا، درست کام کرنے والا، شرافت مند، با ایمان، فرزند شناس، سالم بختی، تعلیم یافتہ، اور خدمت گزار بننے کی تربیت دی۔ ماں باپ کو چاہیے کہ اپنے بچے کو اس طرح سے ڈھالیں کہ وہ دنیا میں بھی سعادت مند ہو اور آخرت میں بھی شرفور۔ ایسے ہی افراد درحقیقت ماں باپ کے عظیم مرتبے پر فائز ہو سکتے ہیں نہ کہ جنہوں نے ایک جنسی جذبے کے تحت اولاد کو وجود بخشا ہے۔ اور اسے بڑا ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود بخود تربیت پائے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

باپ جو اپنی اولاد کو بہترین چیز عطا کر سکتا ہے وہ اچھا ادب اور نیک تربیت

ہے۔ (مجمع الزوائد - ج ۸ - ص ۱۵۹)

خصوصاً ماں کی اس سلسلے میں زیادہ اہمیت ہے۔ حتیٰ کہ دورانِ حمل بھی اس کی خوراک اور طرز عمل بچے کی سعادت اور بدبختی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

خوش نصیب وہ ہے کہ جس کی خوش بختی کی بنیاد ماں کے پیٹ میں پڑی ہو اور بدبخت وہ ہے جس کی سعادت کا آغاز شکمِ مادر سے ہوا ہو۔

(بحار الانوار - ج ۷۷ - ص ۱۱۵-۱۱۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

الجنة تحت اقدام الامهات۔ (مسند رک - ج ۲ - ص ۲۳۸)

جو مال باپ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اپنی رفتار و کردار سے انہیں منفرد بنا دیتے ہیں وہ بہت بڑے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں ایسے مال باپ سے پوچھنا چاہیے کہ کیا اس بے گناہ بچے نے تقاضا کیا تھا کہ تم اسے وجود بخشو کہ اب وجود میں لانے کے بعد اسے تم نے گائے کے پچھڑے کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اب جب کہ تم اس کے وجود کا باعث بن گئے ہو تو شرعاً اور عقلاً تم ذمہ دار ہو کہ اس کی تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کرو۔ لہذا تعلیم و تربیت ہر مال باپ کی عظیم ترین ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

اس کے علاوہ مال باپ معاشرے کے سامنے بھی جواب دہ ہیں۔ آج کے بچے ہی کل کے مراد و عورت ہیں۔ کل کا معاشرہ انہیں سے تشکیل پانا ہے۔ آج جو سبق سیکھیں گے کل اُسی پر عمل کریں گے۔ اگر ان کی تربیت درست ہو گئی تو کل کا معاشرہ ایک کامل تر اور صالح معاشرہ ہو گا اور اگر آج کی نسل نے غلط پروگرام کے تحت اور نادرست طور پر پرورش پائی تو ضروری ہے کہ کل کا معاشرہ فاسد تر اور بدتر قرار پائے کل کی سیاسی، علمی، اور سماجی شخصیات انہیں سے وجود میں آئیں گی۔ آج کے بچے کل کے مال باپ ہیں۔ آج کے بچے کل کے مربی قرار پائیں گے۔ اور اگر انہوں نے اچھی تربیت پائی ہو گی تو اپنی اولاد کو بھی ایسا ہی بنا لیں گے اور ایسی طرح اس کے برعکس۔ لہذا اگر مال باپ چاہیں۔ تو اُنہندہ اُنے والے معاشرہ کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح اگر چاہیں تو اسے برائی اور تباہی سے بھنکار کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے مال باپ معاشرے کے حوالے سے بھی ایک اہم ذمہ داری کے حامل ہیں۔ اگر وہ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کریں تو انہوں نے گویا معاشرے کی ایک عظیم خدمت سر انجام دی ہے اور وہ اپنی زحمات کے صلے میں اجر کے حقدار ہیں اور اگر وہ اس معاملے میں غفلت اور سہل انگیزی سے کام لیں تو نہ صرف اپنے بے گناہ بچوں کے بارے میں بلکہ پورے معاشرے کے لیے خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں اور یقینی طور پر بارگاہ الہی میں جواب دہ ہوں گے۔

تعلیم و تربیت کے موضوع کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ مال باپ اولاد کی تربیت کے لئے جو کوشش کرتے ہیں اور جو مصیبتیں اٹھاتے ہیں وہ سینکڑوں استادوں، انجینیئروں، ڈاکٹروں اور عاملوں کے کاموں پر ہماری ہیں۔ یہ مال باپ ہیں جو انسان کامل پر وہاں پڑھاتے ہیں اور ایک

ہائی دیندار استاد، ڈاکٹر اور انجینئر جو دین لائے ہیں۔

خاص طور پر مائیں بچوں کی تربیت کے بارے میں زیادہ ذمہ داری رکھتی ہیں اور تربیت کا بوجھ ان کے کندھوں پر رکھا گیا ہے۔ بچے اپنے بچپن کا زیادہ عرصہ ماؤں کے دامن میں ہی گزارتے ہیں۔ اور آئندہ زندگی کے رخ کی بنیاد اسی زمانے میں پڑتی ہے۔ لہذا افساد کی خوش بختی اور بد بختی اور معاشرے کی ترقی اور تنزل کی کبھی ماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ عورت کا مقام و کات، وزارت، اور افسری میں نہیں یہ سب چیزیں مقام مادر سے کہیں کم تر ہیں مائیں کامل انسانوں کی پرورش کرتی ہیں اور صالح وزیر، دکیل، افسر اور استاد پر دان پڑھاتی ہیں اور معاشرے کو عطا کرتی ہیں۔

جو ماں باپ پاک، صالح اور قیمتی بچے پر دان پڑھاتے ہیں نہ صرف یہ کہ وہ اپنی اولاد اور معاشرے کی خدمت کرتے ہیں بلکہ خود بھی اسی جہان میں ان کے وجود کی خیر و خوبی سے بھرہ مند ہوتے ہیں۔ نیک اولاد ماں باپ کی سرفرازی کا سرمایہ ہوتی ہے اور ناتوانی کے زلنے میں ان کا سہارا ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کریں تو اسی دنیا میں اس کا نتیجہ دیکھیں گے۔ اور اگر اس معاملے میں غفلت اور سہل انگاری سے کام لیں تو اسی دنیا میں اس کا مزہ بھی دیکھ لیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا،

بڑی اولاد انسان کے لیے بڑی مصیبتوں میں سے ہے۔ (غزوات الحکم، ص: ۸۰)

حضرت علی علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا ہے،

بڑی اولاد ماں باپ کی آبرو گزرا دیتی ہے اور وارثوں کو رسوا کر دیتی ہے۔

(غزوات الحکم، ص: ۸۰)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

خدا رحمت کرے ان ماں باپ پر جنہوں نے اپنی اولاد کو تربیت دی کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کریں۔

(مسکرم الاخلاق، ص: ۵۱۴)

تربیت کرنے والوں کی آگاہی اور باہمی تعاون

بچے کی تربیت کوئی ایسی سادہ اور آسان سی بات نہیں ہے کہ جسے ہر ماں باپ آسانی سے انجام دے سکیں۔ بلکہ یہ کام بہت سی باریکیوں اور غراقتوں کا حامل ہے۔ اس میں سینکڑوں سال سے باریک تر نکات موجود ہیں۔ مربی کا تعلق بچے کی روح سے ہوتا ہے۔ وہ روحانی، نفسیاتی، علمی اور تجرباتی پہلوؤں سے آگاہی کے بغیر اپنی ذمہ داری بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔ بچے کی دنیا ایک اور ہی دنیا ہے اور اُس کے افکار ایک اور ہی طرح کے افکار ہیں اس کی سوچوں کا انداز مختلف ہوتا ہے، جس کا بڑوں کے طرز تفکر سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ بچے کی روح نہایت ظریف اور حساس ہوتی ہے اور ہر نقش سے خالی ہوتی ہے اور ہر طرح کی تربیت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ بچہ ایک ایسا چھوٹا سا انسان ہوتا ہے، جس نے ابھی تک ایک مستقل شکل اختیار نہیں کی ہوتی جب کہ ہر طرح کی شکل قبول کرنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے۔ بچے کے مربی کو انسان شناس اور بالخصوص بچوں کا شناس ہونا چاہیے۔ تربیت کے امر اور رموز پر اس کی نظر ہونی چاہیے۔ انسانی کمالات اور نقائص پر اُس کی نگاہ ہونی چاہیے۔ اس کے اندر احساس ذمہ داری بیدار ہونا چاہیے اور اسے اپنے کام سے دلچسپی بھی ہونا چاہیے۔ اسے صابر اور حوصلہ مند ہونا چاہیے اور مشکلات سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے۔ علاقہ اذی تربیت کے قوانین کو مفید کلی نہیں ہوتے کہ جنہیں ہر جگہ پر اور ہر کسی کے لیے قابل عمل قرار دیا جاسکے۔ بلکہ ہر بچے کی اپنی جسمانی ساخت اور عقلی صلاحیتوں کے اعتبار سے اپنی ہی خصوصیات ہوتی ہیں لہذا اس کی تربیت اس کی جسمانی ساخت، عقلی قوتوں، حالات اور ماحول کے تقاضوں کی مناسبت

سے ہونی چاہیے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کی جسمانی ساخت کا صحیح طرح سے جائزہ لیں اور اسی کے پیش نظر اس کی تربیت کریں ورنہ ممکن ہے ان کی کوششوں کا وہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکے جو ان کی خواہش ہے۔

مرد اور عورت کو چاہیے کہ ماں باپ بننے سے پہلے بچے کی تعلیم و تربیت کے طریقے سے آگاہی حاصل کریں۔ اس کے بعد بچے کی پیدائش کے لئے اقدام کریں، کیوں کہ بچے کی تربیت کا مرحلہ اس کی ولادت سے بلکہ اس سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ اس حساس عرصے میں بچے کی لطیف اور حساس طبیعت کوئی شکل اختیار کرتی (اور اس کے اخلاق، کردار، عادات حتیٰ کہ افکار کی بنیاد پڑتی ہے۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ ماں باپ اس حساس عرصے میں مختلف سے کام لیں اور تعلیم و تربیت کو آئندہ پر مال دیں۔ یعنی تعلیم و تربیت کو اس وقت پر اٹھانہ رکھیں کہ جب بچہ اچھے یا بُرے اخلاق و کردار یا اچھی یا بُری عادتوں کے بارے میں تقریباً ایک مزاج اختیار کر چکا ہو۔ کیونکہ ابتدائی مراحل میں تربیت عادتوں کے تبدیل کرنے کی نسبت کہیں آسان ہے۔ عادت کا تبدیل کرنا اگرچہ ناممکن نہیں تاہم اس کے لیے بہت زیادہ آگاہی، صبر، حوصلے اور کوشش کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ سب تربیت کرنے والوں کے بس کی بات نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،

أَصْعَبُ السِّيَاسَاتِ نَعْلُ الْعَادَاتِ

”مشکل ترین سیاست لوگوں کی عادت کو تبدیل کرنا ہے“ (غزوالحکم ص ۱۸۱)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،

لِلْعَادَةِ عَلَى مِثْلِ إِنْسَانٍ مُسَلِّطَانِ

عادت انسان پر مسلط ہو جاتی ہے۔ (غزوالحکم ص ۱۸۰)

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں،

”الْعَادَةُ طَبْعٌ ثَانٍ“

”عادت فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے“ (غزوالحکم ص ۲۶)

ترک عادت اس قدر مشکل ہے کہ اسے بہترین عبادتوں میں سے شمار کیا گیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”أَفْضَلُ الْعِبَادَةِ غَلْبَةُ السَّعَادَةِ“

”بہترین عبادت پر غلبہ پالینا افضل ترین عبادتوں میں سے ہے“ (مغز الحکم ص ۱۷۶)

بچے کو راہ کمال پر تربیت دینے کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی اہم ہے کہ ماں باپ اور دیگر تمام

مرتبوں کے درمیان فکری اور عملی طور پر تربیت کے تمام پروگراموں میں اور ان کے اجرا کی کیفیت میں

ہم آہستگی اور تفہیم موجود ہو۔ اگر ماں باپ اور دیگر لوگ کہ جن کا بچے کی تربیت میں عمل دخل ہو

مثلاً دادا اور دادی وغیرہ ان کے درمیان تربیتی پروگراموں میں اتفاق اور ہم آہنگی موجود ہو اور

ان کے اجرائی میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تو وہ مطلوب نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں

اور ایک اچھا اور متنازعہ پر و ان چڑھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک بھی تربیت کے بارے

میں اعتناء یا تربیتی امور میں خلل سیلفہ رکھتا ہو تو مراد حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ تربیت کے مسئلے

میں مکمل یقین اور ہم آہنگی ضروری ہے۔

بچے کو اپنے فریضے سے آگاہی ہونا چاہیے۔ جب ماں باپ کچھ اور کہہ رہے ہیں اور

دادا دادی اور توچہ چیران دپریشان ہو جاتا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتی کہ کیا کرے۔ بالخصوص اگر ان میں

سے ہر کوئی اپنے فطریے پر زور دے رہا ہو ایسی صورت میں نہ فقط یہ کہ اچھا نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ ایسا

ہوتا تربیت میں نقص کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ تربیت کی بڑی مشکلات میں سے یہ ہے کہ بچے کے

بارے میں باپ کچھ فیصلہ کرے اور ماں یا دادی اس میں دخالت کر کے اس کے برخلاف عمل کرے

یا پھر اس کے الٹ مسئلہ ہو۔ مریوں کے درمیان ایسے اتفاق اور ہم آہنگی کی ضرورت ہے کہ

جس سے بچہ واضح طور پر یہ سمجھ سکے کہ اُسے کیا کرنا ہے اور اس کی خلاف ورزی کا خیال اس

کے ذہن میں نہ آئے۔

کبھی لڑیں ہوتا ہے کہ باپ ایک خوش اخلاق اور اچھا تربیت یافتہ پچہ پر و ان چڑھانا

چاہتا ہے لیکن ماں باخلاق اور بے تربیت ہوتی ہے اسے تربیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا

اور کبھی معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہ مشکل بہت سے گھرانوں میں نظر آتی ہے۔ ایسے

خاندانوں میں پرورش پانے والے بچے عموماً اچھی اور صحیح تربیت کے حامل نہیں ہوتے کیونکہ ایک تربیت یافتہ اور صالح فرد کی تربیت اس کی ناصالح بری کے سبب بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں صحیح تربیت بہت مشکل امر بن جاتا ہے البتہ ایسی دشواریوں کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تربیت کی ذمہ داری سے دست بردار ہو جائیں۔

ایسی صورت میں تربیت کی ذمہ داری اور بھی ہوا ہو جاتی ہے۔ چاہیے کہ ایسی صورت میں اولاد کی تربیت کے بارے میں زیادہ توجہ دی جائے۔ اپنے اخلاق و کردار کی پوری طرح اصلاح کی جائے اور بچوں کی زیادہ دیکھ بھال سے کام لیا جائے اور ان سے زیادہ سے زیادہ مانوسیت پیدا کی جائے۔ اچھے کام اور خوش رفتاری کے ذریعے بچوں کی توجہ اپنی طرف جذب کی جائے اور ان کے لیے بہترین نمونہ عمل بن جایا جائے۔ اپنے بچوں سے تفہیم پیدا کیا جائے۔ اچھائی برائی اور نیکی بدی کا مفہوم ان کے سامنے کامل طور پر واضح کیا جائے۔ ایسا عمل کیا جائے کہ بچہ خود بخود اچھے اور بُرے اخلاق کے درمیان تمیز کر سکے اور برائیوں سے متفرق ہو جائے۔ اگر مرتبہ عاقل، تدبیر، مہربان اور حوصلہ مند ہو تو کسی حد تک اپنے بدلتے ہوئے پنچ سکتا ہے اور اپنی بری کی غلط تربیت اور بد آموزی کے اثرات زائل کر سکتا ہے۔ بہر حال یہ ایک مشکل اور اہم کام ہے لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں۔

ایک دانشور کا قول ہے،

وہ خاندان کہ جس میں ماں اور باپ بچے کی تربیت کے بارے میں ہم فکر ہیں اور اپنے کردار اور رفتار کو اس کے مطابق ڈھالتے ہیں تو بچے کے اعصاب کے لیے مناسب ماحول مہیا ہو جاتا ہے۔ خاندان ایک ایسا چھوٹا سا معاشرہ ہے کہ جس میں بچے کی اخلاقی خصوصیات ایک خاص صورت اختیار کرتی ہیں۔ وہ خاندان کہ جس کے افراد ایک دوسرے سے دوستانہ برتاؤ کرتے ہیں اس کے بچے عموماً متین، خوددار اور انصاف پسند ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ

گھر کہ جس میں ماں باپ کے درمیان روزِ روز کی ٹوک بھونک اور تو
 تھکا رہتی ہے اس کے بچے کے اخلاق، بہانہ ساز اور غیلا
 ہوتے ہیں۔

تربیت عمل سے نہ کہ زبان سے

بہت سے ماں باپ ایسے ہیں جو تربیت کے لیے وعظ و نصیحت اور زبانی امر و نہی کافی سمجھتے ہیں۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ جب وہ بچے کو امر و نہی کر رہے ہوتے ہیں اسے زبانی سمجھا بچھا رہے ہوتے ہیں تو گویا وہ تربیت میں مشغول ہیں اور باقی امور حیات میں وہ تربیت سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا بلیکسر ننھے بچے کو تربیت کے قابل نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ابھی بچہ ہے کچھ نہیں سمجھ سکے گا۔ جب بچہ رشد و تمیز کی عمر کو پہنچتا ہے تو وہ تربیت کا آغاز کرتے ہیں۔ جب وہ خوب و بد کو سمجھنے لگے تو اس کی تربیت شروع کرتے ہیں۔ جب کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ بچہ اپنی پیدائش کے روز ہی سے تربیت کے قابل ہوتا ہے۔ وہ لفظ لفظ تربیت پاتا ہے اور ایک خاص مزاج میں ڈھلتا چلا جاتا ہے، ماں باپ متوجہ ہوں یا نہ ہوں۔ بچہ تربیت کے لیے اس امر کا انتظار نہیں کرتا کہ ماں باپ اسے کسی کام کا حکم دیں یا کسی چیز سے روکیں نہ بچے کے اعصاب اور حساس و ظریف ذہن روز اول ہی سے ایک کیمرے کی طرح تمام چیزوں کی فلم بنانے لگتے ہیں اور اسی کے مطابق اُس کی تعمیر ہوتی ہے اور وہ تربیت پاتا ہے۔ پانچ چھ سال بچہ تعمیر شدہ ہوتا ہے اور جو ایک خاص صورت اختیار کر چکا ہوتا ہے اور جو کچھ اسے بنا ہوتا ہے بن چکتا ہے۔ اچھائی یا بُرائی کا عادی ہو چکتا ہے لہذا بعد کی تربیت بہت مشکل اور کم اثر ہوتی ہے بچہ تو بالکل متعلقہ ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ اور ادھر ادھر رہنے والے دیگر لوگوں کے اعمال، رفتار اور اخلاق کو دیکھتا ہے اور اس کی تقلید کرتا ہے وہ ماں باپ کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور انہیں کے طرز حیات اور کاموں کو اچھائی اور بُرائی کا

میدار قرار دیتا ہے اور پھر اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بچے کا وجود تو کسی سانچے میں نہیں ڈھلا ہوتا وہ ماں باپ کو ایک نمونہ سمجھ کر اُن کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتا ہے۔ وہ کردار کو دیکھتا ہے باتوں اور ہند نصیحت پر توجہ نہیں دیتا۔ اگر کردار گفتار سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ کردار کو ترجیح دیتا ہے۔

بیٹی اپنی ماں کو دیکھتی ہے اور اس سے آداب زندگی، شوہر داری، غلام خادمی اور بچوں کی پرورش کا سلیقہ سیکھتی ہے اور اپنے باپ کو دیکھ کے مردوں کو پہچانتی ہے۔ بیٹا اپنے باپ کے طرز زندگی سے درس حیات لیتا ہے اس سے بیوی اور بچوں سے سلوک کرنا سیکھتا ہے اور اپنی ماں کے طرز عمل سے عورتوں کو پہچانتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے اسی کو دیکھ کر منصوبے بناتا ہے۔

لہذا ضرور اور آگاہ افراد کے لیے ضروری ہے کہ ابتدا میں ہی اپنی اصلاح کریں۔ اگر ان کے اعمال، کردار اور اخلاق عیب دار ہیں تو ان کی اصلاح کریں۔ اچھی صفات اپنائیں نیک اخلاق اختیار کریں اور پسندیدہ کردار ادا کریں۔ مختصر یہ کہ اپنے آپ کو ایک اچھے اور کامل انسان کی صورت میں ڈھالیں اس کے بعد نئے انسانوں کی تولید اور پرورش کی طرف قدم بڑھائیں۔

ماں باپ کو پسے سوچنا چاہیے کہ وہ کس طرح کا بچہ معاشرے کے سپرد کرنا چاہتے ہیں اگر انہیں پسند ہے کہ ان کا بچہ خوش اخلاق، مہربان، انسان دوست، خیر خواہ، دیندار، با ہدف، شریف، آگاہ، حریت پسند، شجاع، مفید، فعال اور فرض شناس ہو تو خود انہیں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تاکہ وہ بچے کے لیے غور نہ عمل قرار پائیں۔ جس ماں کی خواہش ہو کہ اس کی بیٹی فرض شناس، خوش اخلاق، مہربان، سمجدار، شوہر کی وفادار، باتیں مز، ہر طرح کے حالات میں گزر بسر کر لینے والی اور نظم و ضبط سے زندگی گزارنے والی ہو تو خود اسے بھی ایسا ہونا چاہیے تاکہ اس کی بیٹی اس سے درس حیات حاصل کرے۔ اگر ماں بد اخلاق، بے ادب، است، بے نظم، بے مہر، کثیف، دوسروں سے زیادہ توقع باندھنے والی اور بہانہ ساز ہو تو وہ صرف وعظ و نصیحت سے ایک اچھی بیٹی پروان نہیں پڑھا سکتی۔

ڈاکٹر جلالی کہتے ہیں،

”بچوں کو احساسات اور جذبات کے اعتبار سے وہی لوگ صحیح تربیت دے سکتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے بچپن میں اور باقی تمام عمر صحیح تربیت پائی ہو۔ جو ماں باپ آپس میں ناراض رہتے ہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھگڑتے ہوں، یا جن لوگوں نے کاروبار کے طور پر پرورش کا سلسلہ شروع کیا ہو اور انہیں تربیت دینے کا کوئی ذوق و شوق نہ ہو۔ اور جو بچوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں، انہیں خود کو صلی سے عاری ہوں اور غصیلی طبیعت رکھتے ہوں اور جنہیں خود اپنے آپ پر اعتماد ہو وہ بچوں کے جذبات اور احساسات کو صحیح راستے پر نہیں ڈال سکتے۔“

ڈاکٹر جلالی مزید کہتے ہیں:

”بچے کی تربیت جس کے بھی ذمے ہو اسے چاہیے کہ کبھی کبھی اپنی صفات کا بھی جائزہ لے اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں سوچے اور اپنی خامیوں کو دور کرے۔“

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: لَا تَنْتَهِزْ بِإِسْمِ اللَّهِ إِلَّا بِإِحْسَانٍ مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ إِمَامًا فَلْيَبْدَأْ بِتَعْلِيمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِيمِ غَيْرِهِ وَلْيَكُنْ تَأْدِيبُهُ بِسِيَرَتِهِ قَبْلَ تَأْدِيبِهِ بِلِسَانِهِ وَمُعَلِّمُ نَفْسِهِ وَمُسَوِّدُهَا أَحَقُّ بِالْإِجْلَادِ مِنْ مُعَلِّمِ النَّاسِ وَمُسَوِّدِهِمْ۔

جو شخص دوسروں کا پیشوا بنے چاہیے کہ پہلے وہ اپنی اصلاح کرے پھر دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھے اور دوسروں کو زبان سے ادب سکھانے سے پہلے اپنے کردار سے ادب سکھائے اور جو اپنے آپ کو تعلیم اور ادب سکھاتا ہے وہ اس شخص کی نسبت زیادہ عزت کا حقدار ہے جو دوسروں کو ادب

۱۔ روان شناسی کودک - ص ۲۹۶

۲۔ روان شناسی کودک ص ۲۹۷

لکھتا ہے۔ - پنج البلاغہ - کلمات قصار نمبر ۷۳

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

وَقَدْ دَاكَبَادَ كُفْرُ يَوْمٍ كُفْرُ صَغَارِ كُفْرٍ -

تم اپنے بزرگوں کا احترام کرو تا کہ تمہارے بچے تمہارا احترام کریں۔

(غزوا الحکم - ص - ۱۷۸)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر سے فرمایا :

جب کوئی شخص خود صالح ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نیک ہو جانے کے وسیلے سے اس کی اولاد اور اس کی اولاد کی اولاد کو بھی نیک بنا دیتا ہے۔

مکالم الاخلاق - ص ۵۲۶

امیر المؤمنین علیہ السلام فرماتے ہیں :

إِنْ سَمِعْتَ رَعِيَّتَكَ يَدُ صَلاَحِ النَّاسِ فَايْتِدُ بِنَفْسِكَ فَإِنَّ تَعَاظِيكَ
صَلاَحَ غَيْرِكَ وَأَنْتَ فَاسِدٌ أَكْبَرُ الْعَيْبِ -

اگر تو دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو اس سلسلے کا آغاز اپنی ذات کی اصلاح سے کر اور اگر تو دوسروں کی اصلاح کرنا چاہے اور اپنے آپ کو فاسد ہی رہنے دے تو یہ سب سے بڑا عیب ہو گا۔

غزوا الحکم ص ۲۷۸

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

رَأَى الْوَعْظَ الَّذِي لَا يَمْتَحُ سَمْعٌ وَلَا يَعْدِلُهُ نَفْعٌ مَا سَكَتَ عِنْدَ
لِسَانِ الْقَوْلِ وَنَطَقَ بِهِ لِسَانُ الْفَعْلِ -

جس نصیحت کے لیے زبان گفتار خاموش ہو اور زبان کردار گویا ہو کوئی کان اسے باہر نہیں نکال سکتا اور کوئی فائدہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ غزوا الحکم ص ۲۳۲

ایک خاتون اپنے ایک خط میں لکھتی ہے :

..... میرے ماں باپ کے کردار لے مجھ پر بہت اثر کیا ہے انہوں نے ہمیشہ

میرے ساتھ اور میرے بہن بھائیوں کے ساتھ مہربانی کی ہے۔ میں نے کبھی بھی ان کے

کردار اور گفتار میں بڑائی نہیں دیکھی۔ خود ہماری بھی عمارت ویسی ہی ہو گئی۔ میں ان کا اچھا اخلاق اور کردار بھلا نہیں سکتی۔ اب جب کہ میں خود ماں بن گئی ہوں تو کوشش کرتی ہوں کہ کوئی بڑا کام خاص طور پر اپنے بچوں کے سامنے مجھ سے سرزد نہ ہو۔ میرے ماں اور باپ کا کردار میری زندگی میں میرے لئے نمونہ عمل بن گیا۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنے بچوں کی بھی اس طرح سے تربیت کروں۔

ایک اور خاتون اپنے خط میں لکھتی ہیں:

..... جب میں اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے یاد آتا ہے۔ کہ میری ماں چھوٹی چھوٹی باتوں میں ایسے ہی چپختی چلاتی تھی۔ اب جب کہ میں خود ماں بن گئی ہوں تو میں دیکھتی ہوں کہ تھوڑی سی کمی کے ساتھ وہی میری حالت بھی ہے۔ اس کی ساری بد اخلاقیات مجھ میں پیدا ہو گئی ہیں اور عجیب مسئلہ یہ ہے کہ میں جتنا بھی کوشش کرتی ہوں کہ اپنی اصلاح کروں نہیں کر پاتی ہوں۔ یقینی طور پر میرے لئے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ماں باپ کا کردار اور اخلاق اولاد کی تربیت پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ماں اپنی تربیت کے ذریعے ایک دنیا کو بدل سکتی ہے بالکل درست بات ہے۔

گھریلو لڑائی جھگڑے سے پرہیز

بچے کے لیے گھر آشیانے کے مانند ہے۔ وہ خود کو اس سے وابستہ سمجھتا ہے اور اس کا دل اسی سے بندھا ہوا ہے۔ اگر اس کے ماں باپ آپس میں اچھے دوست ہوں تو اس کا آشیانہ پائیدار، گرم آغوش کی طرح اور یا صفا ہوگا۔ ایسے گھر میں بچہ آرام و اطمینان کا احساس کرے گا۔ اس اچھے آشیانے میں پرورش پانے سے بچے کی داخلی صلاحیتیں صحیح طور پر پروان چڑھتی ہیں اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ماں باپ میں لڑائی جھگڑا ہوا تو بچے کا بچپن اور سکون چھن جاتا ہے۔ وہ پریشان اور مضطرب رہتا ہے۔ ماں باپ آپس میں لڑ رہے ہوتے ہیں انہیں اس امر کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ بے چارے بچے کی کیا کیفیت ہے۔ ایسے عالم میں بچے خوف زدہ ہوتے ہیں اور ان کے دل ٹوٹے ہوتے ہیں وہ یا کسی کو نے کھد رے میں حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوتے ہیں یا پھر ایسے آشیانے سے فرار کر کے کسی کوچہ و بازار میں پناہ حاصل کرتے ہیں۔ بچے کی زندگی کی تلخ ترین یادیں اس کے ماں باپ کی باہمی لڑائی ہے۔ بچے ایسے واقعات اپنی آخری عمر تک بھلا نہیں پاتے۔ یہ واقعات ان کی روح پر بڑے طریقے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

ایسے بچوں کے دلوں میں گڑبڑ پڑ جاتی ہیں، اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں، دل شکستہ رہتے ہیں اور وہ بدبینی کے عالم میں زندگی گزارتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسے گھر کی بیٹی اپنے ماں کی بد اخلاقی اور کم مزاجی سے یہ سمجھے کہ سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن ہے اس خیال کے باعث وہ شادی کے نام ہی سے خوف کھاتی ہو۔ ہو سکتا ہے ایسے گھر کا بیٹا

اپنی ماں کی بد اخلاقی اور لڑاکا پن کے باعث سب عورتوں کو ایسا ہی خیال کرے اور شادی سے بیزار ہو جائے۔ اس صورت حال میں اولاد کے دل میں ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے لیے کینہ اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اولاد انتقامی حربے بھی اختیار کرتی ہے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے گوارہ و نشہ باز اور بد کردار بچے ماں باپ کے روز و روز کے جھگڑوں کے باعث اس مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔

اگر آپ اپنے بچوں کے تلخ واقعات اور ماں باپ کے اختلافات (اگر تھے) کا سوچیں تو آپ محسوس کریں گے کہ ساہا سال گزرنے کے باوجود ان کی تلخ یادیں آپ کے ذہن پر نقش ہیں۔

ایک دانشور کہتے ہیں:

ماں باپ کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ گھر کے بڑے افراد کے درمیان لڑائی جھگڑا بچوں پر بڑا اثر ڈالتا ہے اور بڑوں کے باہمی روابط بچے کی شخصیت کی تعمیر پر اثر انداز ہوتے ہیں..... اگر ایک گھر میں اتفاق و اتحاد کی فضا نہ ہو تو ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ وہاں بچوں کی صحیح پرورش ہو سکے۔ جب بڑے (ڑٹے جھگڑنے لگیں تو انہیں بھول جاتا ہے کہ بچے بھی ان کے ساتھ ہیں اور ان کی تربیت بھی ان کے ذمہ ہے۔ ایسی صورت میں بچہ کوئی صحیح سبق نہیں سیکھ سکتا۔ اس کا مزاج بھی خراب ہو جاتا ہے وہ تند مزاج اور گوش نشین ہو جاتا ہے۔ خصوصاً کچھ بڑی عمر کے بچے ایسی صورت میں سخت شکل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ ان کا دل باپ کی حالت پر کڑھتا ہے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس کا ساتھ دیں اور کس کے ساتھ ہو جائیں۔ کبھی وہ حقیقت کو پہچانے بغیر ہر دو کے خلاف ہو جاتے ہیں۔

کسی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

”..... میرے بچپن کے بدترین واقعات میں سے وہ مواقع ہیں کہ جب میرے مال باپ آپس میں جھگڑتے تھے اور گالی گلوچ کرتے تھے۔ میں، میری بہن اور میرا بھائی ایسے موقع پر ایک طرف ٹھہرے ہو کر رزرتے رہتے تھے۔ جب تک لڑائی رتی تھی ہم میں کچھ کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میری چھوٹی بہن اس صورت حال کو دیکھ کر رونے لگتی تھی اور کتنی دیر تک اس کے اوسان بحال نہ ہوتے تھے۔ اس وقت وہ مصنف اعصاب کا شکار ہو چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے مال باپ کے لڑائی جھگڑے میری بہن کی روح پر بڑی طرح اثر انداز ہوئے ہیں.....“

ایک مرد نے اپنے خط میں لکھا ہے۔

”..... بچپن کے ایک تلخ واقعے کی یاد میرے دل سے جاتی ہی نہیں۔ میرا باپ بہت بداخلاق، بدسلوک، غصیلہ، اور خود غرض تھا۔ گھر میں وہ بہانے بہانے سے جھگڑتا رہتا اور سب پر رستا۔ ہمارے مال باپ صبح سے آدھی رات تک آپس میں لڑتے رہتے، خدا جانے وہ تھکے کیوں نہ تھے۔ جھگڑے بھی بالکل معمولی باتوں پر ہوتے تھے۔ کوئی رات ایسی نہ تھی کہ میں روئے بغیر سو جاتا۔ اسی وجہ سے میرے اعصاب کمزور پڑ گئے ہیں اور تارستا ہوں اور ڈراؤنے خواب دیکھتا ہوں۔ ڈاکٹر کے پاس بھی گیا ہوں وہ کہتا ہے کہ گھریلو اختلافات کا اثر ہے اور اس کا آرام کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے۔ میری خوشی کا زمانہ اس وقت شروع ہوا جب میری شادی ہو گئی اور میں نے اُس گھر سے نجات پائی اور اب اگرچہ میری زندگی اچھی گزر رہی ہے پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے میں ایک شکست خوردہ آدمی ہوں اور زندگی میں ترقی نہیں کر سکتا۔ میں والدین سے درخواست کرتا ہوں کہ خدا را! اگر تمہارے درمیان کوئی اختلاف ہو بھی تو اپنے بچوں کے سامنے لڑائی جھگڑا نہ کرو۔

وہ اپنے تفصیلی خط میں مزید لکھتا ہے: میرے بچپن کا بدترین واقعہ وہ ہے کہ میں جب آٹھ سال کا تھا اور میرے والدین کے درمیان سخت جھگڑا رونما ہوا۔ سارے

بچے ڈر کے مارے مختلف گوشوں میں جا چھپے اس واقعے کا میری روح پر ایسا اثر
 ہوا کہ میں ایک عرصے تک مضطرب اور پریشان رہا۔ میں اپنے گھر والوں سے بیزار
 ہو گیا۔ میرا دل نہ کرتا کہ سکول سے گھر آؤں۔ میں خدا سے دعا کرتا کہ مجھے میرا جادو اور
 مرجادو۔ کئی دفعہ میں نے خودکشی کا سوچا کئی مرتبہ خوابوں میں میں نے دیکھا کہ میں اپنی
 ہونے والی بیوی سے لڑ رہا ہوں اور اس سے جنگ و جدال میں مصروف ہوں
 عالم خواب میں میں یہ پروگرام بناتا کہ اپنے حق کو میں کیسے بچا سکتا ہوں۔ شادی کے
 شروع شروع میں میں نے کئی بہانوں سے کوشش کی کہ اپنی بیوی سے جھگڑوں اور
 اسے بتاؤں کہ میں بہت غصے والا ہوں اور اپنی آواز سے بولوں تاکہ اس پر ظاہر کر
 سکوں کہ میری بھی کوئی شخصیت ہے۔ خوش قسمتی سے میری بیوی ٹھنڈے دل و
 دماغ والی اور عقل مند تھی۔ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرتی تھی اور اس کے بعد
 دلیل و برہان سے مجھے مطمئن کرتی۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ میرا یہ مزاج
 زیادہ دیر تک باقی نہ رہا۔ جب مجھے اپنے ماں باپ کی غلطی کا احساس ہوا اور
 میں نے خود اپنی کمزوریوں پر نظر کی تو میں نے اپنے اخلاق کو تبدیل کر لیا۔ اور
 اب زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔

ایک اور صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

..... میں نرسال کا تھا کہ میرے ماں باپ نے باہمی اختلافات کی وجہ سے ایک
 دوسرے سے جدائی کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے مجھے، میری بہن اور بھائی کو دوا اسکے
 گھر بھجوا دیا۔ ہم وہاں روتے رہتے۔ جب میں اپنی ماں سے ملنے جاتا تو راتوں
 کو ایسے خواب دیکھتا کہ کہہ رہا ہوتا کہ میں ابو کے گھر نہیں جاؤں گا۔ کچھ عرصے کے
 بعد امی اور ابو کے بعض رشتہ داروں نے مل کر صلح کرادی اور میری امی واپس
 گھر آئی۔ لیکن اس قحطی سے عرصے نے میری روح پر ایسا اثر کیا کہ ابھی تک
 اس کے آثار باقی ہیں۔ میں اب کوشش کرتا ہوں کہ اگر میرے اور بیوی کے درمیان
 کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اپنے بچوں کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیں۔

ایک اور خطاطی کیجئے،

..... میرے بچپن کی بہت سی تلخ یادیں ہیں، خوشی کی یادیں تو بہت ہی کم ہیں۔ جب مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے تو ناراحت ہو جاتی ہوں اور بے اختیار میرے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس غم کی وجہ یہ ہے کہ جب سے مجھے یاد ہے میں نے ہمیشہ اپنے ماں باپ کو محبت و جدل اور لڑائی جھگڑا کرتے ہی دیکھا۔ اس طرح انہوں نے مجھ پر اور میرے بہن بھائیوں پر زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے اسی وجہ سے میں اپنے شوہر سے تو شہر نہیں کرتی اور اپنے شوہر اور بچوں کی زندگی تلخ نہیں کرتی۔

ایک خط میں کسی نے لکھا،

..... پانچ سال کی عمر بچپن کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ میں اس عمر کا تھا کہ میرے ماں باپ میں شدید اختلاف پیدا ہوئے۔ میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اس اختلاف کی وجہ سے میری ماں نے طلاق لے لی۔ ہم چھ بہن بھائی تھے۔ ایک دن بہت تلخ تھا۔ میں اور میرا بھائی کھیل رہے تھے کہ امی جان خدا حافظ کہنے کو آئیں۔ خدا جانتا ہے کہ بچے کس قدر ناراحت ہوئے۔ ہماری ماں چلی گئی اور ہم اپنے باپ اور نئی ماں کے ساتھ رہ گئے۔ دو سال گویا ہم ماں کے بغیر رہے اور باپ کی بے اعتنائی کے صدمے بہتے رہے۔ اس کے بعد ایک روز ہماری آئی اچھی اور مجھے اور میرے بھائی کو اپنے گھر لے گئیں۔ انہیں ہماری مافیہ سے جائیداد سے کچھ حصہ ملا تھا وہ اسی کے ذریعے ہماری دیکھ بھال کرتی رہیں۔ پھر دیگر بہن بھائی بھی آگئے۔ ہماری ماں نے ہمارے ساتھ ماں کا کردار بھی ادا کیا اور باپ کا بھی۔ ہم اس کے ایثار اور قربانیوں کو بھکانیں سکتے۔

ایک خاتون اپنے خط میں لکھتی ہے،

..... میرے ماں باپ ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ اور ہمارے گھر میں ایک جنگ جال بپا ہوتا تھا۔ ہماری ماں ہمیشہ غصے میں رہتی ہیں آٹھ سال کی تھی دوسرے

بچوں کو میسر پاس پھوٹتی اور چلی جاتی۔ میرے بہن بھائی کوئی دو سال کا تھا، کوئی چار سال کا تھا، کوئی چھ سال کا تھا۔ یہاں تک کہ ایک چھ ماہ کا بھی تھا۔ میں ناچار ان سب کی خدمت کرتی رہتی۔ کبھی باپ سے بھی مار کھاتی۔ ان سارے حالات کے باوجود میں کوشش کرتی کہ پڑھتی بھی رہوں لیکن دوسری جماعت میں میں فیل ہو گئی تھی۔ میری استانیوں کو میرے حالات کی خبر تھی۔ انہوں نے میرے اوپر رحم کیا اور مجھے کچھ اضافی نمبر دے دیئے۔ انہیں حالات میں میں ہائی سکول تک چاہنپی۔ اس وقت تو میں خود ماں بن چکی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ جنگ و جدل سے نہ اپنے آپ کو بے آرام کروں اور نہ شوہر اور بچوں کو۔

جو ماں باپ احساس ذمہ داری رکھتے ہیں اور انہیں اپنے بچوں کی تربیت سے دلچسپی ہے تو انہیں چاہیے مگر کے لڑائی بھگڑے سے سختی سے اجتناب کریں اور ہر گز بچوں کے سامنے لڑائی بھگڑا نہ کریں اور لمبی کدورتوں اور باہمی غصے سے بچوں کے لیے ناراضی اور پریشانی کے اسباب فراہم نہ کریں۔ اس سے بڑھ کر کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ ماں باپ گھر میں بھگڑیں اور بے گناہ بچوں کو چھوڑ کر اپنی راہ لیں۔ اگر ماں باپ کو پتہ ہو کہ اس مدت میں اگرچہ وہ تھوڑی سی ہی کیوں نہ ہو، بچوں پر کیا گزری تو وہ کبھی اس لڑائی بھگڑے کو اختیار نہ کریں۔ ایسے واقعات آخر عمر تک نہیں بھولتے اور اولاد کی روح کو اداس اور پریشان کر دیتے ہیں۔ البتہ شاید بہت کم ہی گھرایسے ہوں جہاں سیٹے کا اختلاف نہ ہو۔ لیکن ازدواجی زندگی میں درگزر کی ضرورت ہوتی ہے۔ سمجھاؤ اور آگاہی ماں باپ اپنے اختلافات کو انہماق و تفہیم اور منطق و استدلال کے ذریعے سے حل کرتے ہیں اور اگر ناچار کچھ سخت سست کہنا ہی پڑ جائے تو بچوں کے سامنے ایسا نہیں ہونا چاہیے اور اگر بچوں کو کچھ پتہ چل بھی جائے تو انہیں بتانا چاہیے کہ اختلاف کام میں نہیں ہے بلکہ ہمارے درمیان صرف طریقے میں اختلاف اور شکلات ہیں اور ان کے حل کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ ماں باپ کو نہیں چاہیے اگرچہ وہ غصے کے عالم میں ہوں طلاق اور جدائی کا ذکر کریں۔ کیونکہ اس سے نہ فقط ازدواجی زندگی متزلزل ہو جاتی ہے بلکہ بچوں کے لیے بھی بے اطمینانی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ میاں بیوی کی ایک دوسرے سے جدائی اولاد کے ساتھ

بھی ایک بہت بڑی خیانت ہے۔ کیونکہ ان کا تو گویا آشیانہ گر جاتا ہے اور ان کی زندگی پریشان و
 دیرانی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بچے تو ماں باپ دونوں کو چاہتے ہوتے ہیں نہ کہ ان میں سے کسی ایک کو۔
 اگر طلاق کے بعد بچے باپ کی تحویل میں رہیں اور وہ دوسری شادی کر لے تو وہ بے گناہ مجبوراً سوتیلی
 ماں کے زیر دست زندگی گزاریں گے۔ سوتیلی ماں اگرچہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو حقیقی ماں کی جگہ نہیں
 لے سکتی۔ زیادہ تر تو وہ اپنے شوہر کے بچوں کو اذیت و آزار ہی پہنچاتی ہے۔ سوتیلی ماں کے سلوک
 کے بارے میں آپ اخبار و جرائد میں پڑھتے ہی ہوں گے اور اگر بچے ماں کی تحویل میں چلے جائے
 تو اگرچہ وہ باپ سے بہتر نگہداری کرتی ہے لیکن باپ کی جگہ خالی رہتی ہے اور باپ سے دوری
 کا غم انہیں ستاتا رہتا ہے اور اگر وہ دونوں ڈھٹائی سے کام لیں اور اپنے بچوں کو کسی اور کے
 پاس چھوڑ دیں تو وامصیبتا۔

بہر حال بچے پیدا ہونے سے پہلے میاں بیوی آزاد ہیں۔ لیکن اولاد کی پیدائش کے بعد
 وہ ذمہ دار بن کر اختلاف سے پرہیز کریں اور گھر کے نظام کی حتی المقدور حفاظت کریں اور بے گناہ
 بچوں کی پریشانی اور اذیت کا سامان فراہم نہ کریں ورنہ وہ بارگاہِ دل الہی میں جواب دہ ہوں گے
 اور ان کا مواخذہ کیا جائے گا۔

مال کی حیثیت سے زندگی کا آغاز

جب مرد کا نطفہ (SPERM) عورت کے رحم میں جاتا ہے اور عورت کے نطفہ (OVAL) سے ملتا ہے تو اس لمحے سے عورت کے لیے مال بننے کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی وقت سے عورت کے رحم میں ایک زندہ موجود وجود میں آتا ہے اور وہ تیزی کے ساتھ حرکت کرتا ہوا مکمل کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ بہت چھوٹا سا وجود غیر معمولی عورت کے ساتھ پرورش پاتا ہے اور بڑا ہوتا ہے یہاں تک کہ ایک انسان کی کامل صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کی عمر حقیقی طور پر اُسی زمانے سے شروع ہو جاتی ہے۔

ایک دانشور لکھتا ہے :

جس وقت انسان اس دنیا میں آتا ہے تو وہ ہمیشہ اس کی عمر کے گزر چکے ہوتے ہیں۔ اور ان اولین فومینوں میں وہ ایسے مراحل سے گزرتا ہے کہ جس میں ایک ایسے وجود کا تعین ہو جاتا ہے جو بالکل مختلف اور بے نظیر ہوتا ہے اور یہ زمانہ اس کی ساری عمر کے لیے مؤثر ہوتا ہے۔

عورت جب حاملہ ہو جاتی ہے تو اسی وقت سے وہ مال بن جاتی ہے اور جو بچہ اس کے پیٹ رحم میں پرورش پاتا ہوتا ہے اس کے بارے میں وہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ باپ کا نطفہ قانون وراثت کے اعتبار سے بچے کی جسمانی اور نفسیاتی شخصیت پر اثر رکھتا ہے

لیکن اس موجود زندہ کا مستقبل بہت زیادہ ماں کے اختیار میں ہوتا ہے۔ باپ کا نطفہ بیج کی حیثیت رکھتا ہے اور ماحول کسی فرد کی شخصیت کی پرورش پر بہت زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

ایک دانشور لکھتا ہے :

بچے کے والدین اس کی ایک ایسے ماحول میں نشوونما کر سکتے ہیں کہ جو اس کی طبیعت اور مزاج کے لیے صحیح و سلامت ہو اور وہ اسے ایک خراب اور گندے ماحول میں بھی پروان چڑھا سکتے ہیں۔ اور امر مسلم ہے کہ ایسا ماحول ایک انسان کی روح جاوداں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں باپ انسانیت کی طرف سے سب سے بھاری ذمہ داری کے حامل ہوتے ہیں۔

ہر شخص کی سلامتی یا بیماری، طاقت یا کمزوری، خوبصورتی یا بد صورتی، خوش استعدادی یا بد استعدادی اور خوش اخلاقی یا بد اخلاقی کی بنیاد ماں کے رحم میں پڑتی ہے۔ بچے کی خوش بختی یا بد بختی کی اساس ماں کے بطن میں ہی رکھی جاتی ہے۔ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

ہر شخص کی سعادت اور بد بختی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ ماں کے رحم میں ہوتا ہے۔

دورانِ حمل ایک نہایت حساس اور ذمہ داری کا زمانہ ہے۔ ایک خاتون کہ جو اپنی اہم ذمہ داری سے واقف ہو وہ دورانِ حمل کو ایک معمولی زمانہ تصور نہیں کر سکتی اور اس سے بے پرواہ نہیں رہ سکتی کیونکہ اگر وہ تھوڑی سی بھی غفلت یا سہل انگاری سے کام لے تو ممکن ہے اس کی اپنی صحت خراب ہو جائے یا اس کا بچہ ناقص ہو جائے، یا بیمار پڑ جائے اور ہمیشہ کے لیے بد نصیب بن کر دنیا میں آئے۔ اور ساری عمر آہ و زاری کرتا رہے۔

۱۔ رازِ آفرینش انسان ص ۱۰۸۔

۲۔ بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۱۳۲ نیز ج ۷۷۔ ص ۱۱۵

ایک دانشور لکھتے ہیں:

ماں کا بدن اور اس پر اثر انداز ہونے والے واقعات بچے کے پروان چڑھنے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بچہ ماں کے بدن کی نسبت حساس تر ہوتا ہے چونکہ ماں کا بدن تو مکمل ہو چکا ہوتا ہے اور اُسے ابھی تکمیل کے مراحل طے کرنا ہوتے ہیں۔ لہذا ہر عورت کا یہ فریضہ ہے کہ اپنے بچے کے پہلے گھر کے لیے بہترین ماحول فراہم کرنے کی کوشش کرے اور ایسا وہ صرف اسی صورت میں کر سکتی ہے کہ جب اسے معلوم ہو کہ کون سے واقعات اور امور بچے کے رشد پر اثر انداز ہوتے ہیں صرف اس امر سے ڈرتے رہنا کہ بچے کا رشد معمول کے خلاف ہو بچے کی جلدائی کے لیے کافی نہیں ہے اور ان عوامل سے غفلت کہ جو اس چیز کا باعث بنتے ہیں کسی درو کی دوا نہیں بن سکتی۔ انسان کا رشد کس طریقے سے ہوتا ہے اور کس طریقے سے اس میں تبدیلیاں جنم لیتی ہیں اگر ماں اس سے واقف ہو تو وہ اپنی ذمہ داری ادا کر سکتی ہے اور ان نوہینوں میں بچے کے لیے زندگی کا بہترین ماحول فراہم کر سکتی ہے۔ بچے کی نشو و نما کے لیے ولادت سے پہلے یا ولادت کے بعد ایک کامل ماحول کی ضمانت کبھی بھی ممکن نہیں البتہ قدر مسلم یہ ہے کہ تمام والدین یہ چاہتے ہیں کہ ایک سالم اور صحت مند بچہ دنیا میں آئے یہ والدین اور گھر کے بڑے افراد کی ذمہ داری ہے کہ بچے کو صحیح و سالم دنیا میں لانے کی کوشش کریں۔ البتہ جہات طبعی حوادث کو نہیں روک سکتی۔ اگر انسان کو یہ خبر نہ ہو کہ بچہ کس طرح نشو و نما پاتا ہے تو یہ بے خبری آنے والوں کی بد بختی کا باعث بنتی ہے۔ دنیا میں بے نقص آنا ہر انسان کا حق ہے لہ

جنین کی سلامتی میں ماں کی غذا کا اثر

رحم مادر میں بچہ ماں کے بدلی کا کوئی باقاعدہ حصہ نہیں ہوتا تاہم وہ ماں کے خوں اور غذا سے ہی پرورش پاتا ہے۔ ایک حاملہ خاتون کی غذا کا مل ہوئی چاہیے جو ایک طرف تو خود اس کے بدن کی ضروریات پوری کر سکے تاکہ اس کی جسمانی طاقت اور تندرستی میں کوئی کمی واقع نہ ہو اور صمیم و سالم طریقے سے اپنی زندگی جاری رکھ سکے اور دوسری طرف اس کی غذا کو بچے کے جسم کی ضروریات کا بھی کفیل ہونا چاہیے تاکہ وہ معصوم بچہ اچھے طریقے سے پرورش پاسکے اور اپنی اندرونی طاقتوں کو ظاہر کر سکے۔

لہذا ایک حاملہ عورت کا غذائی پروگرام سوجا سمجھا کسی حساب کے تحت اور مرتب ہونا چاہیے۔ کیونکہ ممکن ہے بعض وٹامن یا غذائی مواد کی کمی سے ماں کی سلامتی خطرے میں جا پڑے یا بچے کی صحت و سلامتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے۔

اسلام کی نظر میں ماں کی غذا بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ حاملہ عورت کہ جس کے اپنے لیے یا اس کے بچے کے لیے روزہ رکھنا باعث ضرر ہو اسے اجازت دی گئی ہے کہ ماہ رمضان کا واجب روزہ نہ رکھے بعد میں نفا کرے۔

ایک تحقیق کے مطابق دنیا کے اتنی نیم صدائیں الخلق نیز فکری، اعصابی یا جسمانی طور پر کمزور بچوں کے نقص اور کمزوری کا سبب یہ ہے کہ رحم مادر میں انہیں صحیح غذا نہیں ملی۔

لے بہداشت جسمی و روانی کو روک دے

ڈاکٹر جزائری کو جو ایک ماہر غذا ہیں لکھتے ہیں،
 ماں اور جنین کی سلامتی اس غذا سے وابستہ ہے کہ جو ماں حمل کے دوران میں
 کھاتی ہے بلکہ

مدتوں سے انسان کو اس بات کا علم ہے کہ جنین اور بچے کے رشد میں
 ولادت سے پہلے اور دودھ دینے کے دوران میں ماں کی غذا اثر رکھتی ہے۔
 ماں کو چاہیے کہ تمام پروٹین، وٹامن، کاربوہائیڈریٹس، روغنیات اور دیگر
 دیکار غذا کو اس زندہ سیل یعنی بچے کی نشوونما کے لیے فراہم کرنے سے تجربات
 سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ماں کے لیے ضروری ہے کہ وٹامنز کی وہ
 مخصوص مقدار جنین کے لیے مہیا کرے کہ جو زندہ خلیوں کے لیے ضروری ہے۔
 اس طرح سے کہ جنین کے رشد کو یقینی بنایا جاسکے کیونکہ مختلف وٹامنز کی کمی
 بچے پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ وہ تو حالت رشد میں ہوتا ہے جب کہ
 ماں کی نشوونما تو مکمل ہو چکی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ دوران حمل ماں بالکل متذرت
 رہے جب کہ بچہ مخصوص وٹامنز کی کمی کا شکار ہو جائے اور اس کے نتیجے میں
 اس کے رشد کی حالت غلط ہو جائے۔

لکڑ کھتا ہے،
 بچے کے غیر طبعی ہونے کی وجہ کبھی یہ ہوتی ہے کہ تخم تو اچھا ہوتا ہے لیکن
 اسے فضا اچھی میسر نہیں آتی اور کبھی یہ ہوتا ہے، تخم اچھا نہیں ہوتا بلکہ فضا اچھی میسر
 آجاتی ہے۔ بہت سارے جسمانی نقائص مثلاً ہونٹوں کا پھٹا ہوا ہونا، آنکھیں
 چھوٹی اور جھٹی ہوئی ہونا اور پاؤں کے تلوے کا ہموار ہونا کہ جن میں پہلے موروثی عوامل
 کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا اب مکمل ماحول بالخصوص دوران حمل آکسیجن کی کمی جیسے عوامل

کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ ماحول اور فضا کو بہت سے پیدائشی نقائص اور بچوں کے
 اعضائے فالج زدہ ہونے کی علت شمار کیا جاتا ہے بلکہ
 امام صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں،
 جو کچھ مال کھاتی اور پیتی ہے بچے کی خوراک اسی سے بنتی ہے۔^{۱۴}

^{۱۴} ردائشناسی کو دک ص ۱۴۰

^{۱۵} بحار الانوار - جلد ۴۰ - ص ۴۴۲

جنین کے اخلاق پر ماں کی غذا کا اثر

ایام حمل میں ماں کی غذا کی کیفیت بچے کے اخلاق، عقل اور استعداد تک پر بہت زیادہ اثر کرتی ہے کیونکہ بچے کے اعصاب اور اس کا مغز ماں کی غذا ہی سے تیار ہوتا ہے اور ہر طرح کی غذا اپنا ایک خاص اثر رکھتی ہے۔ اسلام نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ ماں کی غذا بچے کے اخلاق کی تعمیر میں نہایت مؤثر ہوتی ہے۔ ہم نوٹوں کے طور پر چند احادیث پیش کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا،

ماں کو چاہیے کہ دورانِ حمل کے آخری مہینوں میں کھجور کھائیں تاکہ ان کے بچے خوش اخلاق اور بڑا دہریوں سے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا،

حاملہ عورتوں کو تاکید کرو کہ وہ بھی دانہ کھائیں تاکہ ان کے بچے خوش اخلاق ہوں گے

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا :

بھی دانہ عقل و دانائی کو بڑھاتا ہے لہ

۱۔ مستدرک ج ۳- ص ۱۱۳

۲۔ مستدرک ج ۲- ص ۱۱۶

۳۔ مکالم الاخلاق ج ۱- ص ۱۹۶

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :
 جو عالم عورت پر خیر لڑہ کھائے گی اس کا بچہ خوبصورت اور خوش اخلاق
 ہوگا۔

ماں کی غذا

یہاں ان مختلف قسم کی غذاؤں کے بارے میں تحقیق نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کے خواص اور آثار گنوا سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک دشوار اور مفصل بحث ہے۔ اور راقم اس میں ماہر صی نہیں ہے خوش قسمتی سے اس سلسلے میں بہت سی مفید کتابیں لکھی جا چکی ہیں قارئین ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ بڑا نہیں کچھ مجموعی طور پر اس سلسلے میں بعض امور کی یاد دہانی کروادی جائے۔

اگرچہ حاملہ عورتوں کی غذائی ضروریات بڑھ جاتی ہیں لیکن یہ اس باعث افسوس ہے کہ ان میں کھانے کی طلب کم پڑ جاتی ہے۔ اور ان میں اکثر کی طبیعت بوجھل سی ہو جاتی ہے ایسی صورت میں انہیں کوشش کرنی چاہیے کہ ایسی کم حجم غذائیں کھائیں کہ جو غذائیت کے اعتبار سے کامل و درجہ اول ہوں۔ انسانی بدن کو جن غذاؤں کی ضرورت ہے وہ مختلف چیزوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ لہذا مذا میں تنوع رکھنے سے ایک عورت کے لیے بہترین غذائی پروگرام تشکیل پا سکتا ہے۔ اس میں ایک ماہر سمجھتے ہیں۔

”بدن کو صحیح و سالم رکھنے کے لیے نہ فقط حسب کفایت غذا کی ضرورت ہوتی ہے

بلکہ چاہیے کہ غذا متنوع ہو اور مناسب طور پر مرمت کی جائے۔“

ایک اور ماہر سمجھتے ہیں :

ماں کو چاہیے کہ وہ اپنی صبح و شام کی غذائیں کچھ اضافی وٹامن اور معدنیات اپنے

جسم کو مہیا کرے تاکہ جنین اپنے سات ہمینے کے رشد کے سفر میں اس سے استفادہ کر سکے اور اس سے نہ صرف دانت اور مسوڑھے ہی کیلکین بلکہ اس کی پچیدہ ہڈیاں بھی نشو و نما پاسکیں گے۔
ڈاکٹر غیاث الدین جزائری لکھتے ہیں:

دہی اور پنیر کا استعمال حالت حمل میں عورت کو وٹامن (VITAMIN) اور خاص قسم کا خیر میا کرتا ہے اور اسے ادھر ادھر کی دوسری چیزوں کے کھانے سے روکنے میں مفید ہوتا ہے۔ البتہ کھانا ہی استعمال کرنا حاملہ عورت کے لیے مفید نہیں ہے۔ باسی پنیر کا بھی کوئی کمزور نہیں ہے۔ ہر روز صبح ناشتے کے طور پر ایک گلاس دودھ کا پینا حاملہ عورت کے لیے ضروری ہے نیز آپ بخور کا خیر اور ولیہ بھی مفید ہے اور جڑی، شیر دان، دل، کیلی اور جگر میں وٹامن بی بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور یہ مفید بھی ہیں گے۔

بہت اچھا ہے کہ حاملہ عورتیں مسلسل صبح طریقے سے دودھ سے استفادہ کریں یہ غذا اس قدر مفید اور کامل ہے کہ انبیاء کی باقاعدہ غذا ہی ہے۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں،

دودھ انبیاء کی غذا ہے گے۔

ڈاکٹر غیاث الدین جزائری لکھتے ہیں:

زیادہ تر عورتیں حمل کے دوران کینٹھیم کی کمی کی وجہ سے پاؤں میں درد و کمزوری اور ناخنوں کے ٹوٹنے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ لہذا حاملہ خواتین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ ایسے پھل اور سبزیاں کھائیں کہ جن میں کینٹھیم زیادہ ہوتی ہے۔ اور اسی طرح

۱۔ بیروگرافی پیش از تولد ص ۴۴

۲۔ اجماع زخرا کیا ص ۲۲۳

۳۔ بحار جلد ۳۴ ص ۱۰۱

یعنی اور آپ کو کوفرا میں نہ کریں لے

عام لوگوں کے لیے اور خاص طور پر حاملہ خواتین کے لئے کچی اور پکی سبزیاں اور مختلف پھل بہترین غذا ہیں۔ پودے اور درخت غذائی مواد زمین، پانی، ہوا اور سورج کی روشنی سے حاصل کرتے ہیں اور ہمارے لئے غذائیت رکھتے ہیں۔ صبح و سالم غذا کے لئے تمام پھل مفید ہیں البتہ خاص طور پر مرکبات، سیب، بہی دانہ، ناشپاتی، اور کھجور مفید ہیں لیکن ہر پھل میں تمام تر مواد غذائی نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا اپنا خاص فائدہ اور تاثیر ہے۔ اسی طرح ہر سبزی کی اپنی خاصیت ہے۔ مختلف وٹامن اور مختلف قسم کا غذائی مواد مختلف پھلوں، اناج اور سبزلیوں میں پھیلا ہوا ہے۔ جو شخص اپنی صحت و تندرستی کا خواہش مند ہو اسے چاہیے کہ وہ مختلف پھلوں اور سبزلیوں سے اگرچہ کبھی کبھار ہوا استفادہ کرے۔ خاص طور پر حاملہ عورتوں کے لیے ایسا کرنا مفید اور ضروری ہے۔ دین اسلام نے مسلمانوں سے اور خاص طور پر حاملہ عورتوں کو تاکید کی ہے کہ وہ پھلوں اور سبزلیوں سے استفادہ کریں۔ نمونے کے طور پر چند ایک روایات ذکر کی جاتی ہیں۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا :

ہر چیز کی کوئی نہ کوئی زینت ہے اور سبزی و ستر خوان کی زینت ہے لے

ایک رضا امام رضا علیہ السلام کھانے کے لیے بیٹھے دیکھا کہ سلا دو موجود نہیں ہے خادم سے فرمایا :

تو جانتا ہے کہ میں سلا دو کے بغیر کھانا نہیں کھاتا مہربانی کرو اور سلا دو بھی لے آؤ۔

اور جب سلا دیا تو امام نے کھانا شروع کیا لے

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ،

بہی دانہ کھاؤ کیوں کہ بہی دانہ عقل کو بڑھاتا ہے، غم کو دور کرتا ہے اور بچکے کو

۱۔ اعجاز خوراک ص ۲۲۳

۲۔ مستدرک - جلد ۳ - ص ۱۱۸

۳۔ مکرم الاخلاق - جلد ۱ - ص ۲۰۱

نیک کرتا ہے لہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بہی دانہ کھاؤ اور اس اچھے پھل کو اپنے دوستوں کو ہدیہ کے طور پر دو۔ کیونکہ
بہی دانہ آنکھوں کی بیماری کو زیادہ کرتا ہے اور دلوں کو مہربان کرتا ہے۔ حاملہ عورتیں
بھی اس میوے سے خوب استفادہ کریں تاکہ ان کی اولاد نیک اور خوبصورت
ہو۔ لہ

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

حاملہ عورتیں آخری مہینوں میں کھجور کھالی تاکہ ان کے بچے بڑے دھارم ہوں لہ
حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

کھجور کھاؤ کیونکہ کھجور سب دردوں کی دوا ہے لہ

اس طرح کی احادیث بہت سی ہیں۔ یہ چند حدیثیں نوٹ کرنے کے طور پر ذکر کی گئی ہیں۔ آپ
پھلوں اور سبز لیوں کے خواص کتابوں میں پڑھیں اور اس کے مطابق اپنے کھانے کا پروگرام تیار
کریں یا پھر اس سلسلے میں کسی غذا شناس ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

لہ مکالم الاخلاق - ج ۱ - ص ۱۹۶

لہ مستدرک ج ۲ - ص ۱۱۶

لہ مستدرک ج ۳ - ص ۱۱۳

لہ مستدرک ج ۳ - ص ۱۱۲

تمباکو نوشی

حاملہ عورتوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ سگریٹ اور ہر طرح کی تمباکو نوشی سے بچیں۔ کیونکہ تمباکو نوشی نہ صرف ماں کی صحت کے لئے خطرناک ہے بلکہ اس کے بڑے اثرات رحم میں موجود بچے کے جسم اور اعصاب پر بھی پڑتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم ایک فیملی نجی کے ایک مقالے کا خلاصہ نقل کرتے ہیں۔ اس کی طرف توجہ فرمائیے گا۔

ایک تحقیقی جو سکند انیورسٹی ممالک میں ۶۳۶۲ حاملہ عورتوں پر کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو عورتیں سگریٹ کی عادی ہیں ان کے بچوں کا اوسط وزن دوسرے بچوں کے اوسط وزن سے ۵۰ گرام کم ہوتا ہے۔ وزن کی یہ کمی ان ماؤں کے ۵۰٪ بچوں میں پائی گئی ہے۔ جب کہ دوسری طرف ان بچوں کا قد بھی دوسروں سے کم تر پایا گیا ہے۔ اسی طرح سے ان کے سر اور شانے بھی دوسرے بچوں سے پھوٹے ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی موٹ بھی دوسرے بچوں کی نسبت چھ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ان بچوں کے اعضا میں نقص بھی دوسرے بچوں کی نسبت کہ جن کی مائیں سگریٹ کی عادی نہیں ہیں زیادہ ہوتا ہے۔ سگریٹ کا استعمال ماں اور رحم میں بچے کے خون میں آکسیجن کی کمی اور کاربوکسی ہموگلوبین کی زیادتی کا باعث بنتا ہے۔ سگریٹ پینے والی ماں کے بچوں میں دل کی پیدائشی بیماری دوسری ماؤں کے

بچوں کی نسبت ۵۰٪ زیادہ ہوتی ہے امداد و شمد اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ تبا کو
 نوشی کرنے والی ماؤں کے بچے تعلیم میں اپنے ہم سن بچوں سے پیچھے ہوتے
 ہیں اور یہ عقب ماندگی دورانِ حمل سگریٹ نوشی کی مقدار کے مطابق ہوتی ہے
 کیونکہ سگریٹ بچے کے مغز کے خلیوں کی کمی کا باعث بنتی ہے۔ یہ تو ان نقصانات
 کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے کہ جو سگریٹ نوشی سے ماؤں اور نوزاد بچوں کو پہنچتا ہے۔
 شاید اس کے اور بھی بہت سے عوارض اور پہلو ہیں کہ جو ابھی ناشناختہ ہوں۔
 لہذا وہ سب مائیں جو اپنی اور اپنے بچوں کی صحیح و سالم زندگی کی خواہش رکھتی ہیں انہیں
 نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ تبا کو نوشی سے اجتناب کریں۔
 ڈاکٹر جرزائی لکھتے ہیں :-

تبا کو نوشی ماں کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور رحم مادر میں موجود بچے کے لیے اگلی
 مشروبات بھی حاملہ عورتوں کے لیے غیر معمولی طور پر خطرناک ہیں۔ اسی بات سے صرف نظر کر
 اگلی جو زہر پیدا کرتی ہے اُن دوا منز کو بھی تباہ کر دیتی ہے کہ جو ماں اور اس کے پیٹ
 میں بچے کی ضرورت ہوتے ہیں اور اولاد ناقص الخلقہ اور عیب دار ہو جاتی ہے۔
 تبا کو نوشی اور تیز چائے بھی حاملہ عورتوں کے لیے غیر معمولی طور پر ضرر دہاں ہیں۔
 ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں :

الکحل، چرس اور دیگر تمام منشیات انسان کے خون میں شامل ہو جاتی ہیں اور یہی خون
 جنین کے گرد ہوتا ہے اور نتیجاً اس کے رشد و نمو پر اثر کرتا ہے یہاں تک کہ بعض
 ماہرین کا نظریہ ہے کہ عورتوں کی تبا کو نوشی سے جنین کا دہل متاثر ہوتا ہے اور دل
 کی دھڑکن کو تیز کرتا ہے۔

۱۔ کتب اسلام - سال ۱۵ - شمارہ ۶

۲۔ اعجاز خوراکیہ ص ۲۱۵

۳۔ روانشناسی کودک ص ۲۲۲

اگر حاملہ خاتون بیمار ہو جائے

اگر حاملہ عورت بیمار ہو جائے اور اسے دوا کی ضرورت پڑ جائے تو دوا کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ دوا زیادہ تر بڑی عمر والوں کے لیے تیار کی جاتی ہے اور جب عورت اس سے استفادہ کرتی ہے تو شک نہیں کہ وہ اس کے پیٹ میں جا کر بچے کے بدن تک جا پہنچتی ہے اور اس پر بھی اثر انداز ہوتی ہے کچھ کہا نہیں جاسکتا کہ بچے پر وہ کیا اثر ڈالے۔ بہر حال کوئی بھی دوا پیٹ میں موجود بچے کے لئے بے اثر نہیں ہوتی لہذا حاملہ خاتون کو نہیں چاہیے کہ بغیر سوچے سمجھے نتیجے کو ملحوظ رکھے بغیر دوا استعمال کرے اولاً تو جب تک ضرورت تقاضا نہ کرے دوا استعمال نہ کرے۔ ثانیاً اگر ناچار ہو جائے تو لازمی طور پر ڈاکٹر کو بتائے کہ میں حاملہ ہوں کیا یہ دوا میرے بچے کے لیے تو ضرر رساں نہیں لہذا کسی لائق ڈاکٹر کے مشورے سے ضروری مقدار میں دوا کھائے۔

البتہ اگر بیماری کوئی اہم ہو تو چاہیے کہ اپنی سلامتی اور بچے کی حفاظت کے لئے ڈاکٹر کی طرف رجوع کرے کیونکہ وہ بیماری نہ صرف مال کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے بلکہ ممکن ہے بچے کی سلامتی کو بھی خطرے میں ڈال دے۔

ایک ماہر لکھتے ہیں :

ممكن ہے کہ بعض وائرس (VIRUS) اور مائیکروب (MICROBE) یاں بیوی سے گزر کر رحم مادر میں موجود اپنا دفاع نہ کر سکنے والے بچے پر حملہ آور ہو جائیں اور اسے بھی اسی بیماری میں مبتلا کر دیں۔

۱۵ بیورانی پیش از تولد ص ۱۵

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :

ماں کی غذائی کیفیت میں تبدیلی اور جو دوا وہ استعمال کرتی ہے نیز جن بیماریوں سے وہ دوچار ہوتی ہے یہ سب جنین پر اثر انداز ہوتی ہیں..... ابتدائی دنوں میں رحم اور میں بچے میں پیدا ہونے والی چھوٹی سی خرابی بڑے ہوتے ہوئے بہت زیادہ اثرات مرتب کرتی ہے اسی بنیاد پر دورانِ حمل اپنی صحت کی حفاظت کے سلسلے میں خواتین پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے یہاں تک کہ ان کے حمل ٹھہرنے کی صلاحیت کے ضائع ہونے کا احتمال ہے لہ

وہ یہ بھی لکھتے ہیں :

بہت سے غیر غذائی مواد بھی ایسے ہیں کہ جو ماں باپ سے گزر کر بچے پر اس طرح سے اثر انداز ہو سکتے ہیں کہ اُن کی نشوونما پر منفی اثر ڈالیں۔ زیادہ تر دوائیاں جو عموماً استعمال کی جاتی ہیں وہ بائیں افراد کی تندرستی کے لیے بنی ہوتی ہیں یعنی ان کا تجربہ پورے (کامل) انسان پر کیا جاتا ہے۔ وائرس، بیکٹیریا اور تمام جراثیم کہ جو ماں کے بدن میں ہوتے ہیں بعض اوقات بچے کو بھی اس بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں یا بعض اوقات بچے کی نشوونما کو خراب کر دیتے ہیں اور بچہ غیر معمولی طور پر بڑا ہونے لگتا ہے لہ

لہ پروگرامی پیش از تولد ص ۴۲

لہ پروگرامی پیش از تولد ص ۱۸۳

ماں کی نفسیاتی کیفیت کا جنین پر اثر

ماہرین کے درمیان یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ کیا ماں کی نفسیاتی کیفیات جنین کی روح پر اثر انداز ہوتی ہیں یا کر نہیں؟

بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ماں اگر شدید خوف اور اضطراب سے دوچار ہو تو رحم مادر میں موجود بچے پر بھی اس کا اثر ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ بھی ڈر لوک بن جائے اور اسی طرح ماں کا حسد اور کینہ بھی جنین کی روح پر اثر ڈالتا ہے اور ممکن ہے یہ دو صفیں اُس کی طرف منتقل ہو جائیں۔ اس کے برعکس خوش خلقی، انسان دوستی، ایمان، شجاعت اور مہر و محبت کہ جو ماں میں موجود ہو وہ بچے کی نفسیات اور اعصاب پر بھی اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ یہ ماہرین کہتے ہیں کہ ماں کے پیٹ میں بچہ ماں کا ایک حقیقی عضو ہوتا ہے لہذا جیسے ماں کی نفسیاتی کیفیات اور انکار اس کے اپنے جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح سے بچے پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ البتہ بعض جنین شناس اور بچے کی نفسیات کے ماہرین نے اس بات کو رد کر دیا ہے اور اس امر کے غلط ہونے کو ثابت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ دورانِ حمل ماں کے انکار اور اس کی نفسیاتی کیفیت ممکن نہیں ہے کہ مستقیماً بچے کے اعصاب اور نظریات پر اثر انداز ہو۔

ڈاکٹر جہلی لکھتے ہیں :

ماں اور جنین کے درمیان مستقیم ربط نہیں ہے۔ بلکہ ماں اور بچے کے درمیان رابطہ ناف کے ذریعے سے ہے اور اس ناف میں کوئی اعصاب نہیں ہیں کہ جو سلسلہ اعصاب کو ہدایت کرے بلکہ بند ناف میں خون کی رگیں ہوتی ہیں لہذا

جیسا کہ گزشتہ لوگوں کا خیال رہا ہے کہ اعصاب اور بیجانی کیفیت بچے پر
اثر انداز ہوتی ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔

البتہ حتیٰ اس دانشور کے ساتھ ہے اور یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ حاملہ عورت کے افکار اور
نفسیاتی کیفیات بلا واسطہ بچے کی روح اور اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ البتہ یہ بات بھی درست
نہیں کہ کوئی یہ کہے کہ ماں کے افکار اور جذبات بچے پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ واسطہ طور پر
بچے کے اخلاق اور نظریات پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل
تین نکات کی طرف توجہ فرمائیں۔

۱۔ انسان کی روح اور جسم ایک دوسرے سے مربوط اور وابستہ ہے۔ انسانی جسم کی بیماری
اور صحت، اور اعصاب اور جسمانی قوی کی قوت اور کمزوری یہاں تک کہ بھوک اور سیری
انسان کے طرز تفکر اور اس کے اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے انسان کی اخلاقی شخصیت
اس کے خاص مزاج اور اس کے اعصاب اور مغز کی تعمیر کے انداز سے کسی حد تک وابستہ
ہے۔ روح سالم بدن سالم میں ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ غذا کی کمی یا فقدان اعصاب
اور مغز کو برے اخلاق اور بیجانی کیفیت کے ظہور پر ابھارے۔

۲۔ جنین اسی غذا سے استفادہ کرتا ہے کہ جو ماں کے اندر دنی نظام میں تیار ہو کر اس تک
پہنچتی ہے۔ بچہ جب تک رحم مادر میں زندگی گزارتا ہے غذا کے اعتبار سے ماں کے
تایاں ہوتا ہے ماں کی غذا کی کیفیت بچے کی جسمانی اور نفسیاتی پرورش پر بھی اثر انداز
ہوتی ہے۔

ڈاکٹر جدلی لکھتے ہیں :

جو چیز بھی ماں کی سلامتی کے لیے مؤثر ہے وہی جنین کی سلامتی کے لیے مؤثر ہے
اگر ماں کی غذا میں کیشیم کی کمی ہوگی تو یہ کمی بچے کی ہڈیوں اور دانتوں کی تعمیر پر
اثر انداز ہوگی۔

۱۵ روان شناسی کودک ص ۱۵۵

۱۶ روان شناسی کودک ص ۲۲۲

۴۔ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کا شدید اضطراب اور ہیجان اس کے سارے بدن بشمول اس کے نظام ہضم کے اثر انداز ہوتا ہے۔ رنج و غم کی زیادتی یا خوف کی شدت کھانے کی طلب کو کم کر دیتی ہے اور غذا صحیح طور پر ہضم نہیں ہوتی۔ نظام ہضم خراب ہو جاتا ہے، نظم اعصاب بگڑ جاتا ہے اور غدد و دل کے معین اور طبعی نظام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

ان تین مقدمات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ماں کے انکار اور روحانی کیفیات اگر مستقیماً بچے کے اعصاب اور مغز کی طرف منتقل نہیں ہوتیں تاہم ان امور کا تعلق ماں کے نظام ہضم سے ہے اور بچے کی خوراک کا تعلق ماں ہی کے نظام ہضم اور غذائی کیفیت سے ہے اور کیفیت بچے کی روح اور مستقبل کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے اس لحاظ سے یہ قطعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ماں کی نفسیاتی کیفیات اور انکار بدولن شک بچے کی روح نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی تعمیر شخصیت میں مؤثر ہیں۔

ماں کا شدید غصہ یا اضطراب یا شدید خوف اس کے عموماً مزاج اور نظام ہضم کو درگزر کر دیتا ہے اس کے اعصاب اس کے باعث خلل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ غیر معمولی کیفیت جیسے ماں کے جسم و جان کے لیے باعث ضرر ہے اسی طرح اس کے رحم میں موجود بچے کی غذائی کیفیت کے لیے خرابی کا سبب ہے۔

مکن ہے اس صورت میں بچے کے اعصاب اور مغز ایک ایسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو جائیں کہ جو بعد میں ظاہر ہو۔

ڈاکٹر جلدی لکھتے ہیں :

ماں کو پیش آنے والے شدید ہیجانی کیفیات اور ناراحتی کو دینے والے امور مسلماً بچے کے مزاج اور رشد کے لیے باعث ضرر ہیں۔ چونکہ اس طرح کی کیفیات نظام کو خراب کر دیتی ہیں اور غیر طبعی غدد پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے باعث نظام ہضم اپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا۔ شاید یہی ایک وجہ ہو کہ بچہ جو اعصاب رکھتا ہے اور بہت سی نفسیاتی بیماریاں اس میں پیدا ہو سکتی ہیں انہی ہیجانی

کیفیات کی وجہ سے ممکن ہے ایام حمل ہی میں بچہ ضائع ہو جائے۔
ایک حاملہ خاتون کہ جو جسم اور روح کے اعتبار سے بالکل سکون میں ہو۔ خوش و خرم، با ایمان
ہو، انسان دوست ہو، مہر و محبت سے بسر کرنے والی ہو، سالم جسم اور پاک روح کی حامل ہو تو اس
کے رحم میں زندگی گزارنے والا بچہ بھی جسم و جان کے اعتبار سے پُر سکون ہوگا۔ ایسا پُر امن اور
سالم ماحول بچے کی پرورش، جسمانی نشو و نما اور روحانی شخصیت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوگا۔ اس
کے برعکس ایک بے ایمان، حاسد، کینہ پرور، غیصی، ڈپلک، پریشان حال اور نفسیاتی مریض
ماں بچے کے نظام غذا کو تباہ کر دے گی، اس کی روحانی آرام کو ختم کر دے گی، اس کے
لیے بُرے اخلاق اور نفسیاتی میلروں کے لیے فضا سازگار بنادے گی۔

اس ضمن میں

”ماہرین نفسیات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نفسیاتی امراض میں مبتلا ۶ فیصد
بچے یہ بیماری ماں سے ولادت میں پاتے ہیں چنانچہ اگر ایک ماں صبح و سالم
ہو تو اس کا بچہ بھی ایک صبح و سالم نظام اعصاب کا حامل ہوگا۔ اگر کوئی عورت چلے
کہ اس کا بچہ صبح و سالم، شاداب اور عقلی قوتوں کے اعتبار سے بے نقص ہو تو
اُسے چاہیے کہ بچے کی ولادت سے پہلے اپنی سلامتی کے بارے میں فکر کرے۔
”ماحول کے عوامل بچے کے جسمانی اور نفسیاتی رشد و تکامل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔“

۱۔ رواں شناسی کو دک ۲۲۲

۲۔ اطلاعات، شمارہ ۱۰۳۵۵، کو دک ج ۱ ص ۱۱۹

۳۔ بیوگرافی پریش از تولد ص ۱۲۵

حاملہ خواتین کو ایک نصیحت

حاملہ خواتین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ بھاری چیزوں کے اٹھانے، زیادہ سخت کام کرنے اور تھکا دینے والے امور سے اجتناب کریں۔ کیوں کہ ماں کے لیے تھکا دینے والے امور بچے کے امن و آرام کو بھی درہم برہم کر دیتے ہیں اور اس کے لیے بھی نارضی کا سامان بنتے ہیں یہاں تک کہ ممکن ہے ایسے کاموں کی وجہ سے حمل ساقط ہو جائے۔

حمل کے آخری مہینوں میں عورت کے لیے سفر ضرور دیرساں ہوتا ہے۔ اگر اہم مسئلہ نہ ہو تو بہتر ہے کہ سفر ترک کر دیا جائے۔ البتہ ہلکے پھلکے افعال اور چھوٹی موٹی فعالیت نہ صرف یہ کہ باعث ضرر نہیں ہے بلکہ ماں اور بچے ہر دو کی صحت و سلامتی کے لئے مفید ہے۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں:

ماں کی زیادہ خستگی خون میں زہریلے مواد کا موجب بنتی ہے اور چونکہ یہی خون جنین کی غذا بھی بنتا ہے لہذا بچے کی نشو و نما پر اثر انداز ہوتا ہے لہ

صاف ستھری فضا

رحم مادر میں نشو و نما پانے والا بچہ آکسیجن کا احتیاج مند ہوتا ہے۔ البتہ جنین خود سانس نہیں لیتا اور بلا واسطہ کھلی ہوا سے استفادہ نہیں کرتا بلکہ اس آکسیجن سے استفادہ کرتا ہے کہ جو ماں کے تنفس کے ذریعے سے مہیا ہوتی ہے۔ ماں نہ صرف اپنے بدن کی ضرورت کے مطابق آکسیجن فراہم کرتی ہے بلکہ جنین کی ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے۔ اگر ماں صاف ستھری اور اچھی ہوا میں سانس لے گی تو اپنی سلامتی کی بھی حفاظت کرے گی اور بچے کی بھی سلامتی اور پرورش کے لیے مددگار ثابت ہوگی۔

لیکن اگر وہ گندی اور زہریلی ہوا میں سانس لے گی تو اپنی اور بچے دونوں کی صحت کو نقصان پہنچائے گی۔ لہذا حاملہ خواتین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ کوشش کریں کہ صاف ستھری ہوا سے استفادہ کریں۔ صاف فضا میں جلدیں اور گہرا سانس لیں۔ اسی طرح تھکا دینے والی شب بیداری سے بھی سختی سے اجتناب کریں۔

انہیں یہ بھی چاہیے کہ تبا کو نوشی سے بچیں۔ اور مسموم فضا میں سانس لینے سے اجتناب کریں۔ سوتے ہوئے ٹمرے کی کھڑکی کھلی رکھیں تاکہ تازہ ہوا داخل ہو سکے کیونکہ آکسیجن کی کمی ممکن ہے بچے پر ناقابل تلافی منفی اثر ڈالے۔

ڈاکٹر جلالی کا وہ پیرا ہم پھر آپ کی توجہ کے لیے نقل کرتے ہیں جو قبل ازیں آپ کی نظروں سے کبھی گزر چکا ہے۔

جسم کے بہت سے نقائص مثلاً ہونٹوں کی خرابی، پاؤں کے ٹوے کا سیدھا ہونا، یہاں تک کہ آنکھوں کا بہت پھوٹا ہونا کہ جنہیں پہلے موروثی سمجھا جاتا ہے آج کل ماحول بالخصوص دوران حمل آکسیجن کی کمی جیسے عوامل کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔

استقاطِ حمل

اسلام کے نقطہ نظر سے عورت اور مرد کی باہمی رضامندی سے حمل ٹھہرنے کو روکنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر میوی اور شومہ اولاد کی خواہش نہ رکھتے ہوں تو پھر وہ بے ضرر گولیوں، ٹیکوں یا انزال وغیرہ کے ذریعے حمل ٹھہرنے کو روک سکتے ہیں۔ البتہ بچے کی پیدائش کو روکنا اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کی خواہش ہے کہ مسلمانوں کی نسل جتنی بھی ہو سکے چھوٹے بچے لیکن بہر حال ایسا کرنا حرام نہیں ہے لیکن جب نر اور مادہ سیل ترکیب پاکر عورت کے رحم میں ٹھہرائیں اور ایک زندہ موجود وجود میں آجائے تو وہ اسلام کی نظر میں محترم ہے اور زندگی کا حق رکھتا ہے۔ وہ نیا موجود اگرچہ بہت چھوٹا ہی کیوں نہ ہو صلاحیت کے اعتبار سے انسان ہے۔ وہ ایسا موجود زندہ ہے کہ بڑی تیزی کے ساتھ اور حتمی طور پر غیر معمولی طریقے سے کمالاتِ انسانی کی طرف رواں دواں ہے۔ وہ ننھا منسا موجود جو کہ اتنی غیر معمولی استعداد رکھتا ہے اپنی مہربان ماں سے امید رکھتا ہے کہ وہ اس کے لیے پرامن ماحول فراہم کرے گی تاکہ وہ پرورش پاکر ایک کامل انسان بن سکے۔ اگر اس بالیاقیت اور باشرط وجود کو تو نے ساقط کر دیا اور اسے قتل کر دیا تو تم قاتل قرار پاؤ گی اور اس بُرے عمل کے ارتکاب کی وجہ سے قیامت کے دن تمہاری باز پرس کی جائے گی۔

دینِ مقدس اسلام کہ جو تمام لوگوں کے حقوق کا نگہبان ہے اس نے استقاطِ حمل اور اولاد کشی کو کلی طور پر حرام قرار دیا ہے۔ اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے حضرت موسیٰ ابن جعفرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ عورت جو حاملہ ہونے سے ڈرتی ہے کیا آپ اُسے اجازت دیتے ہیں کہ

وہ دوا کے ذریعے حل گرا دے۔ آپؐ نے فرمایا :

ہیں، میں ہرگز اس چیز کی اجازت نہیں دیتا۔

راوی نے پھر کہا: ابتداء دورِ حمل کہ جب ابھی نطفہ ہوتا ہے، اس وقت کے لیے کیا حکم ہے؟

فرمایا:

انسان کی خلقت کا آغاز اُسی نطفے سے ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

رَّادَّاۤ اِلَیْہِمْ وَاٰۤیٰتُہٗ لَا تَسْلٰوْنَ ؕ بِاٰیٰتِیْ ذٰلِکَ مُتَبٰرٰکٌ ۝

یعنی۔ قیامت کے دن ماں باپ سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کس جرم

میں اپنے بے گناہ بچے کو مار ڈالا؟ (تحریر۔ ۸۰)

استقاطِ حمل نہایت بُرا عمل ہے کہ جس سے اسلام نے روکا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کام ماں

کے جسم و جان کے لیے بھی باعثِ ضرر ہے۔ ڈاکٹر پاک نثر ادب نے استقاطِ حمل کے بارے میں منعقد

ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

..... یہ ثابت ہوا ہے کہ استقاطِ حمل اوسط عمر میں کمی کر دیتا ہے نیز

سائنسی تحقیق کے مطابق استقاطِ حمل عورتوں کے نفسیاتی اعتدال (BALANCE)

کو تباہ کر دیتا ہے۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے نیویارک کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۹.۱ عورتوں

کی وفات استقاطِ حمل کی وجہ سے ہوئی دس سال کے دوران میں اس تعداد میں ۲۶.۱٪ کا

اضافہ ہوا۔ جہلی میں ۱۹۲۳ء کے ریکارڈ کے مطابق ۳۹٪ عورتوں کا انتقال استقاطِ حمل کی

وجہ سے ہوا۔

استقاط حمل کا ایک بہانہ فقر و تنگ دستی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ بعض نادان ماں باپ فقرو غریب کے بہانے سے اپنے بے گناہ بچوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فقر و تنگ دستی ایک بڑی مصیبت ہے اور بہت سارے خاندان اس میں مبتلا ہیں اور اسے برداشت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن اسلام اسے بچہ ضائع کرنے کا عذر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آخر بے گناہ بچے کا کیا قصور ہے کہ ماں باپ اسے ہی حیات سے محروم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَلَوْ تَقَشَّرْنَا الْأَوْلَادَ كُلَّ نَفْسٍ لَأَمْلَأْنَا مِنْكُمْ خُشْيَةً إِنَّمَا نَزَّلْنَاهُم مَّا رَأَيْنَا كُفْرًا
اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطَاً كَبِيراً۔

اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو ہم میں کو جو تمہیں اور انہیں روزی دیتے ہیں۔ اولاد کو قتل کرنا یقیناً ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ بنی اسرائیل آیہ ۳۱

اب جب کہ ایک انسان کا لطف ٹھہر چکا ہے ماں باپ کو چاہیے کہ سختی کو برداشت کریں مگر ہر بچہ ہی بچہ کل ایک ممتاز اور عظیم شخصیت بن جائے گا ماں باپ اور معاشروہ جس کے وجود سے استفادہ کریں۔ لیکن ہے اسی بچے کے وجود کی برکت سے خاندان کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہو جائے یا اس کے خیر سے فقر و تنگ دستی سے نجات مل جائے۔

اس کے علاوہ بھی کئی پہانے پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً گھر سے باہر کی مشغولیات، دفتر کی مصروفیات یا بچوں کی کثرت وغیرہ لیکن یہ ایسے عذر نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے شرمیت یا عقل اس بڑے عمل کو جائز قرار دے دے۔

استقاط حمل نہ یہ کہ اسلام کی نظر میں ایک بڑا اور حرام عمل ہے بلکہ اس بڑے گناہ کے لیے کفار بھی مقرر کیا گیا ہے کہ جو جنین کی عمر کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر ساقط شدہ بچہ لطف ہوا تو اس کا خون بہا سونے کے بیس دینار ہے، اگر علقہ اور لو قحڑا ہو تو سونے کے چالیس دینار، اگر مضغہ اور گوشت کی حد تک پہنچ چکا ہو تو سونے کے ساٹھ دینار، اگر اس میں ہڈی گئی ہو تو سونے کے اسی دینار

اگر وہ انسان کی صورت اختیار کر چکا ہو تو سونے کے سودینار دادا اگر اس میں
روح بھی پیدا ہو چکی ہو تو اس کی دیت ایک کامل انسان کی دیت ہوگی یہ
خاتم افسر الملوک عالمی نے اس بارے میں ایک خوبصورت نظم کہی ہے :

بغفت مادر مں را اگر بہ بینی

بگو مادر خطا از من چه دیدی

کہ بی جرم مں بہ خونم در کشیدی

دروغست کودکی آرام بودم

کجا محکوم بر اعدام بودم؟

مخونم چنگ و دندان تیز کردی

ز خون دامان خود، لبریز کردی

بدم تازه رسیدہ میمانت

نہ آسیبی رسید از من بجانت

بہ مہمان بایدت مہمان نوازی

نہ بیرحانہ اش نہ لبود سازی!

تو فکر خراج و برجم را نمودی

ز جسم کو چکی جان در ربلودی

مرا روزی بہرہ بود مادر

ولی افسوس نمودی تو باور!

تو گردش را بہ من تزجج دادی

اس ظلم در عالم نہادای!

امید کودکان بر ما باشد
 چو مادر باشدش آرام باشد
 امیدم بود رویت را ببینم
 گلی از گلشن حنث بچینم
 دلم میخواست پستان زخم چنگ
 غمت بیرون نمایم از دل تنگ
 دلم میخواست از شیرت بنوشم
 صدای مادرم آید بگو ششم !
 امیدم بود بخدمت ببینم
 کنار تخت خوابم خوش نشینی
 امیدم بدوستانم فرستی
 دهی تعلیم، درس حق پرستی
 بیایم از درو شادت نمایم
 سرود کودکان بهرت سرایم
 امیدم بود گروم من بخواه
 زمان پریت قدم بدانی
 زمان پریت غم نوار باشم
 بهر کاری برایت یاد باشم
 من اینک روح پاکم در جهان است
 مکانم در حمار حوریان است !
 کنون کن توبه، استغفار شاید
 خدای مهربان رحمت نماید
 تمنا دارد افسر از توانی

پیامِ راہِ مادرِ حارِ سانی لہ

نظم کا ترجمہ،

بھوٹا سا سق شدہ بچہ میرے خواب میں آیا اور بولا میری ماں کو دیکھ تو اس سے کہو!
 اتنی! تو نے میری کیا خطا دیکھی تھی کہ بے جرم ہی تو نے میرا خون بہا دیا۔
 میں تو بچپن میں آرام سے رہتا تھا میرے قتل کا حکم کیسے سرزد ہو گیا۔
 میرے خون پر تو نے اپنے پنجے اور دانت تیز کئے۔ اور اپنے دامن کو میرے خون سے
 آلودہ کر لیا۔

میں ابھی تیرے پاس تازہ مہمان آیا تھا اور مجھ سے ابھی آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔
 چاہیے کہ آنے والے مہمان کی مہمان نوازی کی جلے نہ کرے بلکہ رحمی سے اس کا کام تمام
 کر دیا جائے۔

تجھے میرے بارے میں خرچ کی فکر میں تھی لہذا تو نے میرے ننھے سے جسم سے جان نکال دی۔
 ماں! میں تو اپنی روزی ساتھ لے کر آیا تھا لیکن افسوس کہ تجھے اس کا یقین نہ آیا۔
 تو نے گھومنے پھرنے کو مجھ پر ترجیح دی اور دنیا میں ظلم کی بنیاد ڈالی۔
 بچوں کی امید تو ماں ہی ہوتی ہے اور جب ماں کے پاس ہو تو وہ سکھ چین سے ہوتے ہی۔
 مجھے تنہا تھی کہ میں تیرے چہرے کو دیکھوں اور میں بھی تیرے گلشنِ حسن سے ایک
 پھول چٹوں۔

میرا دل چاہتا تھا کہ میں تیرے پستان سے دودھ پیوں اور یوں تیرے دل کا غم دور کر دوں۔
 میری آرزو تھی کہ تیرا دودھ پیوں اور تیری آواز میرے کانوں میں پڑے۔
 میرا خیال تھا کہ جب تو میری مسکراہٹ کو دیکھے گی تو میرے بستر کے پاس خوش خوش بیٹھے گی۔
 آرزو تھی کہ تو مجھے مدرسہ بھیجتی، مجھے تعلیم دیتی اور حق پرستی کا درس پڑھاتی۔
 میں گھراتا اور تجھے خوش کرتا اور بچوں والے گیت تجھے سناتا۔

خیال تھا کہ جب میں جوان ہو جاؤں گا تو پھر تجھے اپنے بڑھاپے میں میری قدر معلوم ہوتی۔
 تیرے بڑھاپے میں میں تیرا غم خواہ تو نا اور ہر کام میں تیرا مددگار بننا۔
 میں کہ ایک پاک روح بن کر اب جنت میں ہوں اور میرا مقام یہاں حوروں کے جوار میں ہے
 اب تو توبہ اور استغفار کر کہ شاید خدائے مہربان اپنی رحمت کرے۔
 اے افسر میری تجھ سے یہ تفسا ہے کہ تو میرا یہ پیغام تمام ماؤں تک پہنچا دے۔

پیدائش کی مشکلات

بچہ عموماً رحم مادر میں نو ماہ اور دس دن رہتا ہے۔ ولادت سے پہلے کی زندگی نہایت حساس اور پرخطر ہوتی ہے کیوں کہ بچے کا مستقبل اسی سے وابستہ ہوتا ہے۔ بچہ اس مرحلے میں ایسے محیط میں زندگی گزارتا ہے کہ جس کا نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا اور وہ دیوں قسم کے جہانی اور روحانی خطروں میں گھرا ہوتا ہے اور خود انہیں دور کرنے کی اس میں طاقت نہیں ہوتی۔ جب اس مرحلے سے جان سالم لے کر آجائے اور نو ماہ کی خطرناک مسافت کو تمام کر بیٹھے تو اب ناچار ہے کہ ایک اور دشوار مرحلے کا آغاز کرے اور یہ مرحلہ پیدائش کا ہے۔ بچے کی پیدائش کا مرحلہ ایسا سادہ اور معمولی سا نہیں بلکہ نہایت دشوار اور حساس ہے۔

بچہ نو ماہ میں اتنا بڑا ہوجاتا ہے، خاص طور پر دیگر اعضاء کی نسبت اس کا سر بڑا ہوجاتا ہے کہ اب اسے ناچار ایک نئے سخت مرحلے سے گزرنا ہی ہوتا ہے اس تنگ مقام کو دل سے باہر آنا انسان کی پوری زندگی میں انجام پانے والے کسی بھی سفر سے خطرناک تر ہے۔ ممکن ہے بچہ پس جائے یا اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ جائے ممکن ہے اس کی نازک اور ظریف ہڈیاں کہ جو ابھی باہم بھی طرح ٹکی نہیں ہوتیں ان پر دباؤ پڑ جائے جس سے بچے کے اعصاب اور منہ کو نقصان پہنچے۔ ایک ماہر لکھتے ہیں :

پیدائش کا مرحلہ ممکن ہے کہ بچے میں دائمی مسکین غیر مرئی قسم کے نفسیاتی نقائص پیدا ہونے کا سبب بنے۔ نفسیاتی بیماریوں کے معالین کے نزدیک پیدائش کے عمل کو انسان کی پوری زندگی کی ماہیت کے لیے ایک مؤثر عامل شمار ہوتا ہے ان ماہرین

کی نظر میں پیدائش ایک انقلابی تبدیلی کا نام ہے کہ جو بچے کے ماحول اور زندگی میں پیدا ہوتی ہے اور اچانک وہ خاص قسم کی آسودگی اور آرام جو جنین کی زندگی میں اسے حاصل ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی نظر میں پیدائش کے موقع پر خوف اور اضطراب انسان کی نفسیات کا حصہ بن جاتا ہے اور انسان کی آئندہ زندگی ہمیشہ نامعلوم یا دونوں کے کنارے کے تحت گزرتی ہے۔ زندگی کا ایک پر آرام دور جنین کا اور پھر متعلق زندگی کی طرف نہایت مشکل علم میں درود ہے

ڈاکٹر مہلائی لکھتے ہیں :

جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو عموماً چند گھنٹے وہ ایک دباؤ کے تحت رہتا ہے اور سب سے زیادہ مشکل سے اسی کا سر در چار ہوتا ہے کہ جو اس کے بدن کے تمام تراخاؤں سے سب سے بڑا ہوتا ہے اگر پیدائش غیر معمولی طریقے سے ہو تو دنیا میں آنے کے مرحلے اور بھی سخت تر ہو جاتے ہیں اور بچہ عام حالات کی شکست برداشت کرنے کے علاوہ میکانیاتی آلات کی مصیبت بھی برداشت کرتا ہے اور زیادہ تر بچوں کا ضائع ہو جانا یا پیدائش کے تھوڑی ہی مدت بعد ان کا مر جانا ایسی ہی مصیبتوں اور مشکلوں کے باعث ہوتا ہے فالج اور دیوانگی وغیرہ جیسے بدنی اور ذہنی تعاضلات بچوں میں دکھائی دیتے ہیں عموماً ایسی ہی مصیبتوں کا باعث ہوتے ہیں جو دنیا میں آنے وقت ان پر وار رہتی ہیں۔

بنابریں پیدائش کا مرحلہ ایک معمولی اور خیر اہم مرحلہ نہیں بلکہ ایک دشوار اور قابل توجہ عمل ہے کیونکہ زچہ اور بچہ کی سلامتی اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ تھوڑی سے غفلت یا سہل انگاری مالن یا بچے کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے اس مرحلے میں ان کی جان چلی جائے لیکن آج کل کی حالت میں جب مراکز پیدائش، ڈاکٹر اور دوا زیادہ تر لوگوں کی دسترس

میں ہے تو احتمالی خطرات سے بچا جاسکتا ہے۔

لہذا حاملہ خواتین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ اگر وہ ڈاکٹر یا مرکز پیدائش تک دسترس رکھتی ہیں تو وقت سے پہلے ان کی طرف رجوع کریں۔ اور بچے کی پیدائش کے وقت کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور جب ضروری ہو تو فوراً مرکز پیدائش کی طرف رجوع کریں چونکہ یہ مراکز گھر سے ہر لحاظ سے بہتر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اولگ تو ہال ڈاکٹر، دوا اور نرس موجود ہیں اور ضروری موقع پر وہ زچہ کی فوری مدد کر سکتے ہیں اور اگر پیدائش میں کوئی غیر معمولی مسئلہ پیش آجائے تو ہر لحاظ سے وسائل موجود ہوتے ہیں اور جلد ہی سے اس کی مدد کی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھر میں ہوں اور پیدائش میں کوئی غیر معمولی مسئلہ پیش آجائے تو اسے ڈاکٹر یا مرکز پیدائش تک لے جانے میں ممکن ہے کہ زچہ اور بچہ کی جان خطرے میں پڑ جائے۔

دوسرا یہ کہ مرکز پیدائش کے کمرے صحت و سلامتی کے نقطہ نظر سے گھر کے کمرے سے بہتر ہوتے ہیں اور عورت وہاں زیادہ آرام کر سکتی ہے۔

تیسرا یہ کہ وہاں پر رشتے داروں اور ہمسایہ عورتوں کا پیدائشی عمل میں دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی مختلف قسم کی آراء ہوتی ہیں جب کہ ان کی وکالت عموماً علم و آگہی کی بنیاد پر نہیں ہوتی لہذا ضرر رساں ہو سکتی ہے۔

مرد کی بھی اس ضمن میں بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔ شرعاً اور عقلاً اس کا فریضہ ہے کہ ان حساس اور خطرناک لمحات میں اپنی بیوی کی مدد کرے اور احتمالی خطرات سے اسے اور بچے کو بچانے کی کوشش کرے۔ اگر اس کی غفلت یا سستی کی وجہ سے بیوی یا بچہ تلف ہو جائے یا پھر انہیں جسمانی یا روحانی لحاظ سے نقصان پہنچے تو ایسا بے انصاف شرم و شریعت اور ضمیر کی عدالت میں مجرم قرار پائے گا اور روز قیامت اس سے باز پرس کی جائے گی۔ علاوہ ازیں اس جہان میں بھی وہ اپنے کام کا نتیجہ جگتے گا اور اگر آج سہل انگاری یا کنجوسی یا کسی اور بہانے سے بیچاری بیوی کی مدد نہیں کرے گا تو بعد میں مجبور ہو گا کہ اس کے مقابلے میں سونگا خرچ کرے لیکن پھر بھی زندگی کا پہلا سکون واپس نہیں لایا جاسکے گا البتہ اگر ڈاکٹر اور پیدائش گاہ تک رسائی نہ ہو تو پھر گھر میں ہی یہ کام ان دایلوں کے ذریعے انجام پانا چاہیے کہ جو اس کام میں مہارت رکھتی ہیں۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل ہدایات کی طرٹ توجہ کرنی چاہیے۔

۱۔ پیدائش کے کمرے کا درجہ حرارت معتدل اور طبعی ہونا چاہیے اور سرد نہیں ہونا چاہیے کیونکہ زبردست دباؤ، درد اور کئی گھنٹوں کی زحمت کی وجہ سے عورت کی طبیعت عام حالات سے مختلف ہو جاتی ہے اسے پسینے آتے ہیں اور پیچھے کے لیے بھی ٹھنڈ لگنے اور بیماری کا خطرہ ہوتا ہے، جب بچے کی پیدائش کا دشوار گزار مرحلہ گزر جائے تو اگر کمرے کی ہوا کا درجہ حرارت سرد ہو تو احتمال قوی ہے کہ زچہ کو ٹھنڈ لگ جائے اور اس کی وجہ سے کئی بیماریاں پیدا ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ٹھنڈی ہوا نومولود کے لیے بھی نہایت خطرناک ہے کیونکہ پھر رحم مادر میں طبعی حرارت کے ماحول میں رہا ہوتا ہے کہ جس کا درجہ حرارت تقریباً ۳۶.۵ سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ دنیا میں آتا ہے تو کمرے کا درجہ حرارت ہوتا اتنا نہیں ہوتا اس وجہ سے نومولود کو جو بہت ناتوان ہوتا ہے اور اس میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ اپنے بدن کے لیے درکار حرارت اور توانائی میا کر سکے، اُسے ٹھنڈ لگ جانے کا اور بیماری میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور ان نومولود گان کا معالجہ بھی نہایت مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح بیمار ہونے والے زیادہ تر بچے مر جاتے ہیں۔

۲۔ محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ کمرے کی ہوا مٹی کے تیل یا کونے کے جلنے کی وجہ سے دھوئیں سے مسموم اور آلودہ نہ ہو جائے کیونکہ ایسی مسموم ہوا میں سانس لینا زچہ اور بچہ ہر دو کے لئے ضرر رساں ہے۔

۳۔ بہتر ہے کہ پیدائش کے کمرے میں حتی المقدور غلوت ہو۔ غیر متعلق عورتوں کو کمرے سے باہر کر دیں کیونکہ ایسی خواتین علاوہ اس کے کہ ان کی ضرورت نہیں ہوتی وہ زچہ کے لیے ناراضی اور شرمندگی کا باعث بنتی ہیں۔ کمرے کی ہوا کو کثیف کرتی ہیں علاوہ ازیں پیدائش کے وقت زچہ کی شرم گاہ کی طرٹ دیگر عورتوں کا دیکھنا حرام ہے اور وہ اس عالم میں اپنی ستر پوشی نہیں کر سکتی۔

امام سجاد علیہ السلام نے ایک موقع پر جب کہ ایک حاملہ عورت کا وضع حمل ہونے والا تھا تو فرمایا عورتوں کو باہر نکال دیں کہ کہیں زچہ کی شرم گاہ کی طرف نہ دیکھیں لے

حاملہ عورت اگر اپنی ذمہ داری پر عمل کرے تو اسے چاہیے کہ پوری احتیاط کے ساتھ اپنے حمل کے زمانے کو اختتام تک پہنچائے اور ایک سالم اور بے عیب بچہ معاشرے کو سونپے۔ اس نے ایک بہت ہی قیمتی کام انجام دیا۔ ایک صحیح اور بے نقص انسان کو جو بدخشاہے کہ جو ہمیشہ اپنی مال کامرہون تھی رہے گا۔ اس کے علاوہ اس نے انسانی معاشرے کی بھی خدمت انجام دی ہے کہ اُسے ایک بے نقص اور قیمتی انسان عطا کیا ہے ممکن ہے اس کا وجود معاشرے کے لیے خیرات و برکات کا موجب قرار پائے اور یہ عظیم خدمت خدا کے نزدیک بھی بے اجر نہیں رہے گی۔ ایک روز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاد کی فضیلت کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے۔ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا عورتیں جہاد کی فضیلت سے محروم ہیں۔ پیغمبر نے فرمایا! نہیں عورت بھی جہاد کا ثواب حاصل کر سکتی ہے۔ جس وقت عورت حاملہ ہوتی ہے اور اس کے بعد اس کا وضع حمل ہوتا ہے اور جب بچے کو دودھ دیتی ہے یہاں تک کہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے تو اس ساری مدت میں عورت اُس مرد کی طرح ہے جو میدان کارزار میں جہاد کر رہا ہو۔ اگر اس عرصے میں عورت فوت ہو جائے تو بالکل ایک شہید کے مقام پر ہے لے

ولادت کے بعد

بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس سے وہ سانس لینا شروع کرتا ہے۔ عمل تنفس کے آغاز کے بعد وہ زندگی میں پہلی مرتبہ روتا ہے۔ بچے کا یہ رونا اس ہوا کے رد عمل کے طور پر ہوتا ہے کہ ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے۔ اگر وہ سانس نہ لے اور نہ روئے تو اسے پاؤں سے پکڑ کر اٹا کر کے اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ مارتے ہیں تاکہ وہ سانس لے پھر اس کے بند ناف کو باندھ دیتے ہیں اور نپٹے کے بدن سے ابھری ہوئی ناف کو جراثیم سے پاک کسی چیز سے کاٹ دیتے ہیں اور ناف کو بھی جراثیم سے پاک کرتے ہیں۔ اس کے بعد بچے کو صابن کے ساتھ نیم گرم پانی سے نہلا کر لباس پہنا دیتے ہیں۔ کچھ دیر تک بچے کو غذا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر نیم گرم پانی میں چینی ملا کر اس کے منہ میں میں قطرہ قطرہ ڈالتے ہیں۔

بچہ عموماً حالت خواب میں رہتا ہے۔ اسے استراحت کی بہت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس کی زندگی کی داخلی و خارجی حالت بالکل تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ پہلے وہ ماں کی غذا ہی سے استفادہ کرتا تھا لیکن اب اس کا اپنا نظام ہضم کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے بچہ اس آکسیجن سے استفادہ کرتا تھا جو ماں کے تنفس سے حاصل ہوتی تھی لیکن اب اس کا اپنا نظام تنفس کام کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس کا اپنا نظام اس کے لیے آکسیجن حاصل کرتا ہے اور بدن کے لیے نقصان دہ ہوا خارج کرتا ہے۔ اس کی داخلی کیفیت میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہوتی ہے۔ نیز اس کی خارجی حالت اور ماحول بھی بدل چکا ہوتا ہے۔

پہلے وہ رحم ماحول میں تھا جہاں درجہ حرارت ۲۷.۵ درجے سنٹی گریڈ تھا لیکن اب وہ اس ماحول میں ہوتا ہے کہ جس کا درجہ حرارت مستقل نہیں ہے پیدائش کے وقت بھی اس کے جسم و روح پر مختلف قسم کا دباؤ پڑتا ہے جس کی تلافی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس عالم میں بچہ ایک ایسے بیمار کے مانند ہوتا ہے جو عمل جراحی کے بعد ابھی ابھی آپریشن تھیر سے باہر آیا ہو جسے ہر چیز سے بڑھ کر استراحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ سانپے میں ڈھل کے نکلی ہوئی نئی نئی ایسی مشینری ہے کہ جس کی دیکھ بھال اور خصوصی توجہ ضروری ہے۔ اس لحاظ سے بچے کے لیے بہترین کام انجام دیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے لیے آرام دہ ماحول فراہم کیا جائے تاکہ وہ آرام کر سکے۔ جس سخت عمل سے گزرا ہے اس کی تلافی کر سکے اور اپنی زندگی کو نئے حالات کے مطابق ڈھال سکے۔

ڈاکٹر جلالی کہتے ہیں۔

بچے کو ہنسانا، اسے مستقل چومتے رہنا اور ہر وقت اسے اٹھا کر دوسروں کو دکھانا اور اس کے کپڑے تبدیل کرتے رہنا تاکہ وہ خوبصورت دکھائی دے یہ سب ایسے نامطلوب کام ہیں کہ جن سے اجتناب کرنا چاہیے۔ بچہ کھیل کا سامان نہیں ہے اسے پھلنے پھولنے کے لیے آرام دہ ماحول کی ضرورت ہے۔ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے آرام کی داخلی حالت درہم برہم ہو جائے۔ اس کے سامنے اونچی آوازیں نہیں بولنا چاہیے۔ اسے کبھی ادبچا، کبھی نیچا نہیں کرنا چاہیے۔ اسی طرح اسے چومنا چاٹنا، اس پر دباؤ ڈالنا یہ سب چیزیں اس کے منظم رہنماؤں آرام پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

ماں کو بھی استراحت اور تقویت کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ دوران حمل نواہ کے عرصے میں اس نے بہت مشکلات اٹھائی ہوتی ہیں وہ بالکل ضعیف اور ناتواں ہو چکی ہوتی ہے۔ خاص طور پر وضع حمل کے دوران وہ جس جاگلس مرے سے گزری ہوتی ہے اور جس طرح

سے اس کا خون بہا ہوتا ہے اس کا تن بدن خستہ حال ہو چکا ہوتا ہے۔ اس کا دل میں شہر بان شومہر پر لازم ہے کہ وہ اس کے لیے مکمل آرام کے اسباب فراہم کرے اور غذا کے ذریعے سے اس کی قوت بحال کرے۔ اگر ڈاکٹر اور دوا کی ضرورت ہو تو پوری طرح سے معالجہ کرے تاکہ اس کی جسمانی ناتوانی دور ہو سکے اور کھیت سمول پر آ سکے اور پہلے کی ہی سلامتی اور شادابی پلٹ سکے تاکہ وہ اپنے سالم جسم اور شاداب روح سے پھر سے زندگی بسر کرنے لگے اور اپنے بچوں اور شومہر کی خدمت کر سکے۔ اگر شومہر نے اس امر میں کوتاہی کی تو اس کی شریک حیات رنجور اور ناتواں رہ جائے گی اور اس کا نتیجہ یہی شومہر کو خود جھکتا پڑے گا۔

مال کا دودھ بہترین غذا ہے

مال کا دودھ بچے کے لیے بہترین، کمال ترین اور مسلم ترین غذا ہے اور کئی پہلوؤں سے ہر غذا پر ترجیح رکھتا ہے۔ مثلاً

۱۔ غذائی مواد کی کیت اور کیفیت کے لحاظ سے مال کا دودھ بچے کی شیشی سے بالکل ہم آہنگ ہوتا ہے کیونکہ چھ ماہ رحم مادر میں رہا ہوتا ہے اور مال کی داخلی شیشی سے تیار شدہ غذا سے استفادہ کرنا اس کی عادت ہو چکی ہوتی ہے۔ اب وہی مواد دودھ کی صورت میں بچے کی غذا بن کے آتا ہے۔

۲۔ مال کا دودھ چونکہ طبعی طور پر اور خام حالت میں استعمال ہوتا ہے اس لیے اپنی غذائیت برقرار رکھتا ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف گائے وغیرہ کے دودھ کو ابلا جاتا ہے اور پھر استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے اس کے اندر موجود بعض غذائی مواد ضائع ہو چکا ہوتا ہے۔

۳۔ بچے کی صحت کے اعتبار سے مال کا دودھ زیادہ قابل اعتبار ہے اور خارجی جراثیم سے آلودہ نہیں ہوتا کیونکہ مال کے پستان سے سید جانچے کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے دودھ ممکن ہے مختلف برتنوں اور ہاتھوں کے جراثیم سے آلودہ ہو جائیں۔

۴۔ مال کا دودھ ہمیشہ تازہ بہ تازہ استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ کوئی دوسرا دودھ ممکن ہے۔ پڑا رہنے سے خراب ہو جائے۔

۵۔ ماں کے دودھ میں ملاوٹ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسرے دودھ میں اس کا اسکان موجود ہے۔

۶۔ ماں کا دودھ بیماریوں کے حامل جراثیم سے آلودہ نہیں ہوتا اور بچے کی صحت و سلامتی کے لیے زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ جب کہ کوئی دوسرا دودھ ممکن ہے بعض جراثیم سے آلودہ ہو جو بچے کو بھی مبتلا اور آلودہ کر دیں۔

اسہاں شیر، تپ مالت اور سل گا جیسی بیماریاں دوسرے دودھ ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان اور دیگر وجوہات کی بنا پر ماں کا دودھ بچے کے لیے یقینی طور پر بہترین اور سالم ترین غذا ہے۔ جو بچے ماں کا دودھ پنی کر پلتے ہیں وہ دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ تندرست ہوتے ہیں اور بیماریوں کے مقابلے کی زیادہ طاقت رکھتے ہیں اور ایسے بچوں میں شرح اموات بھی کمتر ہے۔

ماں اگر بچے کو دودھ دے تو ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ عمل حیض میں زیادہ تاخیر ہو جاتی ہے اور نتیجے کے طور پر دیر سے حاملہ ہوتی ہے۔
دین اسلام نے بھی ماں کے دودھ کو بچے کے لیے بہترین غذا قرار دیا ہے اور اسے بچے کا ایک فطری حق قرار دیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ما من لبن رخص به العصبی اعظم بركة علیہ من لبن ارقم۔

بچے کے لیے کوئی دودھ ماں کے دودھ سے بڑھ کر بہتر نہیں ہے۔

ماں کا دودھ اسلام کی نظر میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ ماں کی تشویق کے لئے اس کا بہت زیادہ ثواب مقرر کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فاذا اُر حنت کان لہا بكل مقتہ کعدل عتق محرر من ولد

اسماعیل فاذا فرغت من رضاعه ضرب ملک کو دیر علی جنبہا
وقال : استأنفی العمل فقد غفرلک۔

یعنی ہر عورت جو اپنے بچے کو دودھ پلانے لگی بچہ جتنی مرتبہ بھی اس کے پستان
سے دودھ پیے گا اللہ تعالیٰ ہر مرتبہ اُسے اولاد اسماعیل میں سے غلام آزاد کرنے
کا ثواب عطا کرے گا جس وقت دودھ پلانے کی مدت ختم ہوگی تو ایک مقررہ شدہ
اس کے پہلو پر ہاتھ رکھ کے کہے گا: زندگی کو نئے سرے سے شروع کر کیوں کہ
اللہ نے تیرے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں۔

میڈیکل کالیک کا ایک بین الاقوامی سپریم کوجو شیراز کی یونیورسٹی میں منعقد ہوا اس میں تمام ترمہرین
کی مشترک رائے یہ تھی کہ کوئی غذا بھی اور وٹامن کا حامل کوئی اور مواد بھی شیر مادر کی جگہ نہیں لے سکتا۔
ڈاکٹر حسین واقعی کہتی ہیں :

باعث افسوس ہے کہ بہت سی جوان مائیں مغربی ماؤں کی تقلید میں کوشش کرتی
ہیں کہ اپنے نوہالوں کو خشک دودھ اور دیگر خاص طرح کی مصنوعی غذائیں دیں
اور بچپن میں بچے کی صحیح غذائی ضروریات کے بالکل مخالف ہے جو ان مائیں یہ
جان لیں کہ کوئی مصنوعی دودھ بھی ماں کے دودھ کے برابر نہیں ہو سکتا وہ اپنے
بچے کو اس بہترین غذا سے محروم نہ رکھیں کہ جو طبعی طور پر اس کے لئے تیار
کی گئی ہے۔

ایک اور ماہر لکھتے ہیں :

شیر مادر ایک ایسی بے مثال غذا ہے کہ جو فطرت نے بچے کے لئے بنائی ہے
اور کوئی غذا بھی اُس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ لہذا حتی الامکان کوشش کی جانی چاہیے
کہ بچے کو ماں کا دودھ پلایا جائے۔ اور اگر ماں کا دودھ نہ آتا ہو تو اسے کوشش

کرنا چاہیے کہ اس بہت بڑے نقص کو مختلف اور دودھ لانے والی غذائیں کھا کر دور کر دیں۔

ذمہ دار اور آگاہہ خواتین کہ جو اپنے بچوں کی صحت و سلامتی سے دلچسپی رکھتی ہیں اپنے عزیز بچوں کی اپنے دودھ کے ذریعے سے پرورش کریں اور انہیں اس عظیم نعمت الہی سے محروم نہ رکھیں کہ جس کا نظام اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پہلے سے بنا رکھا ہے۔ سمجھاؤ خواتین ماں کی عظیم ذمہ داری سے آشنا ہوتی ہیں اور بچے کے جسم و جان پر دودھ کے اثر کو سمجھتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خوشی سے اپنے آپ کو بچے کی صحت و سلامتی کے لیے نثار کرتی ہیں اور انہیں شیر جان سے سیراب کرتی ہیں۔ ایسی ہی خواتین کو ماں کا نام دیا جاسکتا ہے نہ ان پر قوت اور خود غرضی مائل کو کہ جن کا دودھ اترتا ہو لیکن وہ طرح طرح کے بے جا بانوں سے اپنے پستان کو خشک کر لیتی ہیں اور بے گناہ بچے کو خشک دودھ سے پالتی ہیں۔ یہ خود غرضی عورتیں اتنا بھی جذبہ ایثار نہیں رکھتیں کہ عزیز بچوں کی صحت و سلامتی کی خاطر اپنے آپ کو دودھ پلانے کی زحمت دیں۔

علاوہ ازیں جو خواتین بغیر کسی ہذر کے بچے کو دودھ نہیں پلاتیں ممکن ہے کہ وہ بعض جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں۔ سرطان پستان ان خواتین میں زیادہ دیکھا گیا ہے کہ جو اپنے بچے کو دودھ نہیں پلاتیں۔

اس مقام پر ضروری ہے کہ جو مائیں بچوں کو دودھ پلاتی ہیں انہیں متوجہ کیا جائے کہ ماں کی غذا کی کیفیت دودھ کی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دودھ ماں کی غذا سے تیار ہوتا ہے۔ لہذا دودھ پلانے والی ماں کی غذا کو متنوع اور مختلف ہونا چاہیے اور اسے ہر طرح کی غذا سے استفادہ کرنا چاہیے۔ مختلف پھلوں، سبز لیٹ اور دانوں کا گاہے بگاہے استعمال کرنا چاہیے تاکہ وہ خود بھی تندرست رہیں اور ان کا دودھ بھی بھرپور اور کامل رہے۔

مائع اور آب دار غذائیں مفید ہیں۔ ماں کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ میٹھا اور اچھی غذا قیمتی ترین اور خوش مزہ ترین غذائیں ہیں بلکہ کامل غذا کے لیے ایک ایسا پروگرام بنایا جاسکتا ہے کہ جس میں غذا

متنوع بھی ہو، کم خرچ بھی، بھرپور بھی اور حفظانِ صحت کے مطابق بھی ہو۔ اس سلسلے میں غذا شناسی کی کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے جن میں سے ایک کتاب میں لکھا ہے :

ماہرین غذا دودھ پلانے والی عورتوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہر طرح کی غذا سے کچھ نہ کچھ استفادہ کرے خصوصاً گویا، چنے، دودھ، تازہ کھن، ناریل، ذیرن، انردٹ، بادام میٹھے اور سیلے پھل مثلاً خربوزہ، تربوز، گراما، سردا اور ناشپاتی وغیرہ۔
اسلام نے عجمائیں امر کی طرف توجہ دی ہے کہ ماں کی غذا اس کے دودھ پر اثر انداز ہوتی ہے۔
اسی وجہ سے

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

اگر تم نے اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے کسی یہودی یا عیسائی عورت کا انتخاب کیا ہے تو انہیں شراب پینے اور سور کا گوشت کھانے سے روکو۔

اگر ماں بیمار ہو جائے اور اسے دوا کی ضرورت پیش آجائے تو اسے چاہیے کہ اس امر کی طرف توجہ رکھے کہ اس کی دوائیں اس کے دودھ پر بھی اثر کریں گی اور ممکن ہے بچے کی صحت و سلامتی کو اس سے نقصان پہنچے۔ ماں کو نہیں چاہیے کہ اپنے آپ یا غیر آگاہ افراد کے کہنے سے کوئی دوا استعمال کرے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ڈاکٹر کی طرف رجوع کرے اور اسے یہ بھی بتائے کہ میں بچے کو دودھ پلا رہی ہوں۔

ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ

بچے کی اصلی غذا ماں کا دودھ ہی ہے لیکن جب تک فقط غذا کا انحصار ماں کے دودھ پر ہو تو بہتر ہے کہ ہر روز کچھ مٹھی کا تیل اور کچھ پھل اسے دیئے جائیں تاکہ دھامن اور معدنی مواد کے اعتبار سے اس کی خوراک جامع تر ہو جائے اور بچہ بہتر رشد کرے۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے اُس کی غذائی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ مرحلہ آجاتا ہے کہ وہ ماں کے دودھ سے سیر نہیں ہوتا۔ اس صورت میں چاہیے کہ دوسری غذاؤں سے شیر مادر کی لگ کے طور پر استفادہ کیا جائے۔ چار مہینوں کے بعد اور زیادہ سے زیادہ پھ مہینے کے بعد چاہیے کہ بچے کو دوسری غذاؤں سے آشنا کیا جائے ضروری ہے کہ بچے کی غذا، سادہ اور مائع کی صورت میں ہو مختلف پھلوں کا جو جس بچے کے لیے مفید ہوتا ہے۔

سبز لویں کو اُبال کر ان کا پانی بھی بچے کو دیا جاسکتا ہے۔ بخنی بچے کی نشوونما کے لیے مفید ہوتی ہے۔ جب بچے کے دانت نکل آئیں تو نسبتاً سخت غذائی جاسکتی ہے۔ مثلاً پکے ہوئے آلو، اُبے ہوئے انڈے، بسکٹ، تازہ پنیر اور کچھ روٹی اور کھن، چاول، تازہ پھل وغیرہ۔ بچے کی غذا مختلف قسم کی ہونی چاہیے۔ لیکن دھیان رہے کہ اتنی مقدار میں اسے غذائی جائے جتنی اسے ضرورت ہے نہ کہ اس سے زیادہ۔

مال کے دودھ کی ممانعت

چند مواقع ایسے ہیں کہ جہاں بچہ مال کے دودھ سے محروم ہو جاتا ہے۔

- ۱۔ اس صورت میں کہ جب مال کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو مثلاً پی۔ پی وغیرہ
- ۲۔ جب مال کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو مثلاً دل کی بیماری اور ڈاکٹر اسے دودھ دینے سے منع کر دے۔

۳۔ جب مال پاگل پن یا مرگی کے مرض میں مبتلا ہو۔

۴۔ جب مال خون کی شدید کمی کا شکار ہو اور دودھ دینا اس کے لیے باعث ضرر ہو۔

۵۔ جب مال شراب یا منشیات کی عادی ہو کیونکہ ان کا زہر دودھ میں داخل ہو جاتا ہے اور بچے کو بھی مسموم کر دیتا ہے۔

ایسے مواقع پر کہ جب دودھ دینا مال کے لئے باعث ضرر ہو یا بچے کو بیماری میں مبتلا کر دے یا اسے مسموم کر دے تو چاہیے کہ بچے کو مال کا دودھ نہ پلایا جائے اور کسی دوسرے طریقے سے اس کو غذا فراہم کی جائے۔ اگر دودھ پلانے والی عورت حاملہ ہو جائے تو وہ بتدریج اپنے بچے کا دودھ روک سکتی ہے اور اسے کوئی اور خوراک دے سکتی ہے۔

دودھ پلانے کا پروگرام

ماہرین نے بچے کو دودھ پلانے کے لیے دو طریقے تجویز کیے ہیں۔
 بعض کا یہ نظریہ ہے کہ بچے کو غذا یا خوراک دینے کے لیے چاہیے کہ منظم اور دقیق
 پروگرام بنایا جائے اور بچے کو اسی پروگرام کے تحت معین وقفوں میں دودھ پلایا جائے۔
 دوسرے دودھ پلانے کے درمیان بعض نے تین گھنٹے کا وقفہ معین کیا ہے اور بعض نے
 چار گھنٹے کا۔ یہ ماہرین کہتے ہیں کہ ہر تین یا چار گھنٹے بعد بچے کو دودھ دینا چاہیے اور اس
 دوران بچے کو دودھ دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

بعض دوسرے ماہرین نے اس روش کو پسند نہیں کیا اور انہوں نے آزاد پرویش
 یا طبعی تنظیم کو تجویز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بھی بچہ بھوکا ہو جاتا ہے اور وہ بھوک کا تقاضا
 کرتا ہے تو اسے دودھ دینا چاہیے۔

بعض کی نظر میں دوسری روش اس پہلی سے بہتر ہے کہ جس میں معین وقفوں کی پابندی
 کی جاتی ہے چاہے جب دودھ دیا جائے بچہ بھوکا بھی نہ ہو ان کے نزدیک دوسری تجویز
 علاوہ بڑے عملی لحاظ سے آسان ہے ظاہراً پسندیدہ اور معقول تر ہے کیونکہ پہلے مجوزہ پروگرام کا
 تقاضا اگرچہ یہ ہے کہ بچے کو بھوک کے وقت دودھ دیا جائے نہ کہ معین اوقات میں لیکن اس
 کے باوجود یہ بہت سے تقاضے کا حامل ہے۔ بہر حال دوسری تجویز بھی تقاضے سے خالی نہیں،
 ذیل کے چند نکات کی طرف توجہ کیجئے۔

۱۔ بچے میں بھوک اور پیاس کو لفظی طور پر متشخص نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بچہ بات تو نہیں کر

سکتا کہ اپنے داخلی محسوسات کو میانی کر سکے اگرچہ ابتدائی طور پر بچہ بھوک مٹانے کے لیے دودھ پیتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ دودھ پینے کا عادی بن جاتا ہے اور پستان کو چھوٹنے سے لطف اٹھاتا ہے۔ اس صورت میں کبھی کبھی بچے کے اندرونی احساسات اسے تحریک کرتے ہیں کہ وہ رونے لگے تاکہ دوسروں کی محبت کو اپنی طرف جذب کر سکے۔ ماں بھی اسے چپ کرانے کے لیے اپنا دودھ پیش کر دیتی ہے۔ بچہ بھوک کے بغیر بھی روتا ہے اور ماں اس خیال سے دودھ دیتی ہے کہ وہ بھوکا ہے۔ کبھی بھوک کی وجہ سے دودھ پیتا ہے اور کبھی بغیر بھوک کے بھی۔ البتہ واضح ہے کہ نامنظم طور پر اور بھوک کے بغیر غذا کا استعمال جیسے بڑوں کے لیے نقصان دہ ہے اسی طرح بچوں کے لیے بھی کہ جن کا نظام ہضم ابھی قوی نہیں ہوتا۔ نامنظم طور پر دودھ دینے سے ممکن ہے بچے کے نظام ہضم میں کوئی خلل پیدا ہو جائے اور بچہ کسی بیماری کے لیے تیار ہو جائے۔ اس بنا پر غذا دینے کی آزاد روش بچے کی صحت و سلامتی کے لیے بے ضرر نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں بھوک کے وقت کو تشخیص نہیں کیا جاسکتا۔ بچوں میں بہت سی بیماریاں نامنظم اور زیادہ غذا کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔

حضرت علیؑ فرمایا:

زیادہ کھانے اور کھانے کے بعد پھر کھانے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ زیادہ

کھانے والا بیمار بھی زیادہ ہوتا ہے۔

۲۔ جو بچہ شروع ہی سے بغیر کسی نظم و حساب کے دودھ پیتا ہے وہ شروع سے بے نظمی کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنی آئندہ کی زندگی میں نظم و ضبط سے عاری ایک فزوثابت ہو گا۔

۳۔ جو بچہ جب بھی روتا ہے اور اس کے منہ میں پستان دے دیا جاتا ہے وہ اسی عمر سے گریہ و زاری کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ آئندہ بھی رونے و دھرنے اور منت

سماجیت کو ہی مقصد تک پہنچنے کا بہترین وسیلہ سمجھنے لگتا ہے۔ کاموں میں صبر اور
حوصلے سے کام نہیں لیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے مقصد تک پہنچ جائے
اگرچہ اس کے لیے رونا پڑے یا اتنا س کر پیڑے یا ذلت کا بوجھ اٹھانا پڑے۔
۴۔ ایسے بچے کے ماں باپ اور مربیوں کو راحت و آرام نہیں ملتا کیونکہ وہ وقت بے
وقت رونے لگتا ہے اور دودھ مانگتا ہے۔

انہیں نقائص کی وجہ سے میں پہلی روش کو دوسری روش پر ترجیح دیتا ہوں اور منظم طریقے
سے غذا دینے کو بچے کی جسمانی اور روحانی نشوونما کے لیے بہتر سمجھتا ہوں۔
ڈاکٹر جلدی اس بارے میں لکھتے ہیں :

اگر کسی ماہر ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق بچے کے لیے دودھ پلانے کا منظم
پر دو گرام بنایا جائے تو اس میں اسی کے مطابق عادت پیدا ہو جائے گی اور عادت
خود اس بات کا سبب بنے گی کہ اس عادت سے مربوط طرز عمل اور رد عمل
سے بچے کی سیری اور بھوک کی حالت سدا گاہ ہو سکیں۔

ثانیاً انسان کے بہت سارے کام ہر روز جو کچھ عادت کے مطابق انجام
پانے چاہئیں لہذا دودھ دینے کا یہی منظم پر دو گرام اس کی بعد کی عادتوں کے لئے
اچھی بنیاد بن جائے گا۔
رسل لکھتا ہے :

آج کل ہر ماں بچے کی پرورش کے سادہ سے متفاتی جانتی ہے اور اس کی
تربیت کرتی ہے۔ مثلاً وہ جانتی ہے کہ بچے کو مناسب دفعوں سے غذا دینا کتنی ضروری
ہے نہ کہ جب وہ رو رہا ہو۔ اسے علم ہے کہ ایسی پابندی اس لیے رکھی جاتی ہے کہ یہ
غذا کے ہضم ہونے میں بہت فائدہ مند ہے۔۔۔۔۔

علاوہ ازیں تربیت اخلاق کے حوالے سے بھی مطلوب ہے کیونکہ شیر خوار بچے

اسی سے زیادہ جلد ساز اور کرباز ہوتے ہیں کہ جتنا بڑے ان کے بارے میں
 قصہ کرتے ہیں۔ بچے جب دیکھتے ہیں کہ رونے دھونے سے ان کا مقصود حاصل
 ہو جاتا ہے تو وہ پھر اسی روش کو اختیار کرتے ہیں اور بعد میں جب کہ وہ دیکھتے
 ہیں کہ شکوہ اور آہ و ناری کی عادت بجائے اس کے کہ نوازش کا باعث بنے
 نفرت کا سبب بنتی ہے تو تعجب کرتے ہیں اور ان کو بہت دھچکا پہنچتا ہے
 اور دنیا ان کی آنکھوں میں سرد، خشک اور بے روح ہوتا جاتی ہے۔ لہ

لیکن چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

۱۔ سب بچوں کے لیے اور دودھ پینے کے تمام عرصے کے لیے غذا کا ایک جیسا پروگرام
 معین کیا جاسکتا کیونکہ نظام ہضم اور بچے کی غذائی ضرورت تمام مدت میں ایک جیسی
 رہتی۔ نوزائیدہ بچہ کا معدہ اور نظام ہضم آغاز تولد سے چالیس پچاس روز تک بہت
 چھوٹا ہوتا ہے کہ جو تھوڑے سے دودھ سے بھر جاتا ہے۔ نوزائیدہ بچہ تھوڑے سے دودھ
 سے سیر ہو جاتا ہے لیکن تھوڑی ہی مدت بعد پھر بھوکا ہو جاتا ہے اس مدت میں
 چاہے کہ دودھ پلانے کے درمیان فاصلہ کم ہو مثلاً ۱۲ سے ۲ گھنٹے تک۔ لیکن اس
 کے بعد بچے کے بڑے ہونے کے اعتبار سے وقفوں میں زیادہ اضافہ کیا جاسکتا ہے
 مثلاً تین گھنٹے یا چار گھنٹے یہاں تک کہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ کا۔

۲۔ سب بچے جسمانی ساخت اور نظام ہضم کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں ہوتے بعض کو جلدی
 بھوک لگ جاتی ہے اور بعض کو دیر سے لہذا ان سب کے لئے ایک جیسا پروگرام تجویز
 نہیں کیا جاسکتا۔ سمجھا رہا ہوں کہ منہ مائیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرتی ہیں اور اپنے
 بچوں کی صحت و سلامتی کی خواہاں ہوتی ہیں۔ وہ بذاتِ خود اپنے بچے کے لیے خاص شرائط و
 حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے غذا کا پروگرام منظم کرتی ہیں اور ضروری ہو تو وہ ڈاکٹر کی طرف
 رجوع کر کے مشورہ بھی کرتی ہیں۔

لے تربیت مثلاً

۳۔ جب بھی بچے کو دودھ دیا جائے تو اسے پوری طرح سیر کرنا چاہیے البتہ خواتین کو اس امر کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ بچہ بالخصوص نوزاد بچہ جلدی سو جاتا ہے اور معمولاً دودھ پیتے پیتے سو جاتا ہے جب کہ ابھی وہ سیر نہیں ہوا تو اس صورت میں ماں بچے کی پشت پر آہستہ آہستہ ہاتھ مار سکتی ہے تاکہ وہ بیدار رہے اور پوری طرح سے سیر ہو جائے۔

۴۔ جب بچے کو دودھ دینے کا منظم پروگرام ترتیب پا جائے تو اس پر صبح طرح سے عمل درآمد کی طرف توجہ رکھنا چاہیے اور مقرر اوقات کے درمیان میں اسے ہرگز دودھ نہیں دینا چاہیے اگرچہ وہ گریہ و زاری کرے اس کام میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ بچہ آہستہ آہستہ اس غذائی پروگرام کا عادی ہو جائے۔ اس کے بعد وہ خود بخود معین اوقات میں بیدار ہونے لگے گا اور دودھ کا تقاضا کرنے لگے گا۔ ایسی صورت میں ایک صابر، بردبار اور منظم بچہ بھی پروان چڑھے گا اور آپ بھی آرام و راحت میں رہیں گے۔

۵۔ بچے کے غذائی پروگرام کو اس طریقے سے مرتب کرنا چاہیے کہ اُدھی رات کے بعد سے صبح تک اُسے غذائے دی جائے تاکہ وہ اس طرز عمل کا عادی ہو جائے۔ اس صورت میں بچہ بھی آرام و راحت سے سو جائے گا اور ماں بھی چند گھنٹے ٹھیکون اور چین سے آرام کر سکے گی۔

۶۔ ہر مرتبہ بچے کو دودھ دینے کے بعد پستان کو تھوڑی سی روٹنی سے صاف کرنا چاہیے۔ یہ کام بچے کی صحت و سلامتی کے لیے بھی مفید ہے اور پستان کو زخمی ہونے سے بھی بچتا ہے۔

۷۔ جب بچہ دودھ پیتا ہے تو عموماً کچھ ہوا اس کے معدے میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لیے ناراحتی کا سبب بنتی ہے اور اس کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہے۔ دودھ دینے کے بعد آپ اُسے بلند کر سکتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کی پشت پر ہاتھ مار سکتے ہیں تاکہ ہوا نکل جائے۔ اور بچہ دل کی تکلیف میں مبتلا نہ ہو۔

۸۔ بچے کو دونوں پستانوں سے دودھ دیں تاکہ آپ کا دودھ خشک نہ ہو۔ اور آپ پستان کے درمیں جتنا نہ ہوں ایک خاتون کہتی ہے:

حضرت مادی علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا اپنے بچے کو ایک پستان سے دودھ نہ دے بلکہ دونوں پستانوں سے دودھ دے تاکہ اسے کامل غذا مل سکے۔

۹۔ دودھ پلانے والی ماؤں کو چاہیے کہ وہ زیادہ تھکا دینے والے کام اور شدید غصہ سے اجتناب کریں کیونکہ مال کی ناراضی اور شدید غصے کے اثرات دودھ پر مرتب ہوتے ہیں کہ جو بچے کے لیے نقصان دہ ہیں۔

مال کا دودھ نہ ہو تو؟

اگر مال کا دودھ بچے کی ضرورت پوری نہ کرتا ہو تو مال کو حتیٰ نہیں پہنچتا کہ وہ اسے اپنے دودھ سے بالکل ہی محروم کر دے بلکہ اس کا جتنا بھی دودھ ہے وہ بچے کو پلانے اور کمی کو دوسرے دودھ اور غذا سے پورا کرے۔ لیکن اگر مال کا دودھ بالکل نہ ہو (البتہ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے) یا وہ دودھ دینے سے معذور ہو تو پھر گائے کے دودھ سے استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ جو کسی حد تک شیر مادر سے ملتا جلتا ہے یا پھر خشک دودھ سے۔ اگر گائے کے دودھ سے استفادہ کیا جائے تو چاہیے کہ مندرجہ ذیل نکات کی طرت توجہ رکھی جائے۔

۱۔ گائے کا دودھ عموماً مال کے دودھ سے زیادہ گاڑھا اور زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

اس لحاظ سے چاہیے کہ اس میں کچھ اُبلّا ہوا پانی ملا دیا جائے اس حد تک کہ وہ مال کے دودھ جیسا ہو جائے اس میں تھوڑی سی چینی بھی ملا لینی چاہیے۔

۲۔ دودھ کو پندرہ منٹ تک کے لیے اُبال لینا چاہیے تاکہ اگر اس میں جراثیم ہوں تو وہ ختم ہو جائیں۔

۳۔ بچے کو جو دودھ پلایا جائے نہ زیادہ گرم ہو اور نہ زیادہ سرد بالکل مال کے دودھ جیسی اس کی حرارت ہو۔

۴۔ ہر مرتبہ بچے کو دودھ پلاتے وقت فیڈر (دودھ والی بوتل) کو دھو لینا چاہیے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دودھ خراب ہو جائے اور بچہ بیمار ہو جائے۔

۵۔ کوشش کرنی چاہیے کہ حتیٰ المقدور تازہ اور صحیح دودھ سے استفادہ کیا جائے۔

اگر آپ بچے کی غذا کے لیے خشک دودھ سے استفادہ کرنا چاہیں تو ضروری ہے کہ اس بارے میں ڈاکٹر سے مشورہ کریں کیونکہ خشک دودھ مختلف قسم کا ہوتا ہے اور ہر قسم کا دودھ ہر بچے اور ہر عمر کے لیے مفید اور مناسب نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ہی فیصلہ کر کے آپ کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر کوئی دودھ آپ کے بچے کے لئے تجویز کرے اور وہ آپ کے بچے کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو تو آپ پھر ڈاکٹر کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

دودھ چھڑوانا

بچے کو پورے دو سال دودھ پلانا چاہیے۔ دو سال دودھ پینا ہر بچے کا فطری حق ہے کہ جو خداوند بزرگ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔
 وَأَنۡوَالِدَآءُ يُرۡضِعْنَ أَوْلَدَهُنَّ حَتَّىٰ حَوۡلَیۡنَ کَامِلَیۡنَ۔
 مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ (بقرہ آیہ ۲۳۳)
 اگر ماں چاہے تو دو سال سے جلدی بھی بچے کو دودھ چھڑوانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ کہ کم از کم اکیس مہینے اسے دودھ پلا چکی ہو۔
 حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

الرضاع واحد وعشرون شهراً فما نقص فهو جود علی المصی
 دودھ پلانے کی مدت کم از کم اکیس ماہ ہے۔ اگر کسی نے اس مدت سے کم
 پلایا تو یہ بچے پر ظلم ہے۔ لہ

ان دو سالوں میں بچہ آہستہ آہستہ دوسری غذاؤں سے آشنا ہو جاتا ہے ماں رفتہ رفتہ
 بچے کا دودھ کم کر دیتی ہے اور اس کے بجائے اسے دوسری غذا دیتی ہے۔ دودھ پلانے کی
 مدت پوری ہونے کے بعد بچے کو دودھ چھڑوایا جاسکتا ہے اور صرف دوسری غذاؤں سے
 استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ سمجھدار اور معطر فہم مائیں خود بہتر جانتی ہیں کہ بچے کے لیے کسی طرح

لہ وسائل الشیعہ جلد ۵ ص ۱۱۱

کی غذا انتخاب کرنی چاہیے کہ جو بچے کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہو اور غذائیت کے اعتبار سے بھی کامل۔

البتہ بچے کو دودھ پھڑوانا کوئی ایسا آسان کام بھی نہیں۔ یقیناً وہ چند روز گریہ و زاری و فریاد کرے گا لیکن صبر و استقامت سے کام لینا چاہیے تاکہ وہ بالکل دودھ پھوڑ دے۔ ماں شرمعی حد تک دودھ کو بڑا کہہ سکتی ہے اپنے پستان کو سیاہ اور خراب کر سکتی ہے یا پستان کے مزے کو کڑوا کر سکتی ہے تاکہ بچہ دودھ پینے سے رُک جائے۔

لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے کسی خیالی یا دوسری چیز سے ڈرایا جائے۔ اس امر سے غافل نہ رہیے کہ بچے کو ڈرانا کوئی اچھا کام نہیں ہے اس سے اس کے جسم اور روح پر بڑے اثرات پڑتے ہیں جو بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔

بیٹی یا بیٹا

جو نہی عورت حاملہ ہوتی ہے وہ اس مسئلہ میں مضطرب رہتی ہے کہ بیٹا ہو گا یا بیٹی، دعا کرتی ہے، نذر مانتی ہے، نیاز دیتی ہے کہ بیٹا ہو۔ جب اس کے عزیز رشتے دار ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تمہارے چہرے کے رنگ سے لگتا ہے کہ بیٹا پیدا ہو گا۔ جب کہ اس کے برخلاف اس کے دشمن کہتے ہیں کہ تمہاری آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیٹی پیدا ہو گی۔ شوہر بھی بیگم سے پیچھے نہیں ہوتا اس کے بھی دل میں بیٹے کی خواہش چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ موقع بے موقع وہ اس بارے میں بات کرتا ہے اور ادھر ادھر کے وعدے کرتا رہتا ہے۔ پیدائش کے وقت سب حاضرین کی توجہ اس مسئلے کی طرف رہتی ہے کہ بیٹا ہے یا بیٹی۔ اگر بیٹی ہو تو ایک دفعہ کرہ پیدائش میں سرتاپا سکوت ہو جاتا ہے اور چہرے اتر جاتے ہیں لیکن اگر بیٹا ہو تو خوشی کا شور و شین بلند ہو جاتا ہے۔ ماشاء اللہ سے آواز گونج اٹھتی ہے۔ جب بچے کی پیدائش کی خبر پاتے ہیں کہ بچہ بیٹا ہو تو خوش ہو جاتا ہے، ادھر ادھر دوڑتا ہے، اٹھائیاں اور پھل لاتا ہے، ڈاکٹر اور دوا کا بندہ دست کرتا ہے۔ کہتا پھرتا ہے بچے کا دھیان رکھنا اُسے کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ بیگم کے بارے میں اعتدال کرنا کہ کہیں بچے نہ چلے نہ۔ دائیہ اور نرسوں کو انعام دیتا ہے۔ لیکن اگر بیٹی جنم لے تو اس کا چہرہ ہی اتر جاتا ہے۔ کونے میں جا بیٹھا ہے اپنی بدبختی پر روتا ہے اور اپنی زندگی کو قح بناتا ہے۔ بیمار بیوی کی طرف اعتنا نہیں کرتا اس کی احوال پرسی اور عیادت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اسے ایسا غصہ آتا ہے کہ طلاق کی دھمکی دینے لگتا ہے۔ ہمارے انحطاط پذیر اور بے تربیت معاشرے کی اکثریت میں ایسے ہی غلط انکار اور بُری عادت موجود ہے۔ البتہ سب ایسے نہیں ہیں۔ دشمن

لوگ بھی موجود ہیں کہ جن کی نظر میں بیٹا اور بیٹی برابر ہے لیکن وہ اقلیت میں ہیں۔
والد عزیز اور والدہ گرامی !

بیٹا ہو یا بیٹی ان میں کیا فرق ہے۔ کیا بیٹی میں انسانیت کم ہوتی ہے؟ کیا اس میں ترقی اور پیش رفت کی صلاحیت نہیں ہوتی؟ کیا وہ ایک مفید اور قیمتی انسان نہیں بن سکتی؟ کیا بیٹی تمہاری اولاد نہیں ہے؟ آخر بیٹیوں کا ماں باپ کے لیے کون سا ایسا فائدہ ہے جو بیٹی کا نہیں؟ اگر بیٹی کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو اللہ اپنے رسولؐ کی نسل کو فاطمہؑ کے ذریعے کیسے برقرار رکھتا۔ اگر بیٹی کی آپ اچھی پرورش کریں تو وہ بیٹے سے پیچھے نہیں رہے گی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں آپ کو ایسی خواتین نظر آئیں گی جن میں سے ایک ایک ہزاروں مردوں پر بھاری ہے۔ یہ کیسے غلط افکار ہمارے معاشرے میں پھیل گئے ہیں کہ جن سے عورت کا مقام گر گیا ہے۔ ایسے جاہلانہ اور غلط افکار کے خلاف جہاد کیجئے بیٹے اور بیٹی میں غلط فہمی کے فرق کو اپنے ذہن سے نکال دیجئے۔
ذمہ دار اور مفید انسانوں کی تعمیر کے بارے میں سوچئے۔ سو مند اور قیمتی انسان بیٹی بھی ہو سکتی ہے اور بیٹا بھی۔ جس وقت ہمیں بچے کی پیدائش کی خبر ملے اگر وہ صحیح و سالم ہو تو خدا کا شکر کر دو کہ وہ پروردگار عالم کا عطیہ ہے اور تمہارے وجود کی یادگار ہے کہ جو زندگی کے حساس اور خطرناک مرحلے سے صحیح و سالم گزر آیا ہے اور اس نے زمین پر قدم رکھا ہے۔

پیغمبر اکرمؐ اور آمنہؑ اطہار علیہم السلام کی یہی روش تھی۔

جس وقت امام سجادؑ علیہ السلام کو فوملود کی خبر دی جاتی تو بیٹی یا بیٹے کے بارے میں ہرگز سوال نہ کرتے۔ لیکن جب ان کو بتایا جاتا کہ صحیح و سالم ہے تو خدا کا شکر ادا کرتے یہ۔

رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دوستوں کے ساتھ جو گفتگو تھے اسی اثنا میں ایک شخص محفل میں داخل ہوا اور حضورؐ کو خبر دی کہ اللہ نے آپؐ کو بیٹی عطا کی ہے۔ رسول اللہؐ اس خبر پر خوش ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا آپؐ نے جب اپنے اصحاب کی طرف نظر کی تو ان کے چہروں پر ناراضگی کے آثار ہو رہے تھے آپؐ نے بڑا مانتے ہوئے فرمایا !

مادہ کسہ؟ ریحانۃ اشہما ورزقہا علی اللہ عزوجل۔

کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اللہ نے مجھے پھول عطا کیا ہے جس کی ہلک میں رنگتاً ہوں اور اللہ نے اس کا رزق دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس بڑی عادت کی مذمت کی ہے اور قرآن میں فرمایا ہے۔

وَإِذَا بَشَّرَ أَحَدَهُمْ بِالذُّنَىٰ لَعَلَّ رَجَعَهُ مُسْوَدًّا ۖ وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُورٍ مَا بُشِّرَبِهِ۔

(سورہ نحل۔ آیہ ۵۸-۵۹)

جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی ہے تو شرم کے مارے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے، غصہ اس پر چھا جاتا ہے۔ اس بڑی خیر کے باعث وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے۔

بچے کا نام

مال باپ کی حساس اور اہم ذمہ داریوں میں سے ایک بچے کے نام کا انتخاب ہے۔ نام رکھنے کو چھوٹی سی اور غیر اہم چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔ لوگ ناموں اور خاندانوں سے اندازہ لگاتے ہیں اور ان کی خوبی اور خوبصورتی کو شخصیت کی پہچان شمار کرتے ہیں جس کسی کا بھی اپنا اور خاندانی نام خوبصورت ہو گا وہ ہمیشہ ہر جگہ سربلند ہو گا اور جس کسی کا نام بھی بُرا ہو گا شرمندہ ہو گا۔ بُرے نام کو اپنا عیب سمجھے گا اور احساس کمتری میں مبتلا رہے گا۔ بعض اوقات بے ادب لوگ اس کا مذاق بھی اڑائیں گے اور یہ احساس کمتری وہ چاہے نہ چاہے اس کی روح پر بُرے آثار مرتب کرے گا۔ اس وجہ سے اسلام اچھے نام کا انتخاب مال باپ کی ذمہ داری قرار دیتا ہے اور اسے ان کی اولین نیکی شمار کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،
 ہر باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے خوبصورت نام انتخاب کرے۔
 پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،
 اولاد کے باپ پر تین حق ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کا نام اچھا رکھے۔ دوسرا یہ کہ اُسے پڑھنا
 لکھنا سکھائے تیسرا یہ کہ اس کے لیے شریک حیات ڈھنڈے سے لے

سے مستدرک ج ۲ ص ۶۱۸

سے بحار الانوار ج ۱۰ ص ۹۷

اہم موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا:

اقل ما یبتر الذجل ولدا ان یسمیہ باسم حسن۔

باپ کی پہلی نیکی اولاد کے ساتھ یہ ہے کہ اس کے لیے پیارا سا نام انتخاب کر لے۔
دوسری طرف نام کا انتخاب بہت زیادہ مباشرتی اثر بھی رکھتا ہے۔ نام ہے کہ جو ماں باپ کے مقاصد، افکار اور آرز و دل کا ترجمان ہوتا ہے اور انہی اولاد کو باقاعدہ مختلف گروہوں اور اہانت میں سے کسی کے ساتھ وابستہ اور ملحق کرتا ہے۔ نام ہی سے مجاہدار ماں باپ کے افکار اور ارمانوں کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ ماں باپ کو اگر کسی خاص شاعر سے تعلق خاطر ہوگا تو وہ اپنے بچے کے لیے اسی کا نام انتخاب کریں گے۔ اگر وہ علم دوست ہوں گے تو علماء میں سے کسی کے نام سے استفادہ کریں گے۔ اگر دیندار ہوں گے تو انبیاء و ائمہ اور بزرگان دین کے ناموں میں سے کوئی نام چنیں گے۔ اگر وہ اسیار دین کے راستے میں جہان بازی اور شہکاروں کے خلاف جہاد کو پسند کرتے ہوں گے تو محمد، علی، حسن، حسین، ابو الفضل، عباس، حمزہ، جعفر، ابوذر، عمار اور سعید جیسے ناموں میں سے کوئی نام انتخاب کریں گے۔

اگر وہ کسی کھیل کو پسند کرتے ہوں گے تو معروف کھیلوں میں سے کسی کا نام رکھیں گے۔
اگر انہیں کوئی گلوکار اچھا لگتا ہوگا تو اپنے بچے کا نام اسی کے نام پر رکھیں گے۔

اگر وہ ظلم و ستم سے خوش ہوں گے تو سکندر، تیمور، چنگیز جیسے ناموں میں سے کسی کا انتخاب کریں گے۔ ہر ماں باپ نام کے انتخاب سے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو کسی خاص گروہ سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ ناموں کی یہ وابستگی عمومی افکار پر اثر انداز ہونے کے علاوہ زیادہ تر صاحب نام پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

استحسنوا اسماءکم فانکم تدرعون بہا یوم القیامۃ قسویا فلان

بن فلان الی نورث، وقسویا فلان بن فلان لا نورث۔

اچھا نام رکھو کیونکہ قیامت کے روز تمہیں اپنی ناموں سے پکارا جائے گا اور کہا جائے گا اسے فلاں بن فلاں اٹھ کھڑے ہو اور اپنے نور سے وابستہ ہو جاؤ اور اسے فلاں بن فلاں اٹھ کھڑے ہو کہ تمہارے لیے کوئی روشنی نہیں جو تمہاری راہنمائی کرے۔ ۱۵

ایک شخص نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا: ہم لوگ آپ کے اور آپ کے اجداد کے نام اپنے لیے انتخاب کرتے ہیں کیا اس کام کا کوئی فائدہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

ہاں! اللہ کی قسم! کیا دین اچھوں سے محبت اور بڑوں سے نفرت کے سوا بھی کچھ ہے۔ ۱۶

دنیا میں لوگ اپنے مقاصد کی ترویج کے لئے اور شخصیتوں کو نمایاں کرنے کے لئے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شہروں، شہزادوں اور چوراہوں کے نام رکھنے تک سے استفادہ کرتے ہیں۔ ایک ذمہ دار اور آگاہ مسلمان بھی دین کی ترویج کے لیے کسی موقع پر یہاں تک کہ نام رکھنے کے موقع پر غفلت نہیں کرتا۔

ہاں! حسن، حسین، ابو الفضل، علی اکبر، حمزہ، جعفر، ابو ذر اور عمار جیسے ناموں کے انتخاب سے امدان کی ترویج سے اسلام کے مردان مجاہد کی جانبازی اور فداکاری کو دلوں میں زندہ رکھا جاسکتا ہے فداکاری اور ظالموں کے خلاف جہاد کی روح ملت میں پھونکی جاسکتی ہے۔ اللہ کے عظیم رسولوں مثلاً ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد کا نام انتخاب کر کے خدا پرستوں اور اور توانین الہی کے حامیوں کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کیا جاسکتا ہے، خدا کار اور مجاہد شیعہ مثلاً ابوذر، عمار اور ایسے سینکڑوں دوسرے حقیقی تشیع کے مصداق کے ناموں کے احیاء اور ترویج سے ملت کو شخصیت کا حقیقی مفہوم سکھایا جاسکتا ہے۔ اسلام کے عظیم

علماء کے ناموں کا انتخاب کر کے ان کے علم و دانش کی قدر دانی اور ترویج کی جاسکتی ہے۔ ایک سمجھدار مسلمان اس امر پر تیار نہیں ہو سکتا کہ وہ ظالموں یا اسلام دشمنوں میں سے کسی کا نام اپنے پیچھے کے لیے انتخاب کرے۔ وہ جانتا ہے کہ خود یہ نام رکھنا بھی ایک طرح سے ظلم کی ترویج ہے۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

لقد احتظرت من الشيطان احتظارا شديدا ان الشيطان
اذا سمع مناديا ينادى يا عمدا او يا على ذاب كما يذوب
المرصاص، حتى اذا سمع مناديا ينادى باسم عدو من اعدائنا
اهتزوا اختالا-

شیطان سے بچو! اور اس سے بہت خبردار رہو، کہ جب شیطان سنتا ہے کہ
کسی کو محمد اور علی کہہ کے پکارا جا رہا ہے تو وہ لوں گھل جاتا ہے جیسے سید
گھل جاتا ہو اور جب وہ سنتا ہے کہ کسی کو ہمارے دشمنوں میں سے کسی کے
نام سے پکارا جاتا ہے تو خوشی سے پھولا نہیں سکتا۔ لہ

پیغمبر اسلام علیہ السلام نے فرمایا :

من ولد له اربعة اولاد لم يسم احدهم باسمي فقد جفاني -
جس کسی کے بھی چار بیٹے ہوں اور اس نے کسی ایک کا نام بھی میرے نام پر نہیں
رکھا اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ لہ
امام باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا :

خيرها اسماء الازنبيا
بہترین نام نبیوں کے نام میں یہ لکھ

۱۔ رسائل الشیعہ - ج - ص ۱۲۶

۲۔ رسائل الشیعہ - ج - ص ۱۲۷

۳۔ رسائل الشیعہ - ج - ص ۱۲۸

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نام کے مسئلے پر اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ الزان
 کے اصحاب یا شہروں کے ناموں میں سے کسی کا اچھا نہ لگتا تو فوراً بدل دیتے۔ عبد الشمس کو
 عبد الوہاب میں تبدیل کر دیا۔ عبد العزیٰ دعزائی بت کا بندہ (کو آپ نے عبد اسد میں بدل دیا۔
 عبد الحارث (شیر کا بندہ) کو عبد الرحمن میں اور عبد الکعبہ کو عبد اللہ میں بدل دیا۔



صحت و صفاتی

بچے کا لباس سال کے مختلف موسموں اور آب و ہوا کے اعتبار سے ایسا تیار کرنا چاہیے کہ نہ اُسے ٹھنڈ لگے اور نہ ہی گرمی کی شدت سے اس کا پسینہ ہوتا رہے اور اسے تکلیف محسوس ہو۔ نرم اور سادہ سوئی کپڑے بچے کی صحت اور آرام کے لیے بہتر ہیں۔ تنگ اور چمکے ہوئے لباس بچے کی آزادی کو سلب کر لیتے ہیں اور ایسا ہونا اچھا نہیں ہے۔ ان کو تبدیل کرتے وقت بھی ماں اور بچے دونوں کو نرمحت ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں میں رواج ہے کہ بچے کو سخت کپڑوں میں پیک کر دیتے ہیں اور اُس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں۔ ظاہراً ایسا کرنا اچھا نہیں ہے اور بچے کے جسم اور روح کے لیے ضرر رساں ہے۔ اس غیر انسانی عمل سے اس ننھی سی کمزور جان کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔ اُسے اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ آزادی سے اپنے ہاتھ پاؤں مارے اور حرکت دے سکے اس طرح سے اُس کی فطری نشو و نما اور حرکت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:

بونہی بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے اور آزادی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتا ہے تو فوراً اس کے ہاتھ پاؤں کو ایک نئی قید و بند میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ پہلے تو اسے پیک کر دیتے ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں کو دراز کر کے زمین پر سلا دیتے ہیں اور پھر اس کے جسم پر اتنے کپڑے اور لباس چڑھاتے ہیں اور کمربند باندھتے ہیں کہ وہ حرکت تک نہیں

کر سکتا..... اس طرح سے پچھے کی داخلی نشوونما کہ جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ ہوتی ہے اس خارجی رکاوٹ کی وجہ سے ٹک جاتی ہے کیونکہ پچھہ نشوونما اور پرورش کے لیے اپنے بدن کے اعضاء کو اچھی طرح سے حرکت نہیں دے پاتا..... جن ممالک میں اس طرح کی دشمنانہ دیکھ بھال کا معمول نہیں ہے اُس علاقے کے لوگ طاقت ور یا قوی، بلند قامت اور متناسب اعضاء کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جن علاقوں میں بچوں کو کس باندھ دیا جاتا ہے وہاں پر بہت سے لوگ لو لے لنگولے، میڑے میڑھے، پست قامت اور عجیب و غریب ہوتے ہیں..... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی پرورش اور ایسے دشمنانہ عمل اس کے اخلاق اور مزاج کی کیفیت پر نامطلوب اثر نہیں ڈالیں گے۔ سب سے پہلا احساس اُس میں درد اور قید و بند کا ہوتا ہے کیونکہ وہ ذرا بھی حرکت کرنا چاہتا ہے تو اسے رکاوٹ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اس کی حالت تو اس قیدی سے بھی بڑی ہوتی ہے جو قید با مشقت جگت رہا ہوتا ہے۔ ایسے بچے ایسے ہی کوشش کرتے رہتے ہیں، پھر انہیں غصہ آتا ہے۔ پھر چیختے چلاتے ہیں..... اگر آپ کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیے جائیں تو آپ اس سے بھی زیادہ اور بلند تر چیخیں چلائیں گے۔

پچھہ بھی ایک انسان ہے اس میں بھی احساس اور شعور ہے وہ بھی آزادی اور راحت کا طلب گار ہے۔ اُسے بھی اگر کس باندھ دیا جائے اور اُس کی آزادی سلب کر لی جائے تو اسے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا اس کا ایک ہی رد عمل ہے گریہ و زاری اور داد و فریاد اور اس کے سوا اس کا کوئی چارہ ہی نہیں۔ یہ دباؤ، بے آراغی اور تکلیف تدریجاً بچے کے اعصاب اور ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسے ایک تند مزاج اور چڑچڑاشخص بنا دیتی ہے بچے کے لباس کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھیں جب بھی وہ پیشاب کرے تو اس کا لباس تبدیل کریں

اس کے پاؤں کو دھوئیں اور زیتون کے تیل سے اس کی مالش کریں تاکہ وہ خشکی اور سوزن کا شکار نہ ہو۔ چند مرتبہ پیشاب کے بعد بچے کو نہلائیں اور اسے پاک کریں اس طرح بچے کی صحت سلامتی میں آپ اس کی مدد کر سکتے ہیں اور اسے بچپن کی کئی بیماریوں سے بچا سکتے ہیں۔ علاوہ انہیں بچہ نفیس و پاکیزہ ہوگا، آنکھوں کو بھلا لگے گا اور سب اس سے پیار کریں گے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”اسلام دین پاکیزگی ہے، آپ بھی پاکیزہ رہیں کیونکہ فقط پاکیزہ لوگ ہی بہشت میں داخل ہوں گے“۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”بچوں کو چمکنا ہٹ اور میل کچل سے پاک کریں کیونکہ شیطان انہیں سونگھتا ہے پھر بچہ خواب میں ڈرتا ہے اور بے چین ہوتا ہے اور فرشتے ناراحت ہوتے ہیں“۔

بیٹوں کا ختنہ کرنا ایک اسلامی رواج ہے اور واجب ہے۔ ختنہ بچے کی صحت سلامتی کے لیے بھی مفید ہے ختنہ کر کے بچے کو میل کچل اور آلودگی اور اضافی گوشت کے درمیان پیدا ہونے والے موزی جراثیم سے بچایا جاسکتا ہے۔ ختنے کو زمانہ بلوغ تک مؤخر کیا جاسکتا ہے لیکن بہتر ہے کہ پیدائش کے پہلے پہلے دنوں ہی یہ انجام پایا جائے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ ساتویں دن نو موموں کا ختنہ کروایا جائے۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اُخْتَنُوا أَوْلَادَكُمْ لِسَبْعَةِ أَيَّامٍ، فَإِنَّهُ أَطْهَرُ وَأَسْرَعُ لِنَبَاتِ

اللِّحْمِ، وَإِنَّ الْأَرْضَ تَتَكْرَهُ بَوْلَ الْأَخْلَفِ“

”ساتویں دن اپنے بچوں کا ختنہ کریں۔ یہ ان کے لیے بہتر بھی ہے اور پاکیزہ تر

بھی۔ نیز اُن کی سرلیج ترش و دنا اور پرورش کے لیے بھی مفید ہے اور یقیناً زمین اس انسان کے پیشاب سے کراہت کرتی ہے کہ جس کا غنہ نہ ہوا ہو یہ سلسلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”اٰخْتَنُوا اَوْلَادَكُمْ يَوْمَ السَّابِعِ فَاِنَّهُ اَطْهَرُ وَاَسْمَعُ لِنَبَاتِ
الْخَمْرِ“

”نومولود کا ساتویں دن غنہ کریں تاکہ وہ پاک ہو جائے اور بہتر رشد و نمو کرے“

عقیدہ کرنا بھی مستحبات مؤکد میں سے ہے۔ اسلام نے اس امر پر زور دیا ہے کہ ساتویں دن بچے کے بال کوٹائے جائیں اور اُس کے بالوں کے وزن کے برابر سونا یا چاندی صدقہ دیا جائے اور اُنھی روز عقیدہ کے طور پر دہن و بچ کیا جائے اور اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کیا جائے۔ یا انہیں دعوت کر کے کھلایا جائے۔ عقیدہ کرنا ایک اچھا صدقہ ہے اور بچہ کی جان کی سلامتی لھ وقع بلا کے لئے مفید ہے۔

نومولود نہایت نازک اور ناقول ہوتا ہے۔ اُسے ماں باپ کی توجہ اور نگرانی کی بہت اُمتیاج ہوتی ہے۔ صحت و سلامتی یا رنج و بیماری کی پہچن میں ہی انسان میں بنیاد پڑ جاتی ہے اور اس کی ذمہ داری ماں باپ پر عائد ہوتی ہے جو ماں باپ اس کے وجود میں آنے کا باعث بنے ہیں ان کا فریضہ ہے کہ اس کی حفاظت اور نگہداشت کے لیے کاوش کریں اور ایک سالم اور تندرست انسان پر دان چڑھائیں۔ اگر ماں باپ کی سہل انگاری اور غفلت کی وجہ سے بچے کے جسم و روح کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ سؤل ہیں اور ان سے مواخذہ کیا جائے گا۔ بچہ دیسوں بیماریوں میں ٹھہرتا ہے، جن میں سے بہت سی بیماریوں کو لاحق ہوئے سے روکا جاسکتا ہے مثلاً بچوں کا فالج، جسم پر پھالوں کا پیدا ہونا، خسرہ، چیمپ، خناق (DIPHTERIE)، تشنج،

اور کالی کھانسی وغیرہ جیسی بیماریوں سے متعلق ٹیکے لگوا کر ویکسینیشن کے ذریعے بچا جا سکتا ہے خوش قسمتی سے شفا خانوں اور طبی مراکز میں اس قسم کی بیماریوں کی روک تھام کا انتظام موجود ہے۔ اور رجوع کرنے والوں کو اس مقصد کے لیے مفت ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ ماں باپ کے پاس اس بارے میں کوئی غدر موجود نہیں ہے۔ اگر وہ کوتاہی کریں اور ان کا عزیز بچہ فالج زدہ ہو جائے اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جائے یا آخر عمر تک ناقص اور بیمار رہ جائے تو وہ خدا اور اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوں گے بہر حال ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اولاد کی صحت و سلامتی کی حفاظت کے لیے کوشش کریں اور توانا اور صحیح و سالم انسان پروان چڑھائیں۔

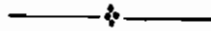
بچے کی نیند اور آزادی

چند ابتدائی ہفتے نومولود زیادہ وقت سویا رہتا ہے۔ شاید رات دن وہ میں گھٹے سوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی نیند کی مدت کمتر ہوتی جاتی ہے۔ نومولود کو نیند اور مکمل آرام کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ شور و شین اور مزاحمت سے وہ بیزار اور متفرق ہوتا ہے وہ پرسکون ماحول کو پسند کرتا ہے تاکہ آرام سے سو سکے اور اس میں اُسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ زیادہ چوما چائی اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گردش اور دوسروں کو دکھاتے رہنے سے بچے کا آرام و استراحت تباہ ہو جاتا ہے۔ زیادہ غل غباڑا اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی سمع خراش آوازیں بچے کے نازک اعصاب کو متاثر کرتی ہیں۔ بچے کی مزے کی نیند کو بے مقصد خراب نہیں کرنا چاہیے اور اُسے خواہ مخواہ ادھر ادھر نہیں لے جانا چاہیے۔ ایسی حرکتیں بچے کے آرام کو برباد کر دیتی ہیں اور اس کے اعصاب کو متاثر کرتی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو ممکن ہے بچے میں تند مزاجی، کج خلقی، پٹر پٹر اپن اور اضطراب پیدا ہو جائے۔

زیادہ شور و غل سے اور ادھر ادھر لے جائے جانے سے نومولود نفرت کرتا ہے۔ البتہ وہ ہلنے چلنے کا غنا لطف نہیں ہے۔ اسے اچھا لگتا ہے کہ ماں کی گود میں یا گہوارے میں اسے حرکت دی جائے۔ ہلنے چلنے سے وہ سکون محسوس کرتا ہے اور اس کا دل خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ حرکت اسی امر کی علامت ہے کہ کوئی اُس کے قریب موجود ہے اور اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ جب کہ خاموشی اور بے حرکتی تنہائی کی نشانی ہے علاوہ ازیں عالم جنین میں بچہ ماں کے گہوارہ شکم میں حرکت کرتا رہا ہے اسی وجہ سے اگلے مرحلے میں بھی وہ

چاہتا ہے کہ ویسی ہی کیفیت جاری رہے۔ بچہ مال کی پیاری اور میٹھی لوریوں سے بھی احساس راحت کرتا ہے۔

بچے کی زندگی کا پہلا سال اس کے پٹھوں اور اعضاء کی مشق کا سال ہے۔ بچہ پسند کرتا ہے کہ آزادانہ حرکت کرے اور اپنے ہاتھ پاؤں ہر سے نومو لو د کا لباس نرم اور کھلا ہونا چاہیے۔ بچے کو تندرستہ کپڑوں میں کس باندھ دینے سے اس کی آزادی حرکت جاتی رہتی ہے اور اس سے اس کے اعصاب پر اثر پڑتا ہے جس بچے کی آزادی پھین لی جائے اس کے پاس رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا لہذا وہ داد و فریاد کرتا رہتا ہے اور اعصاب کی ہی بے آرامی ممکن ہے تند مزاجی اور شدید غصیلے پن کا مقدمہ بن جائے۔



زندگی کا حساس ترین دور

زندگی کا حساس اور اہم ترین دور بچپن کا زمانہ ہے۔ ہر فرد کی ائمندہ شخصیت کی بنیاد اسی زمانے میں پڑتی ہے اور ایک خاص شکل و صورت اختیار کرتی ہے کوئی چھوٹا سا انحراف یا سہل انگاری ممکن ہے بچے کی ائمندہ کی شخصیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دے۔ بالخصوص زندگی کے ابتدائی تین سالوں میں کہ جو بہت ہی حساس اور اہم دور ہوتا ہے۔ شاید سب لوگ یا اکثر لوگ بچے کی شیرخوارگی کے زمانے سے بالکل غافل ہوتے ہیں اور اس کی اہمیت کے بالکل قائل نہیں ہوتے کہتے ہیں۔

بچے خصوصاً نو مولود کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔ نہ کوئی بات کر سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے۔ اتنا بے بس ہوتا ہے کہ اپنے پیشاب پاخانے پر اس کا بس نہیں چلتا۔ اس میں تعلیم و تربیت کی کیا قابلیت ہوگی۔

یہ سمجھ کر بچپن کا زمانہ بالکل بے توجہی کے سپرد کر دیا جاتا ہے جس مسئلہ کے بارے میں بہت بڑا اشتباہ کیا جاتا ہے۔ وہ یہی بچے کی ابتدائی زندگی ہے کہ جو اس کا انتہائی اہم اور حساس زمانہ ہوتا ہے۔ اسی بظاہر سادہ سے زمانے میں بچہ شکل اختیار کرتا ہے۔ اور اس کی اخلاقی، معاشرتی اور دینی شخصیت کی بنیاد پڑتی ہے۔

اس ابتدائی تین سال کے عرصے میں بچہ سینکڑوں الفاظ یاد کرتا ہے ان کے معانی سے آشنا ہوتا ہے۔ اچھائی بُرائی، دوستی دشمنی، محبت نفرت، خوبصورتی و بد صورتی، چھوٹے بڑے، مختلف رنگوں، مختلف فالتوں اور اس طرح کی بہت سی چیزوں کو خوب سمجھنے لگتا ہے۔

دیکھنے، سننے اور بولنے کا انداز سیکھتا ہے، سوچنے کے انداز سے آشنا ہوتا ہے۔ گھنٹوں کے بل چلنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، رونے، ہنسنے جیسے دسیوں کام یا کوتراسے۔ چیزیں اور لوگوں کو پہچاننے لگتا ہے اور ان میں فرق کرتے لگتا ہے۔ دسیوں نئی نئی چیزیں سیکھتا ہے اور ان کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان تین سال کی مدت میں ہزاروں اچھے بُرے واقعات بچے کی حساس اور لطیف روح پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی آئندہ کی روش کا تعین کرتے ہیں۔

اس سب کے باوجود بہت ہی کم کوئی ایسا شخص ہوتا ہے کہ جسے اپنی زندگی کے ابتدائی تین سالوں میں سے کچھ یاد ہو اس دوران کے تمام واقعات پر فراموشی اور نسیان کا پردہ چھا جاتا ہے لیکن بچے کی طبیعت پر اثر باقی رہ جاتا ہے اور اس کی آئندہ کی زندگی ایک حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ بہت ساری نفسیاتی بیماریاں، خوف، اضطراب، غصہ اور ناامیدیاں اسی زمانے کے واقعات سے جنم لیتی ہیں۔

ایک ماہر نفسیات لکھتے ہیں :
 اگر بچے کی شخصیت زندگی کے ابتدائی سالوں میں مضبوط نہ ہو سکی تو اس میں آئندہ کی ذمہ داریوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی اور وہ مختلف نفسیاتی خرابیوں کا شکار ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے عموماً یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ بہت سی بنیادی نفسیاتی پریشانیوں کا سرچشمہ زندگی کے ابتدائی تین چار سال ہی ہوتے ہیں..... جب بھی کوئی ماہر نفسیات کسی اعصابی بیماری کے نفسیاتی اسباب کا تجزیہ و تحلیل کرتا ہے تو یہ بات سمجھتا ہے کہ اس شخص کی ابتدائی زندگی میں ایسے عوامل موجود تھے جو اب مشکلات سے اس کے فرار کرنے میں غیر معمولی طور پر موثر ہیں یہی
 ڈاکٹر جلدی لکھتے ہیں :

بچے کے معاشرتی چال چلن کی بنیاد زندگی کے پہلے سال ہی میں پڑ جاتی ہے۔
..... کی طرف میلان یا عدم میلان اسی زمانے میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

اس بنیاد پر ذمہ دار اور سمجھدار مال باپ اس حساس اور اہم دور کو عدم توجہی کا شکار نہیں ہونے دیتے اور بچے کی تربیت کو بعد کے زمانے پر متوی نہیں کر دیتے بلکہ تعلیم و تربیت آغاز ولادت ہی سے کر دیتے ہیں۔

بعض دانشور کہتے ہیں :

بچے کی تربیت ولادت ہی سے شروع ہو جاتی ہے بڑے یا بچے ان سے جو برتاؤ کرتے ہیں اور جیسی توجہ انہیں دیتے ہیں وہی ان کی پہلی تربیت قرار پاتی ہے۔ اسی طرح وہ مناظر جنہیں بچہ دیکھتا ہے اور وہ آوازیں جنہیں وہ سنتا ہے، یہ سب ہی تمام وہ تاثیرات جو اس کے ذریعے سے اس کے اعصاب اور ذہن پر مرتب ہوتی ہیں اس کی طرز تربیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بہت سی معلومات اور تجربات جو بچے کی عادات کی تشکیل اور اس کے مستقبل کے اخلاق کی تعمیر میں اثر انداز ہوتے ہیں وہ ابتدائی زندگی ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ ابتدائے ولادت سے بڑے جو سلوک بچوں کے ساتھ روار کھتے ہیں یہ ان کی معلومات اور تجربات میں سچی طور پر موثر ہوتا ہے اور تربیت و تعلیم کے عوامل میں سے شمار ہوتا ہے۔
رسل رقم طراز ہے :

تربیت اخلاق کے لیے صحیح اور مناسب موقع لحظہ تولد ہے کیونکہ یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ جب بالوی کے بغیر تربیت کا عمل شروع کیا جاسکتا ہے۔ اگر تربیت اس دور کے بعد شروع کی گئی تو پھر مخالفت عادات کے ساتھ بھی نبرد آزمائی کرنا پڑے گی۔

۱۔ رواں شاہی کو دک، ص ۲۰۲

۲۔ علم النفس التربوی، ص ۱۹

۳۔ تربیت، ص ۷۹

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بیٹے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا :
 انما قلب الحديث كالارض الخالية ما التقى فيها من شئ
 قبلته ، فبادرتك بالقلب قبل ان يعسوق قلبك ويشتغل
 بئذ -

بچے کا دل خالی زمین کی مانند ہوتا ہے جو چیز بھی اس میں ڈالی جائے اسے قبول
 کر لیتا ہے۔ اسی لیے اس سے پہلے کہ تمہارا دل سخت اور مشغول ہو جائے میں
 نے تمہیں موڈ بنانے کے لیے قدم اٹھایا ہے۔

نومولود اور اخلاقی تربیت

جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو بہت کمزور ہوتا ہے۔ عقل بالقوت رکھتا ہے مگر کچھ چیز سمجھتا نہیں، فکر اور سوچ بچار نہیں کرتا، آنکھ سے دیکھتا ہے لیکن کسی چیز کو پہچانتا نہیں۔ رنگوں اور شکلوں کو مشخص نہیں کر پاتا، دوری اور نزدیکی، بزرگی اور چھین کو نہیں سمجھتا۔ آوازیں سنتا ہے لیکن ان کے معانی اور خصوصیات اس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور یہی حالت اس کے تمام حواس کی ہے مگر وہ سمجھنے اور کمال تک پہنچنے کی قوت و استعداد رکھتا ہے تدرباً تجاربوں سے گزرتا ہے سادہ چیزوں کو سمجھنے لگتا ہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ أَخَذَ جَعْلَكُمْ مِنْ بُطُونٍ أَمْهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ
شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمْ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُونَ ۝

اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس عالم میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمہیں کان، آنکھیں اور دل عطا کیا شاید کہ تم شکر گزار ہو جاؤ۔
سورہ نعل - آیہ ۷۸

بچے کی زیادہ تر مصروفیات یہ ہیں کہ وہ کھاتا ہے، سوتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے روتا ہے اور پیشاب کرتا ہے۔ چند ہفتوں تک وہ ان کاموں کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا نومولود کے ابتدائی کام اگرچہ بہت سادہ سے اور چند ایک ہیں لیکن انہیں کے ذریعے سے بچہ دوسرے لوگوں سے ارتباط پیدا کرتا ہے، تجربے کرتا ہے، عادتیں اپناتا ہے اور علم حاصل

کرتا ہے۔ یہی رابطہ اور تجربے ہیں کہ جی سے بچے کی آئندہ کی اخلاقی اور معاشرتی شخصیت کی بنیاد پڑتی ہے اور وہ تشکیل پاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:
 اَلَّذِي يَمُرُّ تَوْجِنًا السَّكِينَةُ اَلْكَاثِبَةُ
 جوں جوں دن گزرتے ہیں بھید کھلتے ہیں۔

بچہ ایک کمزور معاشرتی فرد ہے کہ جو دوسروں کی مدد کے بغیر نہ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ زندگی بسر کر سکتا ہے اگر دوسرے اس کی مدد کو نہ لیں اور اس کی احتیاجات کو پورا نہ کریں تو وہ مر جائے گا۔ نومولود کی جسمانی صحت اور پرورش جن کے ذمے ہوتی ہے اُس کی اخلاقی، اجتماعی میان تک کہ دینی تربیت اور رشد بھی انہیں سے وابستہ ہے

سمجھدار اور احساس ذمہ داری کرنے والے ماں باپ اپنے صبح اور سوچے سمجھے طرز عمل سے نومولود کی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں اور اس کے جسم و روح کی پرورش کے لیے بہترین ماحول فراہم کر سکتے ہیں اور اس کی احساس اور بے آلائش روح میں پاکیزہ اخلاق اور نیک عادات پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک نادان تربیت کرنے والا اپنے غلط طرز عمل اور اشتباہ سے ایک نومولود کے پاک اور بے آلائش نفس میں بُرے اخلاق اور ناپسندیدہ عادات پیدا کر سکتا ہے۔

نومولود کو جھوک لگتی ہے اور اسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنی ضرورت کا احساس کرتا ہے اور وہ ایک بڑی قوت کی طرف توجہ کرتا ہے کہ جو اُس کی ضروریات کو برطرف کر سکتی ہو۔ اسی لیے وہ روتا ہے، شور مچاتا ہے تاکہ اس کی فریاد کو پہنچا جائے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے اگر بچے کی داخلی خواہشات کی طرف پوری توجہ کی جائے اور ایک صحیح پروگرام ترتیب دیا جائے، اُسے معین مواقع پر اور ضروری مقدار میں دودھ دیا جائے تو وہ آرام محسوس کرتا ہے مطمئن ہو کر سوتا ہے اور معین اوقات پر جب اُسے جھوک لگتی ہے

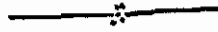
تو بیدار ہوتا ہے۔ پھر دودھ پیتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔ ایسے بچے کے اعصاب آرام و راحت سے رہتے ہیں۔ اسے اضطراب اور بے چینی نہیں ہوتی، اسے زندگی میں اچھے اخلاق، صبر اور نظم و ضبط کی عادت پڑ جاتی ہے اس کی حساس روح میں دوسروں پر اعتماد اور حسن ظن کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ نوموذ زندگی کے اس مرحلے میں کہ جب وہ کسی کو نہیں پہچانتا فطری طور پر دو امور کی طرف توجہ رکھتا ہے۔ ایک اپنی ناتوانی اور نیاز مندی کا اسے پورا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف ایک بڑی اور مطلق قوت کی طرف توجہ رکھتا ہے کہ جو تمام احتیاجات کے لئے ملجا و پناہ گاہ ہے اسی سبب سے روتا ہے اور اس برتر قوت کو مدد کے لیے پکارتا ہے کہ جسے وہ پہچانتا نہیں اور وہ غیبی قوت سب اہل جہان کو پیدا کرنے والی ہے بچہ اپنے ضعف و ناتوانی کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک بے نیاز طاقت سے وابستہ اور متعلق سمجھتا ہے۔ اگر یہ احساس تعلق آرام کے ساتھ بخوبی بندھا رہے تو بچے کے دل میں ایمان اور روحانی سکون کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

”رونے پر بچوں کو نہ مانا دیکھ ان کی ضروریات کو پورا کرنا۔ کیوں کہ چار ماہ تک بچے کا رونا پروردگار عالم کے وجود اور اس کی وحدانیت پر گواہی دیتا ہے۔“

چار ماہ پورے ہونے سے پہلے نوموذ ابھی ایک معاشرتی وجود نہیں بنا ہوتا کسی کو نہیں پہچانتا۔ حتیٰ اپنی ماں اور دوسروں میں فرق نہیں کرتا۔ اور ماؤں کے بقول وہ دوری نہیں کرتا یہی چار ماہ ہیں کہ بچہ بس ایک ہی ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جو بچہ ماں کی غفلت اور شستی کی وجہ سے صبح اور منظم توجہ اور غذا سے محروم ہو جاتا ہے۔ ناچار گاہ بگاہ روتا ہے اور شور کرتا ہے تاکہ کوئی اس کی مدد کو پہنچے۔ ایسے بچے کے

اعصاب اور ذہن ہمیشہ مضطرب اور دگر گولی رہتے ہیں اور اسے آرام نہیں ملتا۔ آہستہ آہستہ وہ پردہ چڑا اور تند خو ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر بے اعتدالی اور پریشانی کی حس پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک نامنظم اور ڈھیٹ وجود بن جاتا ہے۔



نومولود اور دینی تربیت

یہ صیح ہے کہ نومولود الفاظ اور جملے نہیں سمجھتا مناظر اور شکلوں کی خصوصیات کو پہچان نہیں سکتا۔ لیکن آوازوں کو سنا ہے اور اس کے اعصاب اور ذہن اس سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح سے مناظر اور شکلوں کو دیکھتا ہے اور اس کے اعصاب اس سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ لہذا اس بنا پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دیکھی جانے والی اور سنی جانے والی چیزیں نومولود پر اثر نہیں کرتیں اور وہ ان کے بارے میں بالکل ہاتھ پٹہ نہیں لگاتا ہے۔ نومولود اگرچہ جملوں کے معانی نہیں سمجھتا لیکن یہ جملے اس کی احساس اور ظرف روح پر نقش پیدا کرتے ہیں بچہ قدرتناں جملوں سے آشنا ہو جاتا ہے اور یہی آشنائی ممکن ہے اس کے آئندہ کے لیے مؤثر ہو۔ جس لفظ سے ہم زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس کے معنی کو بہتر سمجھتے ہیں۔ نا آشنا افراد کی نسبت آشنا افراد کو ہم زیادہ پسند کرتے ہیں ایک بچہ ہے کہ جو دینی ماحول میں پرورش پاتا ہے، سیکنگٹوں مرتبہ اس نے تلاوت قرآن کی دلربا آواز سنی ہے، اللہ کا خوبصورت لفظ اس کے کانوں سے ٹکرایا ہے اور اس نے اپنی آنکھوں سے بار بار ماں باپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ دوسری طرف ایک نومولود ہے کہ اس نے بڑے اور بے دین ماحول میں پرورش پائی ہے، اس کے کانوں نے غلیظ اور گندے گانے سنے ہیں اور اس کی آنکھیں فحش مناظر دیکھنے کی عادی ہو گئی ہیں یہ دونوں بچے ایک جیسے نہیں ہیں۔

سمجھدار اور ذمہ دار ماں باپ اپنے بچوں کی تربیت کے لیے کسی موقع کو ضائع نہیں کرتے یہاں تک کہ اچھی آوازیں اور اچھے مناظر سے انہیں مانوس کرنے سے بھی غفلت

نہیں کرتے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس حساس تربیتی نقطے کو نظر انداز نہیں کیا اور اپنے پیروکاروں کو حکم دیا ہے کہ جو نئی بچہ دنیا میں آئے اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

”جس کے ہاں بھی بچہ ہوا ہے چاہیے کہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہے تاکہ وہ شر شیطان سے محفوظ رہے۔ آپ نے امام حسینؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں بھی اسی حکم پر عمل کرنے کے لیے کہا۔ علاوہ ازیں حکم دیا کہ ان کے کانوں میں سورہ حمد، آیۃ الکرسی، سورہ شہر کی آخری آیات، سورہ اخلاق، سورہ والناس اور سورہ والفلق پڑھیں جائیں۔ بعض احادیث میں آیا ہے:

خود رسول اللہ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے کان میں اذان و اقامت کہی۔

ہاں!

رسول اسلام جانتے تھے کہ نومولود اذان، اقامت اور قرآنی الفاظ کے معانی نہیں سمجھتا لیکن یہی الفاظ بچے کے ظریف اور لطیف اعصاب پر جو اثر مرتب کرتے ہیں آپ نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نکتے کی طرف توجہ تھی کہ یہ بچے بچے کی روح اور نفسیات پر نقش مرتب کرتے ہیں اور اسے ان سے مانوس کرتے ہیں۔ اور الفاظ سے یہ مانوسیت بے اثر نہیں رہے گی۔ علاوہ ازیں ممکن ہے کہ اس تاکید حکم کے لیے رسولؐ کے پیش نظر کوئی اور بات ہو شاید وہ چاہتے ہوں کہ ماں باپ کو متوجہ کریں کہ بچے کی تعلیم

تربیت کے بارے میں سہل انگاری درست نہیں ہے اور اس مقصد کے لیے ہر ذریعے اور ہر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے جب ایک باشعور مربی نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہتا ہے تو گویا اس کے مستقبل کے لئے واضح طور پر اعلان کرتا ہے اور اپنے پیارے بچے کو خدا پرستوں کے گروہ سے متعلق کر دیتا ہے۔

بچے پر ہونے والے اثر کا تعلق صرف سماعت سے متعلق نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جو چیز بھی بچے کے حواس، ذہن اور اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے اس کی آئندہ کی زندگی سے لا تعلق نہیں ہوتی مثلاً جو نومولود کوئی بے حیائی کا کام دیکھتا ہے اگرچہ اسے سمجھ نہیں پاتا لیکن اس کی روح اور نفسیت پر اس بڑے کام کا اثر ہوتا ہے اور یہی ایک چھوٹا کام ممکن ہے اس کے انحراف کی بنیاد بن جائے۔ اسی لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

”گوارہ میں موجود بچہ اگر دیکھ رہا ہو تو مرد کو نہیں چاہیے کہ اپنی بیوی سے مباشرت کرے“

احساس وابستگی

نومولود بہت کمزور سادہ وجود ہے جو دوسروں کی مدد کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے نہ پرورش پاسکتا ہے نومولود ایسا محتاج وجود ہے جس کی ضروریات دوسرے پوری کرتے ہیں۔ جب وہ رجم مادر میں تھا تو اُسے نرم و گرم جگہ میسر تھی۔ وہاں اس کی غذا اور حرارت کی احتیاج ماں کے ذریعے پوری ہو رہی تھی۔ وہ چین سے ایک گوشے میں پڑا تھا اور اپنی ضروریات کے لیے بالکل بے فکر تھا۔ اب جب کہ وہ دنیا میں آیا ہے تو احساسِ نیاز کرتا ہے۔ بچے کا پہلا پہلا احساس شاید سردی کے بارے میں ہوتا ہے اور اس کے بعد بھوک کے بارے میں۔ اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ حرارت اور غذا کے لیے وہ دوسرے کا محتاج ہے۔ اس مرحلے میں وہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ اپنی ضروریات کو فطرتاً سمجھتا ہے اور ایک انجانی قدرتِ مطلقہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اپنے تئیں اس قدرتِ مطلقہ سے منسلک سمجھتا ہے۔ اسے انتظار ہوتا ہے وہ قدرت اس کی ضروریات پورا کرے گی۔ پھر زندگی کی ابتدا ہی میں کسی سے وابستگی کا احساس کرتا ہے اور یہ احساس زندگی کے تمام مراحل میں اس کے ساتھ رہتا ہے۔ بھوک یا پیاس لگے تو دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے رقتا ہے۔ ماں کے سینے سے چمٹ جاتا ہے اور اس کی جھٹول اور لوریلوں سے سکون محسوس کرتا ہے۔ اگر اُسے کوئی تکلیف ہو یا کسی خطرے کا احساس کرے تو ماں کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔

یہی وابستگی اور احساسِ ضرورت ہے جو بعد میں دوسرے لوگوں کی تقلید کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی وابستگی ہے۔ پھر اپنے اخلاق اور طرزِ عمل کو اپنے

اور گرد والوں کے اخلاق اور طرز عمل کے مطابق ڈھلتا ہے۔ یہی احساس تعلق ہے جو بعد ازاں کھیلوں اور دوسرے مل جل کر کام کرنے اور دوست بنانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ بچوں سے الفت و محبت کا سرچشمہ بھی یہی احساس ہے اجتماعی زندگی کی طرف میلان، باہمی تعاون اور مل جل کر کام کرنے کا مزاج بھی اسی احساس سے تشکیل پاتا ہے۔ احساس وابستگی کو کوئی معمولی سی چیز نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ بچے کی اخلاقی اور سماجی تربیت اور اس کی تکمیل شخصیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اگر اس احساس وابستگی و تعلق کی صحیح طور پر راہنمائی کی جائے تو بچہ آرام و سکون محسوس کرتا ہے۔ وہ پُر اعتماد اور خوش مزاج ہو جاتا ہے۔ اچھی امید اور نیکوئی کی کیفیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے بارے میں اس میں حزن ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح معاشرتی زندگی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ دوسروں کو اچھا سمجھتا ہے اور ان سے تعاون کی امید رکھتا ہے۔ جب معاشرے کے بارے میں اس کی رائے اچھی ہوگی تو اس سے تعاون بھی کرے گا اور اس کے لیے ایثار بھی کرے گا۔ معاشرے کے لوگ بھی جب اسے اپنا خیر خواہ اور خدمت گزار سمجھیں گے تو وہ بھی اس سے اظہار محبت کریں گے۔

اس کے برعکس اگر یہ گراں بہا احساس کھٹکا جائے اور اس سے صحیح طور پر استفادہ نہ کیا جائے تو خذلانے جو صحیح راستہ بچے کے لیے مقرر کیا ہے اس کی اجتماعی زندگی اس سے بھٹک جائے گی۔ باہرین نفیات کا نظریہ ہے کہ بہت سے مواقع پر خوف، اضطراب، بے اعتمادی، بدگمانی، شرمندگی، گوشہ نشینی، فردگی اور پریشانی یہاں تک کہ خودکشی اور جراثیم کی بنیاد پھین میں پیش آنے والے واقعات ہوتے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچے کے احساس وابستگی کو صحیح طرح سے مطمئن کریں تو ہمیشہ اس کے مددگار رہیں۔ جب اسے جھوک لگے تو غذا دیں اور اس کے لیے آرام و راحت کا سامان فراہم کریں۔ اگر اسے درد ہو یا کوئی اور تکلیف پیش آئے تو فوراً اس کی داد سہی کریں۔ اس کی نیند اور خوراک کو منظم رکھیں۔ اس طرح سے کہ اسے بالکل پریشانی نہ ہو اور وہ آرام کا احساس کرے۔

نومولود کو بار پیٹ نہ کریں۔ نومولود کچھ نہیں پہچانتا۔ اسے صرف اپنی ضرورت کا احساس

ہوتا ہے اور ایک انجانی قدرت پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ رونے کی زبان سے اس کی پناہ حاصل کرتا ہے اور اپنی احتیاج کا اظہار کرتا ہے۔ بلڈ پیٹ کے ذریعے اسے یالوس اور بلڈٹن نہ کریں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”بچوں کو رونے پر ماننا نہ چاہیے کیونکہ چار ماہ تک اپنے اس رونے کے ذریعے وہ اللہ اور اس کی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔“

ہر حال میں بچے کے مددگار ہیں اگر وہ کوئی کام انجام دینا چاہتا ہے اور آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے تو بھی اس سے نوازش و محبت سے پیش آئیں۔ اگر بچہ پریشان ہو اور وہ ناراضی محسوس کرتا ہو تو اس پریشانی کے اسباب ختم کریں اور اس کو مطمئن کریں اسے ہرگز ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں۔ اصرار نہ کریں کہ میں یہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں کیونکہ یہی ڈانٹ ڈپٹ ممکن ہے اس کی روح پر بڑا اثر کرے اور اسے پریشان کر دے۔ بچہ چاہتا ہے کہ وہ ماں باپ اور دوسروں کو محبوب ہو۔ اگر ماں باپ اس سے محبت نہ کریں تو وہ اس پر سخت پریشان ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ ان کا پیارا اور محبت ہمیشہ باقی رہے۔ بعض ماں باپ بچے کے اس جذبے سے استفادہ کرتے ہیں اور بچے کو ڈانٹتے ہیں کہ اگر تو نے یہ کام نہ کیا تو ہم تم سے پیار نہیں کریں گے لیکن آپ کو چاہیے کہ اس حربے کو استعمال نہ کریں۔ کیونکہ اس طرح کی ڈانٹ ممکن ہے تدریجاً بچے کی روح پر بڑے اثرات مرتب کرے اور اس سے اس کا اعتماد ادا آرام جاتا رہے اور یہ بچے کے ضعیف اعصاب اور داخلی اضطراب کا سبب بن جائے۔ اگر وہ رو رہا ہو یا شور کر رہا ہو تو وہ یہ نہیں چاہ رہا ہوتا کہ آپ کو بے آرام کرے بلکہ وہ آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہ رہا ہوتا ہے تاکہ آپ اس کی بات سنیں۔ آپ صبر اور سجداری کے ساتھ اس کی بے آراغی کی وجہ سمجھیں اور اس بے آراغی کو دور کریں۔ تاکہ اسے آرام ملے۔ اگر آپ اسے رونے پر ڈانٹیں گے یا ماریں گے تو ممکن ہے وہ خاموش ہو جائے۔ لیکن کیسے خاموش ہو ایک اضطراب آمیز

باورمانہ خاموشی کو جو بہت خطرناک ہے جو ممکن ہے اس کے مستقبل کو دگرگوں کر دے۔ ماں باپ کی موجودگی سے کچھ ہمیشہ خوش رہتا ہے اور ان کی جدائی سے وحشت کھاتا ہے۔ آپ کبھی اپنی موت کے بارے میں اُس سے بات نہ کریں کیونکہ یہ اس کی پریشانی اور وحشت کا سبب ہوگی۔ اگر آپ بیمار ہو جائیں تو موت کا ذکر نہ کریں۔ بلکہ اپنے بچوں کو پر امید رکھیں اور ان کا حوصلہ بڑھائیں اگر آپ ایک عرصے کے لیے بچوں سے دور ہونے پر مجبور ہوں تو پہلے انہیں اس پر آمادہ کریں۔ ان کا دل بڑھائیں پھر سفر اختیار کریں اور اس کے بعد بھی ہمیشہ ان سے رابطہ برقرار رکھیں اور نامہ و پیام کے ذریعے سے ان کی ڈھارس بندھاتے رہیں۔

اگر آپ کا بچہ بیمار ہو جائے تو دوا کھلانے کے لیے اسے موت سے اور اچھا نہ ہونے سے نہ ڈرائیں۔ بلکہ ایسے مواقع پر تشویش کی راہ اختیار کریں اور اسے صحیح ہو جانے کی امید دلائیں۔ یہاں تک کہ اسے اگر کوئی خطرناک بیماری ہو تو اپنی پریشانی اور اضطراب کو اس سے چھپائے رکھیں۔ مختصر یہ کہ پوری عمر اپنے بچوں سے ایسا سلوک رکھیں کہ وہ آپ کو اپنا بہترین ٹکسار اور غمخوار سمجھیں۔

البتہ اس بات کا خیال رہے کہ بچے سے اظہار محبت ضروری حد تک اور ضروری مقامات پر ہونا چاہیے۔ اس طرح سے کہ وہ لاڈ پیار سے بگڑ نہ جائے اور خود اعتمادی سے محروم نہ ہو جائے۔ جہاں بچہ واقعی کوئی کام نہ کر سکتا ہو اس کی مدد کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ ایک کام خود کر سکتا ہے اور اسے مدد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ دوسروں پر رعب جمانے کے لیے شہر کر رہا ہو تو اس کی طرف اعتناء نہیں کرنا چاہیے۔

رسل لکھتا ہے:

اگر بچہ کسی وجہ اور واضح علت کے بغیر روئے قرأ سے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور وہ جتنا چلتا سکے اسے چلانے دیں۔ ایسے مواقع پر اگر کوئی اور روش اپنائی گئی تو وہ جلد ہی ایک جابر حاکم کی صورت اختیار کر لے گا

ایسے مواقع کہ جہاں ضرورت ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے وہاں بھی افراط
 سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ حسب ضرورت طرز عمل اپنانا چاہیے اور زیادہ ہی
 اظہار محبت نہیں کرنا چاہیے۔

جب بچہ باہر کی دنیا کو دیکھنے لگتا ہے

بچہ ایک چھوٹا سا انسان ہوتا ہے اور انسان مدنی بالطبع ہے۔ مدد اور تعاون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ زندگی گزار سکتا ہے۔ دوسروں کی طرف توجہ رکھتا ہے ان سے استفادہ کرتا ہے اور انہیں فائدہ پہنچاتا ہے۔ لیکن نومولود اپنی زندگی کے ابتدائی مہینوں میں کسی کو نہیں پہچانتا اور دوسروں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ یعنی اجتماعی مزاج ابھی اس میں ظاہر نہیں ہوا ہوتا۔ جب تقریباً چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ مدنی بالطبع ہونے کے آثار اس میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے سے خارجی دنیا اور اپنے ارد گرد کے موجودات کی طرف توجہ کرتا ہے وہ ماں کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہتا ہے۔ ماں کی حرکات پر اپنا رد عمل ظاہر کرتا ہے مسکراہٹ کے جواب میں مسکراتا ہے اور اس کی ابروؤں کے جواب میں اپنی ابروؤں کو حرکت دیتا ہے۔ بچوں کے کھیل کو حیرت سے دیکھتا ہے، اٹھکیلیاں کرتا ہے اور مسکراتا ہے دوسروں کے جذبات کو محسوس کرتا ہے، غصے اور تبسم میں فرق محسوس کرتا ہے۔ ڈانٹ اور محبت کا مختلف جواب دیتا ہے۔ ڈانٹ اور غصے پر اپنے تیش چھپے کھینچ لیتا ہے۔ خوش و خرم چہرے اور محبت آمیز آواز ہو تو ہلکے ہلکے کر قریب آتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے بٹھایا جائے تاکہ دنیا کو اپنے سامنے دیکھے۔

جب بچہ اس مرحلے میں پہنچ جائے تو ماں باپ کو توجہ رکھنا چاہیے کہ بچے میں اجتماعی احساسات پیدا ہو چکے ہیں اور وہ اب خاندان کا ایک باقاعدہ حصہ بن گیا ہے۔ دوسروں کی طرف توجہ رکھتا ہے اور ان کے جذبات کو کسی حد تک محسوس کرتا ہے۔ اب نہیں چاہیے کہ اسے بے شمار

اور لائق سمجھا جائے اور اس سے لائق رہا جائے۔ ان چار ماہ کی مدت میں اس نے تجربے کیے ہیں اور چیزوں کو یاد کیا ہے۔ وہ اب خارجی دنیا کو دیکھنے والا اور اجتماعی وجود رکھنے والا انسان ہے۔ یہ احساس اگرچہ بہت سادہ اور باریک سادہ ہے۔ لیکن یہ اس کی آئندہ کی مستقل اجتماعی زندگی کا اُنق ہے۔ اگر ماں باپ اپنے بچے کے اس نئے احساس کو پہچانیں اور سوچ سمجھ کر عقلی بنیادوں پر اس کی تکمیل کی کوشش کریں تو وہ ایک اجتماعی شعور رکھنے والا مفید انسان پیدا ہو سکتا ہے لیکن خارجی دنیا کا یہ احساس آہستہ آہستہ دب جاتا ہے۔ اور بچہ داخلی دنیا کی ہولناک وادی کی طرف لوٹ جاتا ہے اور یہ بذات خود نقصان دہ صفات میں سے ہے۔ اسی صفت کی وجہ سے انسان گوشہ نشینی پسند کرنے لگتا ہے اور خود بین ہو جاتا ہے۔ معاشرے اور معاشرتی کاموں سے گریزاں ہو جاتا ہے دوسروں کے بارے میں بدگلیں ہو جاتا ہے اور احساس کتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ تعاون اور ہمدردی سے دُرتا ہے اور خوف کھاتا ہے۔

اس موقع پر ماں باپ کے سر پرچی ذمہ داریاں اُجاتی ہیں۔ انہیں چاہیے کہ بچے کو باشعور سمجھیں کہ جو اُن کے جذبات کو محسوس کرتا ہے اور ان کے کردار سے اثر قبول کرتا ہے۔ بچے کو بھول نہیں جانا چاہیے اور ہمیشہ اُس کی طرف توجہ رکھنا چاہیے۔ اس سے مسکراتے ہونٹوں اور اندر خوش و خرم چہرے سے ملاقات کرنا چاہیے۔ اس سے محبت آمیز انداز سے بات کرنا چاہیے۔ پیادہ پرے انداز سے بوسہ لے کر اُس سے اظہار محبت کرنا چاہیے۔ ایک مہربان ماں اپنے سر اور گروں کی حرکت سے، اپنے چشم دُآبرو کے اشارے سے، اپنی میٹھی مسکراہٹ سے اور اپنی محبت آمیز لگنگ ہٹ سے بچے کی حس اجتماعی کو تقویت پہنچا سکتی ہے۔ اور اُسے خارجی دنیا کی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ کھیلنے کی اچھی اچھی اور سب چیزوں کے ذریعے اُسے خارجی دنیا کی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے۔

بچے کی اندرونی خواہشات، اگر ٹھیک طریقے سے پوری کر دی جائیں تو وہ آرام اور سکون محسوس کرتا ہے، دوسروں کے بارے میں خوش بین ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو خیر خواہ، مہربان اور ہمدرد سمجھتا ہے۔ جب معاشرہ اُس سے اچھا سلوک کرتا ہے اور اس کی اندرونی خواہشات کا مثبت جواب دیتا ہے تو بچہ بھی اس سے خوش بین اور مانوس ہو جاتا ہے۔ اس طرح کا

طرز فکر بچے کی روح اور جسم پر اچھے اثرات مرتب کرتا ہے اور اس کی آئندہ زندگی کے لیے اچھی بنیاد بنتا ہے اچھے ماں اور باپ بچے کو مارتے نہیں، ترش ٹوٹی سے پیش نہیں آتے اور اس کی زندگی کو تلخ نہیں بناتے کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا احتجاج رویہ بچے پر روحانی اور نفسی اعتبار سے بڑے اثرات مرتب کرتا ہے اور اس کے جذبات اور پاک احساسات کو مجروح کر دیتا ہے اور اس کی شکستگی کا باعث بنتا ہے۔ اسی غیر عاقلانہ طرز عمل کا نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ بچہ ڈرپوک، احساس کمتری کا شکار، گوشہ نشین، بدبین اور دل گرفتہ ہو جاتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
اپنی اولاد کا احترام کرو اور ان کی اچھی تربیت کرو تاکہ اللہ تمہیں بخش دے۔

محبت

انسان محبت کا پیاسا ہے۔ محبت دلوں کو زندگی بخشتی ہے۔ جو اپنے آپ کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے اس سے محبت کریں، محبوبیت کا یہ احساس اس کے دل کو شاد کر دیتا ہے۔ جسے یہ معلوم ہو کہ اُسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا وہ اس پر آشوب زندگی میں اپنے آپ کو تنہا اور بے کس سمجھتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہمیشہ افسردہ اور پژمردہ رہتا ہے۔ بچہ بھی ایک چھوٹا انسان ہے اور اسے بڑوں کی نسبت محبت کی زیادہ ضرورت ہے۔ جیسے اُسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اسے پیارا اور محبت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ یہ نہیں سمجھتا کہ محل میں زندگی گزار رہا ہے یا جھونپڑی میں۔ البتہ یہ خوب سمجھتا ہے کہ دوسرا اس سے محبت کرتے ہیں یا نہیں۔ اس احساس محبت سے وہ آرام و سکون کے ساتھ اپنی نشوونما کے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے اور انسانیت کی بلند صفات حاصل کر سکتا ہے۔ اچھے اخلاق کا سرچشمہ محبت ہے۔ محبت کے پرتوں میں بچے کے جذبات اور احساسات کو اچھے طریقے سے پروان چڑھایا جاسکتا ہے اور اسے ایک اچھا انسان بنایا جاسکتا ہے۔

جس بچے کو بھرپور محبت ملی ہو اس کی روح شاد اور دل پر نشاط ہوتا ہے۔ وہ احساسِ محرومی کا شکار ہو کر برا رد عمل ظاہر نہیں کرتا۔ خوش بین، خوش مزاج اور پر اعتماد ہوتا ہے۔ اس فطری نشوونما کی وجہ سے وہ نفسیاتی شکلات کا شکار نہیں ہوتا۔ خیر خواہ اور انسان دوست بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ محبت کے میٹھے پٹھے سے میراب ہوتا ہے لہذا چاہتا ہے کہ دوسروں کو بھی اس سے میراب کرے۔ وہ لوگوں سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسا اس سے کیا جاتا ہے۔

جو بچہ پیار محبت کے ماحول میں پرورش پاتا ہے وہ دورانِ بلوغت پیش آنے والی مشکلات اور جسمانی و نفسیاتی تبدیلیوں کا بہتر طور پر مقابلہ کر سکتا ہے۔

جس بڑی کو ماں باپ سے محبت ملی ہو اور اس کا گھر ماحولِ محبت سے معمور ہو وہ جوانی میں بے کسی اور محرومی کا احساس نہیں کرتی۔ وہ کسی خود غرضی کے یا کسی چنچل محبت آمیز جیسے سن کر اپنے تئیں اس کے سپرد کر کے اپنا مستقبل تباہ نہیں کر دیتی۔ جس نوجوان نے پیار اور محبت کے ماحول میں پرورش پائی ہو وہ احساسِ محرومی کا شکار نہیں ہوتا مگر اسے برائیوں، منیات اور شراب کے مراکز میں پناہ کی ضرورت پڑے۔

نفسیاتی نکتہ نظر سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ وہ بچے جنہیں خوب محبت ملی ہو ان بچوں کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار اور صبح و شام ہوتے ہیں جو پرورش گاہوں میں پلے ہوں۔ اگرچہ پرورش گاہوں میں پلنے والے بچے غذا اور حفظانِ صحت کے اعتبار سے اچھے ہوں۔

مگر جس نے جذبات سے عاری سرد ماحول میں پرورش پائی ہو اور ماں باپ کی مہر و محبت نہ دیکھی ہو اس شخص کی کیفیتِ امینانِ بخش اور فطری نہیں ہوگی۔ جس شخص نے محبت کا ذائقہ نہ چکھا ہو وہ اسے دوسروں پر کیسے تار کر سکتا ہے۔ ایسے محروم انسان سے انسان درستی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

جو بچہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہا ہو یا صحیح طریقے سے اس سے بہرہ مند نہ ہوا ہو وہ اپنے اندر احساسِ محرومی و کمتری کرتا ہے اور اس میں ہر طرح کے انحراف کی گنجائش ہوتی ہے۔ تند خوئی، غصہ، ڈھٹائی، بد بینی، جھوٹ، حسدیت، نا اُمیدی، افروغی، گوشہ نشینی، نا اُم آہنگی کی زیادہ تر وجہ محبت سے محرومی ہوتی ہے۔

جو محبت سے محروم رہا ہو سکتا ہے وہ چوری اور قتل میں ملوث ہو جائے تاکہ وہ اس معاشرے سے انتقام لے جو اسے پسند نہیں کرتا یا تاکہ ملن ہے وہ خودکشی کر لے تاکہ وہ وحشت اور تنہائی سے نجات حاصل کرے بہت سے چور اور مجرم ایسی ہی محرومیت کا شکار اور دگر فرقہ ہوتے ہیں۔ آپ اخبارات اور رسائل کو دیکھ سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کا حال پڑھ سکتے ہیں اور اس سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔

انجمن ملی حمایت بچکان کے شعبہ نفسیات کے سربراہ ڈاکٹر حسن احمدی نے پانچ سو مجلوں پر ایک تحقیق کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے افراد نے پہلا جرم ۱۲ سے ۱۳ سال کی عمر کے دوران کیا ہے اور اس کی وجہ خاندان میں محبت کی کمی سے مربوط ہے۔

انجمن ملی حمایت بچکان کے نفسیاتی دیکھ بھال کے شعبے کے سربراہ اور معروف ماہر نفسیات و عمرانیات کہتے ہیں:

”بہت سارے نفسیاتی مسائل کی بنیاد بچپن میں پڑی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ سب سے زیادہ ترین بچے کو جو مسئلہ پریشان کرتا ہے وہ اس کے جذبات کی تسکین کا معاملہ ہے۔“

..... اپنے خط میں لکھا ہے:

ایک چھوٹے سے قصبے میں، ایک غریب سے گھرانے میں میں نے آنکھ کھولی۔ میرے ماں باپ کے لیے میری اور میری دو بہنوں کی پرورش شکل تھی۔ میری دادی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ ان کی حالت ہم سے بہتر تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ میرے لیے اچھے کپڑے اور دیگر ضروری چیزیں مہیا کرتی تھی۔ لیکن یہ رنگارنگ دنیا میری اس تشنگی کو دور نہ کر سکی جو ماں باپ سے دوری کی وجہ سے محسوس ہوتی تھی۔ مجھے یوں لگتا جیسے مجھ سے کچھ کھو گیا ہو۔ کبھی کبھی دوسروں کی نظروں سے اوجھل میں پہرہاں روتا رہتا۔ میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ میرا باپ مجھے ملنے آیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر جانے کے لیے کہا۔ میں خوش ہو کر چلنے کو تیار ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سارا سال کا غم بلی بھر میں ختم ہو گیا ہے۔ میں ہر ماں باپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں اپنے بچوں کو اپنے آپ سے جدا نہ کریں۔ انہیں اس امر کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ ماں باپ سے دوری اور ان کی محبت سے

محرومی بچوں کے لیے نہایت سنگین اور تکلیف دہ ہے اس کی جگہ کوئی چیز بھی پر نہیں کر سکتی۔

..... اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

میں ماں باپ کے پیار سے محروم تھا۔ اس لیے میں ایک دل گرفتہ اور حاسد انسان ہوں۔ ڈروک بھی ہوں اور غصیلہ بھی۔ بچپن میں میں اسکول سے بھاگ جایا کرتا تھا۔ چھٹی جماعت تک مشکل سے پڑھ پایا ہوں۔

دین مقدس اسلام کہ جس کی تربیتی مسائل کی جانب پوری توجہ ہے، اس نے محبت کے بارے میں بہت تاکید کی ہے۔ قرآن اور حدیث میں اس ضمن میں بہت کچھ موجود ہے۔ نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

انسان کو اپنی اولاد سے جو شدید محبت ہوتی ہے اس کے باعث اللہ اپنے اس بندے کو مشمول رحمت قرار دے گا۔

خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

بچوں سے محبت بہترین عمل ہے کیونکہ ان کی خلقت کی بنیاد خدا پرستی اور توحید ہے۔ اگر وہ بچپن میں ہی مرجائیں تو بہشت میں داخل ہوں گے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بچوں سے پیار کرو اور ان پر مہربانی کرو۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اپنے بچوں کو خوب چومو کیونکہ ہر بوسے کے بدلے میں اللہ جنت میں تمہارا ایک درجہ بڑھا دے گا۔

۱۔ وسائل، ج ۱۵، ص ۹۸

۲۔ مستدرک، ج ۲، ص ۹۱۵

۳۔ بحار، ج ۱۰۴، ص ۹۲

۴۔ بحار، ج ۱۰۴، ص ۹۲

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا۔
 میں نے آج تک کسی بچے کا بوسہ نہیں لیا۔
 جب وہ شخص چلا گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:
 میری نظر میں یہ شخص روزِ قیامت سے ملے
 پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 جو بچوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کا احترام نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔
 حضرت علی علیہ السلام نے وصیت کرتے وقت فرمایا:
 بچوں پر مہربانی کرو اور بڑوں کا احترام کرو۔

۱۔ بکار، ج ۱۰، ص ۹۹

۲۔ بکار، ج ۱۰، ص ۱۳۷

۳۔ بکار، ج ۱۰، ص ۱۳۶

اظہار محبت

اولاد کی محبت ایک فطری امر ہے۔ شاید بہت کم ماں باپ ایسے ملیں جو اپنی اولاد کو دل سے عزیز نہ رکھتے ہوں۔ البتہ نری یہ دلی محبت بچے کی خواہشات کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہے۔ بچہ اس محبت کا ضرورت مند ہے جو ماں باپ کے طرزِ عمل سے ظاہر ہو۔ بچے سے پیار کیا جائے، اُس کا برسرِ لیا جائے، اُسے گود میں اٹھایا جائے، اس سے مسکرا کر پیش آیا جائے یہاں تک کہ ماں باپ جب اسے پیار بھری لوریاں سناتے ہیں تو وہ احساسِ محبت کرتا ہے۔ بچے کا دل چاہتا ہے کہ کبھی ماں باپ سے کھیلے اور اٹھکیلیاں کرے۔ اسے وہ محبت کی ایک علامت سمجھتا ہے۔ ان کے غصے، جھگڑے اور سختی کو بے مہری کی دلیل سمجھتا ہے۔ جب ماں باپ بچے کی طرف دیکھتے ہیں اور اس سے بات کرتے ہیں تو وہ اندازہ لگا لیتا ہے کہ اس سے پیار کرتے ہیں یا نہیں۔

بعض ماں باپ ایسے بھی ہیں کہ بچہ چھوٹا ہو تو اُس سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ لیکن جب بڑا ہو جائے تو اظہارِ محبت تدریجاً کم کر دیتے ہیں اور جب وہ لوجوان اور جوان ہو جاتا ہے تو اسے بالکل ترک کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں اب بڑا ہو گیا ہے اور اظہارِ محبت سے بگڑ جائے گا۔ اور دیسے بھی بڑا ہو کر کسی محبت اور نوازش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ بیاتمام عمر محبت کا محتاج رہتا ہے۔ ماں باپ کی محبت سے خوش ہوتا ہے اور ان کی بے مہری پر افسردہ ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر لوجوانی اور جوانی کی عمر کو جو نفسیاتی اعتبار سے ایک ہیجانی دور ہوتا ہے اس میں اسے ہر زمانے سے زیادہ ماں باپ کی ہمدردی مہربانی

اور دہلوی کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہ بے مہروں ہی کا نتیجہ ہے کہ بہت سے جوان خودکشی کر
 بیٹے ہیں۔ یا اپنے گھر، شہر اور ملک سے بھاگ جاتے ہیں۔ اس مقام پر غیر مناسب نہ ہوگا کہ ایک
 سولہ سالہ لڑکی کی ڈائری سے چند یادداشتیں آپ کی توجہ کے لیے پیش کی جائیں۔ بڑی کا نام نازنین
 ہے۔ لکھتی ہے۔

واقعاً جب میں اپنی امی اور ابو کے بارے سوچتی ہوں تو ہنسی ہوں اگرچہ ان کی
 کیفیت نہ صرف یہ کہہ سنے کے لائق نہیں بلکہ بہت ہی غم آئیگی ہے۔ ماں تو اپنی ہی دنیا
 میں اور اپنی زبان چلانے میں اور نہ جانے اپنے ہی کاموں میں سرگرم رہتی۔ اس کی
 کل خواہش یہی ہے کہ خالد وزری جان اور حمیدہ بیگم کے ساتھ بیٹھی رہے اور
 گھنٹوں باتیں کرتی رہے جب وہ ان سے باتیں کر رہی ہوں تو اگر میں یا میرے بھائی
 بہنوں کو اس سے کوئی کام پوچھا جائے تو گویا اس کی گھڑیاں بہت تلخ ہو جاتی ہیں۔
 اسے معلوم نہیں کہ جب وہ عورتوں کے ساتھ بیٹھی دوسروں کی غیبت کر رہی ہوتی
 ہے۔ کبھی کسی کے جوتے کی بات ہے اور کبھی کسی کی پگڑی کی۔ اس وقت میرے
 دل کی حالت ایک ایسے جے اشیاء پرندہ کی سی ہوتی ہے کہ جو سرگرداں اور
 ناگاہ ہوا اور در دیوار سے ٹکرا رہا ہو تاکہ اسے بھی بات کرنے کے لیے کوئی
 ساتھی مل جائے۔ اس سے اپنا درد بیان کرے اور کچھ تسلی پائے۔ کوئی ایسا ساتھی
 ہو کہ جو غلطیوں اور کوتاہیوں پر کبھی برا بھلا نہ کہے اور بے عزتی نہ کرے۔ امی اور
 ابو تو آپس میں تو تھک کر رہتے ہیں یا اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔
 یا پھر گھر میں نہیں ہوتے۔ میں بھی صبح سے شام تک در سے میں ہوں اور بہت دن
 گزر گئے کہ میں نے ابو کو نہیں دیکھا کہ انہیں سلام کر دوں۔ میری ادبیات کی استاد
 ایک ماہر نفسیات ہے آج اس نے کلاس میں بی بی کی زندگی پر باپ کے اثر پر
 بات کی۔ اس کے باتیں کیسے میرے دل میں بیٹھ گئیں۔ ہم سب کے دل میں
 بیٹھ گئیں۔ اس نے سچ کہا آج جب کہ میں سب لڑکیوں کی نظروں میں بڑی ہو گئی ہوں
 ہر زمانے سے زیادہ احساس کرتی ہوں کہ مجھے اپنے باپ کی راہنمائی کی ضرورت ہے

ایک فہمیدہ اور ہربان شخص کی توانائی کی احتیاج ہے۔
میں سچ کہتی ہوں،

مجھے اپنے باپ کی عمدہ نوازشات کی چند سال پہلے کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔
میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی وہ مجھے اپنے زانو پر بٹھالے اور مجھے کہانی سنائے۔ مجھے
اجازت دے کہ میں ہر چیز کے بارے میں اس سے سوال کروں۔ مجھے اجازت دے
کہ میرے دل کی گہرائیوں میں اس کے بارے میں جو احساس ہے اور ارادہ ہے اس
کا اظہار کروں لیکن اسے افسوس کہ وہ کس قدر مرد اور ترش رو انسان ہے۔ اصلاً
اُسے اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ میں اس کی سولہ سالہ بیٹی چھ سال کی عمر سے زیادہ
اس کی دلگرم اور خوبصورت ہربانیوں کی احتیاج مند ہوں۔ میرے دل میں کتنی باتیں
ہیں جو میں اس سے کہنا چاہتی ہوں۔ میرے ایسے غم ہیں کہ ایک دانا شخص بہتر سمجھ
سکتا ہے لیکن وہ مجھ سے اور ہم سب سے یوں دور ہے جیسے ہم اُس کی زندگی میں
کچھ بھی نہیں گھر میں اگر کوئی ممان نہ ہو تو پھر وہ کتاب پڑھتا ہے۔ اخبار کا مطالعہ کرتا ہے
یا سرور و اور دل درد لے کر بیٹھ جاتا ہے اور پیار محبت کی کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ
باپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ جب وہ خاندان کے لیے نان و نفقہ فراہم کر دیں تو اس کے
بعد ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہ کیوں نہیں سمجھنا چاہتے کہ بیٹی اور بیٹا جب بڑے
ہو جاتے ہیں تو بالکل اسی طرح جیسے انہیں غذا کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے انہیں
زیادہ معقول اور بیشتر محبت اور توجہ کی بھی نیاز ہوتی ہے۔ ماں باپ کیوں یہ سمجھتے
ہیں کہ اگر انہوں نے اپنی ۱۶ سالہ بیٹی سے کبھی محبت کا اظہار کیا یا کوئی پیار بھرا کلمہ
کہہ دیا یا اس سے پسند و نصیحت کے بغیر کوئی دستاویز بات کر دی تو ماں باپ کی
شخصیت اور حیثیت مجروح ہوگی۔ میرے دل میں بہت غصہ ہے۔ میں بہت کمی
کا احساس کرتی ہوں۔ اگرچہ میرے خوبصورت گھر میں میرے لیے اچھا کمرہ ہے اچھے
اسکول میں جاتی ہوں۔ میری وضع قطع اور لباس اچھا ہے ان سب چیزوں کے لیے
میرے ابو پیسہ بھی دیتے ہیں اور آرام سے خرچ بھی کرتے ہیں۔ نہ محنت بھی اٹھاتے

ہیں۔ لیکن وہ کام جس پر کچھ خرچ نہیں ہوتا اور بہت ہی کم زحمت اٹھانا پڑتی ہے وہ نہیں کرتے۔ وہ ہماری طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ

بچے کی تربیت کے لیے بہترین جگہ، بالخصوص زندگی کے ابتدائی دور میں گھر کا ماحول ہوتا ہے اس میں بچہ اپنے ماں باپ کی پوری توجہ، نوازش اور محبت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ ماں باپ کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ حتی المقدور اپنے بچوں کو مراکز پرورش کے سپرد نہ کریں کیونکہ ہو سکتا ہے پرورش گاہ غذا اور حفظانِ صحت کے اعتبار سے گھر کی نسبت بہتر ہو لیکن بچے کے لیے ایک سرد اور بے مہر ماحول ہے۔ پرورش گاہ اُس بچے کے لیے ایک زندان اور صحت افزا مقام پر جہاں وطنی کے مانند ہے کہ جو ماں باپ کی توجہ اور محبت کا ضرورت مند ہے۔ اچھی آب و ہوا اور اچھی غذا روحانی مسرت اور مہر و محبت کی جگہ نہیں دے سکتی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

جب تم کسی کو پسند کرتے ہو تو اپنی محبت کا اظہار بھی کرو اظہار محبت سے صلہ و صفائی وجود میں آتی ہے وہ تیس ایک دوسرے کے نزدیک کر دیتی ہے بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحیح سیرے اپنی اولاد اور نواسوں سے پیار کیا کرتے تھے۔

۱۔ روزنامہ اطلاعات، شمارہ ۱۳۱۱۳، خرداد ماہ ۱۳۵۸ھ

۲۔ مستدرک، ج ۲، ص ۶۷

۳۔ بحار، ج ۱۰، ص ۹۹

محبت کا منکالنے کا ذریعہ نہیں

چونکہ بچے کو ماں باپ کی محبت اور پیار کی ضرورت ہے، بعض ماں باپ بچے کے اس احساس سے استفادہ کرتے ہیں اور اسے کام نکالنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس سے کہتے ہیں یہ کام کرو تا کہ انی تجھ سے پیار کرے اور اگر تم نے فلاں کام کیا تو اب تم سے پیار نہیں کریں گے۔ البتہ شک نہیں ہے کہ اس طریقے سے بچے پر اثر انداز نہ ہوا جاسکتا ہے اور اس کے کاموں کو ایک حد تک کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اسی راستے کو اختیار کیئے رہنا بے ضرر نہیں ہے۔ کیونکہ اس ذریعہ سے آہستہ آہستہ بچہ میں عادت پیدا ہو جائے گی کہ وہ ماں اور باپ اور دوسرے لوگوں کی محبت حاصل کرنے کے لیے کام کرے نہ اس لئے کہ وہ کام واقعی اسکے اور معاشرے کے مفاد میں ہے وہ کاموں کی اچھائی اور بُرائی کا معیار دوسروں کو دوست بنانے یا نہ بنانے میں سمجھنے لگے گا جب کہ چاہیئے یہ کہ اچھائی اور بُرائی کا معیار انفرادی اور اجتماعی مفاد اور بھلائی اور رشتائے الہی کا حصول ہو نہ کہ لوگوں کی خواہش اور ایسا نہیں ہے کہ سب ماں باپ بچے اور معاشرے کے حقیقی مفادات کو بخوبی پہچان سکیں ایسے ماں باپ بھی ہیں کہ اپنے مفادات اور آرام کو حقیقی فائدے پر ترجیح دیتے ہیں اس ذریعہ سے یہ بھی ممکن ہے کہ بچہ چاہلوس، منافق اور فریب کار بن جائے کیونکہ اس کا مقصد دوسروں کی خوشنودی اور توجہ حاصل کرنا بن جائے گا اگرچہ وہ منافقت اور فریب کاری ہی کے ذریعے کیوں نہ ہو۔ لہذا ایک سمجھدار مربی محبت کو مطلب نکالنے اور بچے پر اثر انداز ہونے کا وسیلہ قرار نہیں دیتا۔

محبت چوتز بہت میں حاصل نہ ہو

بعض ماں باپ اپنی اولاد سے حد سے زیادہ محبت رکھتے ہیں اس لیے اس کے لئے جو چیزیں ضرور سال ہیں قطعاً نہیں سہتے اور اگر کبھی وہ اس میں عیب دیکھیں یا کوئی دھڑا اس کی طرف متوجہ کرے تو چوہکیر نہیں چاہتے کہ بچے کو ناراض کریں لہذا وہ اس عیب کو ان دیکھا کر دیتے ہیں اور اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کرتے ہیں آپ ایسے بے ادب بچوں کو دیکھتے ہوں گے جو دوسرے بچوں کو اذیت دیتے ہیں، لوگوں کو تنگ کرتے ہیں، لوگوں کی درو دیوار کو خراب کر دیتے ہیں، شیشے توڑ دیتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، لوگوں کے مال کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اسی طرح کی دوسری حرکتیں کرتے ہیں لیکن ان کے نادان ماں باپ نہ فقط یہ کہ ان کو تنبیہ نہیں کرتے بلکہ ایک احمقانہ ہنسی سے ان کا بے جا دفاع کرتے ہیں اور اس طرح سے ایسے کاموں میں ان کی تشریق کا باعث بنتے ہیں یہ بے وقوف ماں باپ اپنی بے جا محبت سے دوستی کے لباس میں اپنے بچوں کے ساتھ بہت بڑی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ ظلم عظیم اللہ کے نزدیک بے مواخذہ نہیں ہوگا۔ بچوں سے محبت کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تربیت سے غافل ہو جائیں اور انہیں ہر کام کرنے کی ہلکی چھٹی دے دیں۔ اظہار محبت تربیت کا وسیلہ ہے اسے تربیت میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔ بہترین ماں باپ وہ ہیں جو بچے کی محبت کو اور تربیت کے مسئلہ کو الگ الگ کر کے دیکھیں اپنے بچوں سے خوب محبت کریں لیکن حقیقت بین نظروں سے ان کی خجیوں اور خامیوں پر نظر رکھیں اور نہایت سمجھداری سے ان کی اصلاح کی کوشش کریں بچے کو بھی یہ بات سمجھنی چاہیے کہ وہ جسے کام کرنے

ہیں آزاد نہیں اور اس پر اس کی باز پرس کی جائے گی اور اس کو ہمیشہ خوف اور امید کے عالم میں زندگی گزارنی چاہیے ماں باپ کی محبت سے اس کو دلگرم اور پر امید ہونا چاہئے اور برے کاموں پر ان کی ناراضی اور غصے کا اُسے خوف ہونا چاہئے جن ماں باپ کو اپنے بچے سے محبت ہے ان کو یہ جاننا چاہئے کہ ہمیشہ یہ بچہ ہی نہیں رہیگا اور نہ ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہیگا بلکہ وہ بڑا ہو جائے گا اور ناچار معاشرت سے میں زندگی گزارے گا لوگوں سے معاشرت کرے گا اگر اسے زندگی اور معاشرت کے آداب نہ آئے اور اس نے دوسروں کے حقوق کا احترام کرنا نہ سیکھا تو لوگ اس سے نفرت کریں گے اور اس طرح سے وہ لوگوں کی توجہ اور محبت حاصل نہیں کر سکے گا کہ جو زندگی کی خوشی اور راحت کے لیے ضروری ہے لوگ ماں باپ کی طرح نہیں ہوتے کہ اولاد کے عیوب کو نظر انداز کر دیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

سب سے بڑا باپ وہ ہے کہ جو اولاد سے محبت اور احسان کرنے میں حد سے تجاوز کرے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

جسے ادب سکھا دیا گیا اس کی بڑائیاں کم ہو گئیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

میرے ابا جان نے ایک شخص کو دیکھا کہ جو اپنے بیٹے کے ساتھ جاتا تھا۔ وہ

بے ادب بیٹا اپنے باپ کے ساتھ کاسہ مارا لیے ہوئے تھا۔ میرے والد

زین العابدینؑ اس بے ادب بیٹے پر اتنے ناراض ہوئے کہ ساری عمر اس سے

بات نہ کی۔

۱۔ تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۲۲۰

۲۔ غرر الحکم، ج ۲، ص ۶۲۵

۳۔ معارج، ص ۶۲

بگڑا ہوا بچہ

یہ صبح ہے کہ بچے کو محبت و نوازش کی ضرورت ہوتی ہے لیکن محبت میں افراط صحیح نہیں ہے۔ محبت غلا کے مانند ہے اگر ضروری مقدار میں اپنے مقام پر صرف ہو تو مفید ہے لیکن ضروری مقدار سے زیادہ اور غیر مناسب مقام پر صرف ہو تو نہ صرف یہ کہ سود مند نہیں ہے بلکہ کئی ایک نقصانات کی حامل بھی ہے۔ زیادہ لاڈ پیار نہ صرف بچے کے لیے مفید نہیں ہے بلکہ تربیت کے نقطہ نظر سے ایک بہت بڑی خیانت و اشتباہ ہے۔ بچہ کوئی ٹھیکل کا سامان نہیں ہے نہ ماں باپ کے دل پہلانے کا ذریعہ ہے نہ وہ ایک چھوٹا سا انسان ہے کہ جس کی خود اس کے لیے اور اس کے مستقبل کے لیے تیمارداری کی جاتی ہے اور یہ بہت بڑی ذمہ داری ماں باپ کے کندھے پر رکھی گئی ہے۔ بچہ ہمیشہ چھوٹا نہیں رہتا بلکہ بڑا بھی ہو جاتا ہے اسے معاشرے میں زندگی بسر کرنا ہے اور زندگی بسر کرنا کوئی آسان کام نہیں بلکہ اس میں اونچ نیچ، کامیابی و ناکامی، عروج و زوال، راحت و مصیبت اور خوشی اور غم موجود ہوتا ہے۔ ایک سمجھدار مربی صبح اور عاتقانہ طرز تفکر کے ساتھ زندگی کے حوادث کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے بچے کی اس طرح سے تربیت کرتا ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ان باپ کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ جیسے بچے کی تربیت کے لیے اصولی طور پر محبت ضروری ہے اسی طرح محبت میں زیادتی بُرے نتائج کی حامل ہے۔ جن بچوں کو حد سے زیادہ لاڈ پیار کیا جائے وہ بگڑ جاتے ہیں اور ان کے ناز و نخرے بہت بڑھ جاتے ہیں اس بُری صفت کا نتیجہ خطرناک نکلتا ہے۔ مثلاً :

۱۔ جب بچہ عروس کرے گا کہ اس کے ماں باپ اسے بے انتہا چاہتے ہیں پرستش کی حد تک اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی مرضی کے مطابق اس سے سلوک کرتے ہیں تو اس سے اس کی خواہشات کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ وہ چاہے گا کہ فقط فرمانِ صادر کرے اور ماں باپ بلا چون و چرا اس پر عمل کریں کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ ایسے بچے میں دلِ بدن استبداد اور قدرتِ طلبی بڑھتی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ ایک آمر حکمران کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا شخص جب معاشرے میں آتا ہے تو لوگوں سے بھی یہ توقع رکھتا ہے کہ اس سے اس کے ماں باپ کی طرح محبت کریں۔ اور اس کی خواہشات پر اسی طرح عمل پیرا ہوں گے اس کے ماں باپ ہوتے ہیں لیکن لوگ خود غرض شخص سے محبت کرتے ہیں اور نہ اس کی خواہشات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اسی بنا پر معاشرے سے اس کا دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ وہ شکست و سخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ احساسِ کمتری کے باعث تنہائی پسند اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ شکست و ناکامی کے ساتھ زندگی گزارے یا پھر خودکشی کر کے اپنے آپ کو اس سے نجات دے لے۔ بگڑے ہوئے اور ناز پرورد لوگ ازدواجی زندگی میں بھی عموماً کامیاب نہیں ہوتے۔ ایسا شخص اپنی بیوی سے بھی یہ توقع رکھے گا کہ اس کی ماں سے بھی بڑھ کر اس سے اظہارِ محبت کرے، اس کے فرامین کی پوری طرح اطاعت کرے اور بلا چون و چرا ان پر عمل کرے۔ لیکن افسوس کہ عملی زندگی میں صورتِ حال مختلف ہے بہت سی بیویاں اپنے شوہر کے استبداد اور حکم کے سامنے تسلیمِ محض کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے گھریلو لطافتی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک بگڑی ہوئی بیٹی بھی جب اپنے سسرال میں جاتی ہے تو اس کی بھی اپنے شوہر سے یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ اس سے اس کے ماں باپ سے زیادہ محبت کرے اور اس کی ہر خواہش کو بلا حیل و تحت قبول کرے۔ عموماً مرد بھی ایک بلند پرغز اور ایسی بگڑی ہوئی عورت کی تمام خواہشات پوری نہیں کر سکتے۔ لہذا گھریلو لطافتی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے مرد اور عورتیں دیکھنے میں آ جاتے ہیں جو اپنے بڑھاپے میں بھی اس بات پر تیار نہیں ہیں کہ اس بگڑے پن اور بچکانہ عادت سے دست بردار ہو کر بڑے ہو جائیں۔ ایسے لوگ گویا اس پر مصر ہیں کہ ہمیشہ بچے ہی رہیں۔

۱۔ ناز و نعم میں پلنے والے بچے عموماً ضعیف و ناتواں رُوح اور رنجیدہ نفسیات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور خود اعتمادی سے عاری ہوتے ہیں۔ لہذا جب مشکلات پیش آتی ہیں تو راہ فرار ڈھونڈتے ہیں۔ ان میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالیں۔ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے وہ اللہ پر اور اپنی ذات پر اعتماد کرنے کے بجائے دوسروں کی مدد کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

۲۔ لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے اور ناز پروردہ افراد عموماً خود پسند اور اپنے آپ میں مگن ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کی حد سے زیادہ تعریف کی جاتی ہے اس لیے وہ اپنے تئیں ایک بہت بڑی شخصیت سمجھنے لگتے ہیں جب کہ حقیقت یوں نہیں ہوتی۔ وہ اپنی برائیاں نہیں دیکھتے بلکہ عیب کو کمال سمجھتے ہیں اور غرور بھی ایک بہت بڑا اخلاقی عیب اور ایک خطرناک نفسیاتی بیماری ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا :

خود پسندی بدترین چیز ہے

امام علی علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا :

جو شخص بھی خود پسند ہو اور بس اپنے میں مگن ہو اس کے عیب اور برائیاں

اس پر واضح ہو جائیں گی

ایسا شخص لوگوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی جھوٹی شخصیت کی تعریف کریں۔ اس

وجہ سے کامریس اور چالوس قسم کے لوگ اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ لیکن سچ گو اور تنقید

کرنے والوں کی اس کے ہاں کوئی جگہ نہ ہوگی۔ خود پسند لوگ نہ صرف یہ کہ دوسروں کی

محبت اور دوستی کو جذب نہیں کر سکتے بلکہ ہمیشہ دوسروں کے نزدیک قابل نفرت قرار

پاتے ہیں۔

۱۔ غرر الحکم، ص ۲۴

۲۔ غرر الحکم، ص ۶۸۵

حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا:
 جو شخص بھی خود پسند ہوگا اور بس اپنی ذات میں مگن ہوگا وہ بہت زیادہ مشکلوں
 میں پھنس جائے گا۔

۴۔ جن بچوں سے حد سے بڑھ کر محبت اور نوازش کی جاتی ہے اور ماں باپ ان کی ہر
 بات مانے چلے جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ ماں باپ پر بالکل مسلط ہو جاتے ہیں۔ جب بڑے
 ہو جاتے ہیں تو بھی اقتدار طلبی سے باز نہیں آتے اور ماں باپ سے بہت زیادہ توقعات
 رکھتے ہیں۔ اگر ماں باپ ان کی خواہشوں کے مقابلے میں آئیں تو وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے
 لیے بہت زیادہ غصہ، جھگڑا، اور ناز خرا کرتے ہیں اور عادتیں بگاڑنے والے ماں باپ سے
 ہر جانہ وصول کرتے ہیں۔ چونکہ انہیں اپنے لاڈلے پن کا احساس ہوتا ہے اس لیے آخر عمر
 تک ماں باپ سے جھوٹ بولتے ہیں اور ہر جانہ وصول کرتے ہیں۔

۵۔ محبت میں افراط بعض اوقات اس مقام پر جا پہنچتی ہے کہ اُسے خوش رکھنے کے لیے
 حقیقی مصلحتوں اور تعلیم و تربیت پر اس کی رضامندی کو ترجیح دینا پڑتی ہے۔ اس کے پیسوں کو
 نہیں دیکھا جاتا یا نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی
 خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی بھی کام سے دریغ نہیں کیا جاتا اگرچہ وہ غیر شرعی ہی کیوں
 نہ ہو اور اس طرح سے ماں باپ اپنے عزیز بچے کے ساتھ عظیم ترین خیانتوں کے مرتکب
 ہوتے ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

بدترین باپ وہ ہے کہ جو اپنے بچے سے احسان اور مہر و محبت میں افراط
 اور حد سے تجاوز کرے۔

بچے کو ہمیشہ خون و جگر کی کیفیت میں زندگی بسر کرنا چاہیے۔ اُسے یہ اطمینان ہونا

چاہیے کہ وہ واقعاً ماں باپ کا محبوب ہے اور جہاں بھی ضروری ہو وہ اس کی مدد کو دوڑیں گے اور دوسری طرف اُسے معلوم ہو نا چاہیے کہ جہاں بھی اس نے کوئی غلط کام انجام دیا ماں باپ اس کا مؤاخذہ کریں گے۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں !

بچے سے پیار ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن بچے کا یہ چاہنا صحیح نہیں ہے کہ ماں باپ سارا وقت اسی کو دے دیں اور ہمیشہ اُسی کے چاؤ چوٹیلے کرتے رہے۔

ڈاکٹر جلالی ہی لکھتے ہیں :

اگر بچہ ایسے ماحول میں زندگی گزارتا ہو کہ جہاں اُسے بہت لاڈ سے رکھا جاتا ہو۔ ہمیشہ دوسرے اس کی حمایت کرتے ہوں۔ اس کے بُرے اور ناپسندیدہ کاموں کو معاف کر دیا جاتا ہو اور مشقت طلب دنیا میں رہنے کے لیے اسے تیار نہ کی جاتا ہو وہ معاشرے میں ہمیشہ بہت ساری مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرے گا۔ بچے کو آغاز تولد سے ہی یہ سکھایا جانا چاہیے کہ زندگی گزارنے والا وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ وہ ایک معاشرے کا حصہ ہے اور اس کی خواہشوں کو دوسروں کی خواہشات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

اگر بچہ بے مقصد ہی رونے یا غصہ کرے یا سر کو دیوار سے مارے اور اس طرح سے ماں باپ پر کامیابی حاصل کرنا چاہے اور اپنی غلط خواہشات کو منانا چاہے تو اس کی طرف اعتنا نہیں کرنا چاہیے۔ اُسے چھوڑ دیں تاکہ وہ سمجھ لے کہ اس کے رونے دھونے سے دنیا کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ کچھ صبر کریں وہ خود ہی ٹھیک ہو

جائے گا۔

اگر آپ کا بچہ زمین پر گر جائے تو ضروری نہیں کہ اسے اٹھائیں اور اسے تسلی دیں یا زمین کو بڑباہلا کہیں۔ رہنے دیں تاکہ وہ خود اٹھے پھر اسے نصیحت کریں کہ محتاط رہے زمین پر نہ گرے۔ اگر اس کا سر دیوار سے ٹکرا جائے تو چومنا اور پیار کرنا ضروری نہیں ہے ایسے امور کی پردہ نہ کریں۔ کچھ ذرا ٹھیک ہو جائے تو پھر اسے نصیحت کریں۔ جب آپ کا بچہ بیمار ہو جائے تو اس کے علاج کی کوشش کریں۔ اس کے لیے دوا اور غذا مہیا کریں۔ اس کی دیکھ بھال میں درپن نہ کریں اس کی بیماری کو ایک معمولی واقعہ قرار دیں اور اپنے روزمرہ کے کام انجام دیتے رہیں۔ آپ کی نیند، کھانا اور کام معمول کے مطابق انجام پانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے کام اور معمولات زندگی کو چھوڑ بیٹھیں اور غم و اندوہ کے ساتھ روتی آنکھوں کے ساتھ اس کے بستر کے کنارے بیٹھ جائیں اور وقت بے وقت اس کے بخار میں تپتے ہوئے چہرے کو چومتے رہیں۔ یہ کام بچے کے معاملے پر کوئی اثر نہیں ڈالتے البتہ اسے بگاڑ ضرور دیتے ہیں کیوں کہ وہ خوب احساس کرتا ہے کہ اس کی بیماری ایک غیر معمولی واقعہ ہے جس نے ماں باپ کی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔

..... اپنے خط میں لکھتی ہے،

دو بیٹیوں کے بعد میرے ماں باپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا مجھے اپنی ماں کا شور شراب اور جین دسر در بھولتا نہیں، میرے ماں باپ نے اس قدر اسے لاڈ پیار کیا کہ دو سال کی عمر میں وہ مجھے اور میری بہن کو خوب اتاتا اور کاٹتا تھا اور ہمیں جرات نہ تھی کہ اپنا دفاع کریں۔ جو کچھ وہ چاہتا بلا چون و چرا مہیا کر دیا جاتا۔ بچوں کو اذیت کرتا۔ اس کے مدرسہ جانے کے لیے اس پر بہت زیادہ عنایات کی جاتیں۔ لیکن وہ کوئی کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ استاد کی بات پر کان نہ دھرتا لہذا وہ سلسلہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ترقی نہ کر سکا۔ اب جب کہ بڑا ہو گیا ہے بالکل ان پڑھ

ہے۔ تنہائی پسند، کم گو اور اپنے آپ میں کھو جاتا ہے۔ کسی کام کے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ بے مقصد ہی اور ہر اُدھر غصہ کرتا اور جھگڑتا رہتا ہے۔ اپنی بہنوں سے اسے کوئی محبت نہیں۔ اس کا انجام کار معلوم نہیں ہے۔

ہاں! ماما پیارا بھائی ماں باپ کی غلط تربیت اور حد سے زیادہ محبت میں افراط کی جینٹ پڑھ گیا ہے۔



انگوٹھا چوسنا

بچے کی ایک عام عادت انگوٹھا چوسنا ہے۔ عموماً بچے اپنے پیدائش سے تین ماہ بعد انگوٹھا چوسنے لگتے ہیں اور کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ اس کام کے فطری عامل اور اصلی بنیاد کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ بچہ اپنی عمر کے ابتدائی ایام میں دودھ کے ذریعے سیراب ہوتا ہے اور دودھ پچوس کر ہی پیتا ہے۔ اسے جب بھی بھوک لگتی ہے اور کچھ ناراحتی سی محسوس کرتا ہے تو مال کے پستان یا چوسنی کو چوستا ہے اور دودھ پی کر اپنی ناراحتی دور کرتا ہے۔ اس مدت میں اسے اس عمل کے عوارض سے یہ تجربہ ہوتا ہے کہ چوسنے کے ذریعے ناراحتی دور ہوتی ہے اور آرام سامتا ہے۔ تندرست بچہ چوسنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اس عمل سے کیف حاصل کرتا ہے۔ ان ایام میں جب کہ بچے کے معاشرتی احساسات کمی حد تک بیدار ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ خارجی دنیا کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے، اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس لذت بخش عمل یعنی چوسنے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اس مقصد کے لیے بہترین اور آسان ترین چیز اس کے پاس انگوٹھا چوسنا ہی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنا انگوٹھا چوستا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے جب بھی موقع ملے ہر طرح کی ناراحتی دور کرنے کے لئے اس لذت بخش مشغولیت سے استفادہ کرتا ہے۔ بہت سے ماں باپ انگوٹھا چوسنے کو ایک بڑی عادت سمجھتے ہیں اور اس پر اپنی ناپسندگی کا اظہار کرتے ہیں اور ناراض ہو کر اس کا چارہ کار سوچتے ہیں۔ یہاں پر اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ اگرچہ دانتوں کے بعض ڈاکٹر اس عادت کو نقصان دہ سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ انگوٹھا چوسنے سے

اور منہ کی طبعی و فطری حالت بگڑ جاتی ہے لیکن ان کے مقابلے میں دانتوں کے بہت سے ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انکو ٹھاپڑنے سے کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا۔

ایک ماہر لکھتے ہیں :

بہت سے معالجینِ نفسیات اور ماہرینِ نفسیات اور اسی طرح بچوں کے امرد کے بہت سے ماہرین کا نظریہ ہے کہ اصولاً یہ عمل کوئی نقصان دہ عادت نہیں ہے اور بہت سے مقامات پر یہ عمل بچے کے مزاج کی قسم کی تبدیلی کا باعث نہیں بنتا۔ ان کا خاص طور پر یہ نظریہ ہے کہ یہ عادت جیسا کہ عموماً دیکھنے میں بھی آیا ہے مستقل دانت نکلنے پر ختم ہو جاتی ہے لہذا یہ بچے کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں بنتی بلکہ

البتہ ممکن ہے کہ یہ عادت بچے کی صحت و سلامتی کو نقصان پہنچائے کیوں کہ بچے کی انگلی عموماً گندی اور کثیف ہوتی ہے اور ایسی کثیف انگلی چڑھنے سے اکثر نقصان کا امکان ہوتا ہے۔ زیادہ تر مالِ باپ اس عادت کو پسند نہیں کرتے اور شرم کا احساس کرتے ہیں۔ بہر حال ظاہراً یہ موضوع کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور بچہ جب چار یا پنج سال کا ہو جاتا ہے تو خود بخود یا مالِ باپ کے ذریعے یہ عادت ختم ہو جاتی ہے البتہ مالِ باپ کو اگر یہ عادت پسند نہیں تو بہتر ہے کہ اس کے وقوع سے پہلے ہی اس کا علاج کریں کیونکہ کسی عادت کو پیدا ہونے سے روکنا ترکِ عادت کی نسبت بہت آسان ہے۔

جب وہ دیکھیں کہ بچہ اپنی انگلی چوسنا چاہتا ہے تو اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کریں اگر وہ سیر نہیں ہوا تو اسے دودھ اور پلائیں اگر اسے جلد جھوک لگ جاتی ہو تو غذائی وقفے کے دوران میں اسے کوئی سادہ سی غذا مثلاً بسکٹ اور پھلوں کا رس دے سکتے ہیں۔ اگر اس کی وجہ احساسِ تنہائی یا کوئی تکلیف ہے تو اس کی طرف زیادہ توجہ کرنا چاہیے اور

اس سے اظہار محبت کریں۔ ایسی چیزیں ہو سکتا ہے اس عادت کی پیدائش کا سبب ہوں۔
 اگر سبب دور کر دیا جائے تو زیادہ امکان یہی ہے کہ بچے میں ایسی عادت پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن
 اگر عادت پیدا ہوگئی تو پھر اس کا علاج مشکل ہے۔ اگر اسے کھینٹنے کی مناسب چیزیں ملے
 دی جائیں یا اس کے ساتھ کوئی کھینٹنے والا مل جائے تو شاید تدریجاً یہ عادت ترک ہو جائے۔
 شاید اس کا بہترین علاج اُسے چوسنی دے دینا ہو۔ لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ اُسے چوسنی
 کی عادت پر مجا اُسے گی۔ اگر ایسے کاموں کے ذریعے سے اس عادت کو روک سکیں تو کیا ہی
 بہتر۔ لیکن اگر کامیاب نہ ہوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر سختی شروع کر دی جائے مثلاً اس
 کے ہاتھ باندھ دیے جائیں، اسے ملا جائے۔ اس سے تلخی کی جائے، اسے ڈانٹ ڈپٹ یا
 ملامت و سرزنش کی جائے کیوں کہ ایسے کام اس کے علاوہ کہ عموماً بے فائدہ ہوتے ہیں
 بچے کی روح اور نفسیات پر بھی بڑے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ بہتر ہے کہ جبر کریں اور کسی
 مناسب موقع کا انتظار کریں زیادہ تر یہ عادت چار یا پانچ سال کی عمر میں خود بخود ختم ہو جاتی
 ہے۔

خوف

خوف سب میں پائی جانے والی ایک صفت ہے۔ تھوڑا یا زیادہ سب لوگوں میں ہوتا ہے۔ اجالی طور پر خوف انسان کی حفاظت کے لیے ضروری ہے اور اس طرح سے ہونا کوئی بُری چیز بھی نہیں ہے۔ جس میں بالکل ہی خوف نہ ہو وہ انسان معمول کے مطابق نہیں ہے بلکہ بیمار اور ناقص ہے۔ یہ خوف ہے جس کی وجہ سے انسان خطرناک حوادث سے بھاگتا ہے اور اپنے آپ کو موت سے بچاتا ہے۔ لہذا خوف اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے کہ جو خالق کائنات نے انسان کے وجود میں ودھیت کی ہیں اور اس میں مصلحتیں اور حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ لیکن یہ عظیم نعمت دیگر تمام نعمتوں کی طرح اس صورت میں مفید ہوگی کہ جب انسان اس سے صحیح طور پر استفادہ کرے۔ اگر وہ اپنے صحیح مقام کے برخلاف استعمال ہوئی تو نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہے بلکہ ممکن ہے بُرے نتائج کی حامل بھی ہو۔ خوف کے مواقع کو مجموعی طور پر ۲ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا۔ خیالی، بے موقع اور غیر عقلی خوف
دوسرا۔ معقول، درست اور بجا خوف۔

غیر عاقلانہ خوف

پہلی قسم کا غیر عاقلانہ خوف عموماً زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے جن اور بھوت سے ڈرنا، تاریکی سے خوف کھانا، بے ضرر حیوانات سے ڈرنا، بلی، چوہے، لال بیگ، مینڈک، اونٹ، گھوڑے

اور دیگر ایسے جانوروں سے ڈرنا۔ پھر سے ڈرنا، مرد سے، قبرستان، قبر اور کفن سے ڈرنا، ڈاکٹر، ٹیکے اور دوا سے خوف کھانا، دانتوں کے ڈاکٹر سے ڈرنا ریل گاڑی کی آواز یا بادل کے گر جسنے اور بجلی کے کڑکنے سے خوف کھانا، اکیلے سونے سے ڈرنا، امتحان دینے اور سبق سنانے سے ڈرنا، بیماری سے خوف کھانا، موت سے ڈرنا اور ایسے ہی دیگر دیویوں قسم کے خوف کہ جو بالکل بے موقع ہیں اور ان کی بالکل کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔ ایسے خوف کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ایسے ہی خوف ہوتے ہیں کہ جو بچے کو دائمی رنج و غلاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ٹکھکی نیند سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور نیندیں وحشت ناک قسم کے خواب دیکھتا ہے اور چیخا چلاتا ہے۔ بے جا خوف و اضطراب ایک نفسیاتی بیماری ہے جو بچے کی آئندہ زندگی پر بھی بُرے اثرات مرتب کرے گی۔ ڈرپوک آدمی میں حشرات نہیں ہوتی کہ وہ کوئی بڑا قدم اٹھائے ہمیشہ اضطراب کے عالم میں رہے گا اور اس کے دل میں ہمیشہ گڑبڑ رہے گی، ملنے جلنے سے لڑائے گا، پریشان اور افسردہ رہے گا۔ اجتماع سے ہٹا گئے گا اور اپنی ذات میں گم ہو جائے گا۔ اکثر نفسیاتی بیماریاں ایسے ہی بے جا خوف سے وجود میں آتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

خوف بھی ایک مصیبت ہے۔

لہذا ایک اچھا مربی اس امر سے لاتعلق نہیں رہ سکتا بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے بچے کے بے جا خوف کو دور کرے اس موقع پر مربی حضرات کی خدمت میں ہم چند گزارشات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ خوف کو دور کرنے سے کہیں آسان ہے کہ اسے پہلے سے روکا جائے۔ کوشش کریں کہ خوف کے علل اور عوامل حتی المقدور پیدا ہی نہ ہوں تاکہ آپ کا بچہ ڈرپوک نہ بنے۔ ماہرین نفسیات کا نظریہ ہے کہ ریل گاڑی کی آواز، بادل اور بجلی کی صدا، خطرے کے آلام کی آواز اور بچے کے سر ہانے شور مچانا بچوں کے لیے خوف کے ابتدائی عوامل

سہ فرما لکھ مہ

میں سے ہیں۔ جہاں تک ہو سکے کوستش کریں کہ بچے اس طرح کی چیزوں سے بچیں اگرچہ
نور مولود کیوں نہ ہوں اس کے سر ہانے شور نہ مچائیں۔ ان کی طرف غصے سے
نہ دیکھیں۔

۲۔ ڈر متعدی بیماریوں میں ہے۔ بچہ ذاتی طور پر ڈرپوک نہیں ہوتا ماں باپ اور ادو گرد
والے لوگ اگر ڈرپوک ہوں تو بچہ ڈرپوک بن جاتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ
کے بچے ڈرپوک نہ ہوں تو پہلے اپنے ڈر کا علاج کریں اور غیر عقلی عوامل پر اظہارِ خوف
اور جزع و فزع نہ کریں تاکہ بچے بھی ڈرپوک نہ ہوں۔

۳۔ پولیس اور جراثیم سے متعلقہ فلموں کو دیکھنا، ٹیلیوژن کے بعض پروگراموں کو دیکھنا ریڈیو کی
ہیجان آدر داستانوں کا سننا، ہیجان انگیز قصوں اور داستانوں کا پڑھنا اور سننا،
یہاں تک کہ مجلوں اور روزناموں میں پھپھنے والے بعض واقعات کا پڑھنا بچے کے لیے
ضرر رساں ہے۔ بچے کے نازک اور ظریف اعصاب پر ان کا اثر ہوتا ہے اور ان سے
بچے کے دل میں ایک خوف، پریشانی اور گہر سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو
سکے بچے کو ان چیزوں سے دور رکھیں۔ جن اور پری کے بارے میں بات تک
نہ کریں۔ اگر انہوں نے کسی اور سے سن لیا ہو تو انہیں بھل جائے کہ جن اگر موجود بھی ہو دیا
کہ قرآن کریم نے ان کے وجود کے بارے میں تصریح بھی کی ہے تو وہ بھی انسانوں
کی طرح سے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں اور انسان کے لیے ان کا کوئی نقصان نہیں
اور ان سے خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۴۔ بچے کی تربیت کے لیے اسے ڈرانے اور سختی سے پرہیز کریں۔ بچوں کو بھوت،
دیو، لولو، وغیرہ سے نہ ڈرائیں۔ ایسے خوف ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر بچے پر اثر ڈالیں
لیکن یقیناً ان سے بچے میں جیسے اثرات باقی رہ جائیں گے کہ جن کا نقصان فائدے
سے زیادہ ہے۔ اس طرح سے آپ بچے کو ڈرپوک اور کمزور بنا دیں گے بچوں کو تنبیہ
کے لیے تارک اور دہشت آور جگہوں پر بند نہ کریں۔ بچوں کو کتے بلی سے بچنے
ڈرائیں۔ بعض بیوقوف ماؤں کی غلط عادت ہے کہ بچے کو چپ کر دانے کے لیے

دروازے اور دیوار کے پچھلے سے میاؤں میاؤں کرتی ہیں اور دروازے اور دیوار پر ہاتھ مارتی ہیں اور اس طرح سے اُسے ڈراتی ہیں تاکہ وہ چپ کر جائے۔ ان نادان ماؤں کو خبر نہیں کہ وہ اس غلط عدلت سے کتنے بڑے جرم کی مرتکب ہوتی ہیں اور بچے کی حساس روح کو پریشان کر دیتی ہیں اور اس کی آئندہ نفسیاتی زندگی کو تباہ کر دیتی ہیں۔ اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے :

ہماری مادی آماں ہمیں شرارتوں سے روکنے کے لیے دوسرے کمزور میں چلی اور ایک خاص آواز نکال کر کہتی، میں دیو ہوں، میں آگیا ہوں کہ تمہیں کھا جاؤں۔ ہم ڈرتے اور چپ کر جاتے اور سمجھتے کہ یہ حقیقت ہے۔ اسی وجہ سے میں ایک ڈرلپک شخص ہوں اور اکیلا گھر سے باہر نہیں رہ سکتا۔ اب جب کہ بڑا ہو گیا ہوں وہی خوف ایک اضطراب اور دل گرفتگی کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ ... اپنے ایک خط میں لکھتی ہے۔

میں پانچ سال کی تھی اپنی خالہ زاد کے ساتھ کھیل رہی تھی اچانک ہم نے ایک وحشت ناک ہیولا دیکھا بڑا سا سرا درشت آنکھیں، بڑے بڑے دانت، کھلا سیاہ لباس اور بڑے بڑے کالے جوتے۔ وہ صحن کے درمیان میں تھا۔ عجیب آواز نکالتے ہوئے وہ چاہتا تھا کہ میں کھا جائے۔ ہم نے چیخ ماری اور تارک یک دالان کی طرف بھاگ گئیں۔ میں خوف سے یوں دیوار سے جا چڑھی کہ میری آنکھیاں زخمی ہو گئیں۔ خوف کے مارے میں بے ہوش ہو گئی۔ اور کچھ مجھ بچھڑایا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور مجھے مرنے سے بچایا۔ اس غیر انسانی فعل نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ ایک عرصے تک میں کونوں کھدروں میں چھپتی اور ذرا سی آواز بھی مجھے خوف و وحشت میں مبتلا کر دیتی اور میری چیخ نکال جاتی۔ اب جب کہ میں بڑی ہو گئی ہوں تو میں ضعف اعصاب اور سوزش قلب میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ ہمیشہ غم زدہ رہتی ہوں اور عجیب و غریب خیالات آتے ہیں۔ کام اور زندگی میں میلاوٹ نہیں لگتا نہ کسی سے میل ملاقات ہے اور نہ کہیں لٹی جاتی ہوں۔

بے چین اور مضطرب سی رہتی ہوں۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ہماری پھوپھی زاد نے اپنے سر پر ایک بڑا سا دیگچہ رکھ کے وہ ڈراؤنی جھوٹ کی شکل بنائی تھی تاکہ ہمیں ڈرائے اور وہ ہرے میری بیماری اور اعصاب کی کمزوری کی ذمہ دار۔

۵۔ اگر آپ کا بچہ آپ کی سہل انگاری اور عدم توجہ یا دوسرے اسباب کے باعث ڈر پوک بن گیا ہو تو اس کے ڈر کو غیر اہم چیز نہ سمجھیں۔ کوشش کریں کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کی روح کو آرام پہنچائیں اور اس کا خوف دور کریں۔ اگر بچے کو اپنے بعض کاموں کے حقیقی اسباب کا علم ہو گیا تو اس کا کچھ خوف خود بخود جاتا رہے گا لیکن خوف کا علاج بچے کو جھڑپھٹکار پلانا اس کا مذاق اڑانا اور دوسروں کے سامنے شرمندہ کرنا نہیں ہے۔ ایسا کام نہ نقطہ یہ کہ بچے کا خوف دور نہیں کرے گا بلکہ اس کی حساس روح کو آزدہ تر کر دے گا۔ خوف میں اس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ وہ ڈرنا نہیں چاہتا۔ آپ خود اور دوسرے عوامل اس کے خوف کا سبب بنے ہیں۔ اسے کیوں قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ صبر، برہم کاری، سمجھداری اور تحقیق و جستجو کے ساتھ اس کے خوف کے علل و اسباب معلوم کریں پھر ان کے لیے چارہ کار سوچیں مگر وہ جن اور جھوٹ سے ڈرتا ہے تو اسے پیار محبت سے سمجھائیں کہ جھوٹ، لولو اور دیو وغیرہ کا وجود جھوٹ ہے اور ایسی چیزوں کا اصل وجود ہی نہیں ہے۔ اُسے مطمئن کریں کہ جن کا انسان سے کوئی کام نہیں۔ کوشش کریں کہ ان چیزوں کا اس کے سامنے اصلاً ذکر ہی نہ کیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ ان کا خیال بچے کے ذہن سے محو ہو جائے۔ اگر وہ بے ضرر حیوانات سے ڈرے تو ان کا بے ضرر ہونا اس کے سامنے عملی طور پر ثابت کریں۔ ان حیوانات کے قریب جائیں اور انہیں چھوئیں اور ہاتھ میں پکڑیں تاکہ بچہ تدریجاً ان سے مانوس ہو جائے اور اس کا خوف دور ہو جائے۔ اگر وہ اندھیرے سے ڈرتا ہے تو اُسے کم روشنی کا عادی کریں تاکہ رفتہ رفتہ اس کا خوف جاتا رہے اور وہ تاریکی کا بھی عادی ہو جائے۔ جب آپ خود بچے کے پاس موجود ہوں تو کچھ دیر کے لیے چراغ گلی کر دیں۔ پھر تدریجاً اس مدت کو بڑھائیں۔ جب آپ کسی کمرے میں بچے سے کچھ فاصلے پر ہوں تو یہی عمل دہرائیں۔ صبر اور حوصلے سے اس عمل کا تکرار کریں یہاں تک کہ بچے کا خوف دور ہو جائے اور وہ تاریکی میں رہنے کا عادی ہو جائے۔

اس امر کی طرف بہرحال متوجہ رہیں کہ ڈرانے، دھمکانے، مار پیٹ اور سختی سے کام نہ لیں کیونکہ اس طرز عمل سے آپ بچے کا خوف دور نہیں کر سکتے۔ بلکہ ممکن ہے یہ بڑے اعمال کا پیش خیمہ بنے۔ بچے کو اس امر پر مجبور کرنا کہ وہ جن چیزوں سے ڈرتا ہے ان کے سامنے جائے، اس کے اضطراب اور پریشانی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ اس طریقے سے اس کے اعصاب پر بہت دباؤ پڑتا ہے۔ اگر بچہ ڈاکٹر اور ٹیکے سے ڈرتا ہے تو اسے پیار اور محبت کی زبان میں سمجھائیں کہ وہ بیمار ہے اور اگر وہ تندرست ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ دوا کھائے اور ٹیکے لگوائے۔ اُسے کھائیں کہ دوسرے لوگ بھی ٹیکے لگواتے ہیں اور روتے دھوتے نہیں تاکہ وہ آہستہ آہستہ ڈاکٹر اور ٹیکے سے مانوس ہو جائے اور اس کا خوف داخل ہو جائے۔ اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو اسے زبردستی ٹیکہ نہ لگایا جائے کیونکہ ممکن ہے اس کے بڑے اثرات مرتب ہوں۔ کبھی ضرورت کا تقاضا ہوتا ہے کہ بچہ ہسپتال میں داخل ہو جائے لیکن اکثر بچے ہسپتال میں داخل ہونے اور ماں باپ کی جدائی سے ڈرتے ہیں۔ اس بناد پر کبھی وہ ماں باپ کے لیے بڑی مشکل پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اسے سختی سے ہسپتال میں داخلے پر مجبور کیا جائے تو مسلماً اس سے روحانی اور نفسیاتی طور پر اس پر بڑے اثرات مرتب ہوں گے۔ اگر ماں باپ یہ سمجھیں کہ ہسپتال میں داخل ہو کر دانا اس کی صحت و سلامتی کے لیے نقصان دہ ہے، یہاں تک کہ اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے تو والدین کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو پہلے ہی سے ہسپتال کے ماحول سے مانوس کریں۔ جب کبھی وہ کسی مریض کی عیادت کے لیے جائیں تو اپنے بچے کو بھی ساتھ لے جائیں اور وہاں کچھ دیر ٹھہریں اور اسے یہ بات اچھی طرح سمجھائیں کہ ہسپتال ایک اچھی اور آرام دہ جگہ ہے جہاں پر ڈاکٹر اور مہربان نرسیں موجود ہیں اور یہ لوگ مریض کا علاج کرتے ہیں اُسے بتائیں کہ خطرناک بیماریوں کا علاج ہسپتال ہی میں ممکن ہے۔ بچے کو تدریجاً ہسپتال کے ماحول سے مانوس کیا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر بچے کو ہسپتال میں داخل کرنا پڑ جائے تو وہ اس کے لیے آمادہ ہوگا۔ بہتر ہے کہ پہلے اس بات کی یاد دہانی کروادی جائے کہ تم بیمار ہو، تندرست ہو جاؤ گے لیکن اس کے لیے تمہیں کچھ عرصہ ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ وہاں پر نرسیں اور مہربان ڈاکٹر موجود ہیں جو تمہاری تندرستی کے لیے کوشش کریں گے۔ ہم بھی تمہیں ملے

آتے رہیں گے لیکن آپ اس امر کی طرف متوجہ رہیں کہ بچے سے جھوٹ نہ بولیں۔ جب آپ کو جانا ہے تو اس سے یہ نہ کہیں کہ یہاں سو جاؤ، ہم تمہارے پاس ہی ہیں۔ اس سے یہ نہ کہیں کہ ڈر و موت تمہیں دو انہیں دی جائے گی اور میکہ نہیں لگایا جائے گا۔ اس سے یہ نہ کہیں کہ ہسپتال میں تمہارا وقت خوب گزرے گا کیونکہ یہ تمام باتیں خلافِ حقیقت ہیں۔ ان سے بچے کا اعتماد جاتا رہتا ہے بلکہ اس سے یہ کہیں کہ تم جیاد ہو اور تمہارے علاج کے لیے ہسپتال میں داخلے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ ہسپتال میں داخلے کے بعد جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی عیادت کے لیے جائیں۔ اس کے پاس ٹھہریں اور اس کے لیے خوشی اور آرام و راحت کا باعث بنیں۔

معتدل خوف

معتدل خوف کے معاملے میں مرتبی کو چاہیے کہ ایک معتدل اور عاقلانہ روش اختیار کرے۔ بچے کے سامنے خطرناک موضوعات چھیڑے اور اسے ان سے بچنے کی تدابیر بتائے۔ نیز اسے بے احتیاطی کے بڑے نتائج سے ڈرائے۔ اسے گیس، ماچس اور برقی اشیا کے استعمال کا درست طریقہ سمجھائے۔ اسے ممکنہ خطرات کے بارے میں آگاہ کرے۔ اسے سڑک پار کرنے کا صحیح طریقہ بتائے۔ گاڑیوں کی آمد و رفت کے ممکنہ خطرات اس سے بیان کرے اور بچے کو اس بات پر ابجدے کہ وہ اجتماعی قوانین، خصوصاً ٹریفک قوانین کی پابندی کرے اور اسے قانون کی خلاف ورزی کے ممکنہ بڑے نتائج سے ڈرائے۔ مجموعی طور پر احتمالی خطرات کی اس کے سامنے وضاحت کرے اور ان سے اسے ڈرائے اور ان سے بچنے کا طریقہ اسے سمجھائے لیکن اس امر میں مبالغے سے کام نہ لے۔ مبالغہ آرائی سے ایسا کام نہ کرے کہ بچہ وحشت و اضطراب میں گھر جائے، ڈر پوک اور دوسرا سی بن جائے اور یوں سمجھنے لگے کہ اس کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔ کوشش یہ کرنا چاہیے کہ اس میں توکل علی اللہ اور امید خدا کا جذبہ پیدا ہو۔ خوف کا ایک صحیح مقام موت کا ڈر ہے البتہ موت سے خوف اگر حد سے تجاوز کر جائے تو یہ بھی ایک نفسیاتی بیماری بن جاتا ہے۔ یہ بیماری انسان سے روحانی آرام و سکون چھین لیتی ہے اور اس کی علی صلاہتوں کو ناکارہ کر دیتی ہے لہذا اس کے لیے بھی حفاظتی تدابیر ضروری ہیں۔

کچھ عرصے تک پھر اصل موت کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا۔ بہتر یہ ہے کہ مرنے والے حضرات اس بارے میں بات نہ کریں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچہ اپنے کسی واقعہ کا ریا رشتے دار کے مرنے سے موت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایسے موقع پر وہ ماں باپ سے موت کے بارے میں سوالات پوچھے۔ اگر اس وقت پھر رشد و تیز کے سن کو پہنچ چکا ہو تو ماں باپ اسے اس قبضے کی حقیقت بتادیں۔ اس سے کہیں کہ موت کوئی خالی چیز نہیں ہے۔ انسان مرنے کی وجہ سے اس جہان سے دوسرے جہان میں منتقل ہو جاتا ہے، اُسے جہانِ آخرت کہتے ہیں۔ اس جہان میں انسان کو اچھے کاموں کا ثواب ملے گا اور بُرے کاموں پر اُسے عذاب ملے گا، سب نے مرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

”تمام لوگ مر جائیں گے“

موت اہم چیز نہیں ہے بلکہ اہم یہ ہے کہ انسان بُرے کام نہ کرے اور اچھے کام کرے تاکہ مرنے کے بعد وہ آرام سے رہے۔

موت کی یاد حد سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے اور اسے دوسرے مقام تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ ایسا ہونا نقصان دہ ہے جب کہ اسی یاد سے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

خوف کا ایک مثبت مقام خوفِ خدا یا خوفِ قیامت ہے۔ یہ خوف بھی اگر ایک نفعی یا عیاری کی صورت میں نہ ہو تو نہ فقط یہ کہ بُرا نہیں ہے بلکہ انسان کی دنیاوی اور آخری سعادت کے لیے بہت مفید ہے۔ خوفِ الہی اور عذابِ آخرت کا خوف انسان کو نیک کاموں پر ابھارتا ہے اور بُرے کاموں سے روکتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں لوگوں سے فرماتا ہے:

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ

اگر تم اہل ایمان ہو تو دوسروں سے نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرو۔ (آل عمران - ۱۵۵)

نیز قرآن قیامت کی مشکلات اور عذاب کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ لہذا ایک عقل مند، سمجھ دار اور متدین مرنے کی کوشش کرتا ہے کہ خوفِ الہی اگاہ سے خوف اور خوفِ قیامت کا بیج بچے کی حساس روح میں اس کے بچپن ہی میں بُو دے تاکہ رفتہ رفتہ وہ لشوہ نما پالے

اور بڑا ہو کر اس کا نیک ثمرہ ظاہر ہو۔

البتہ اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ ایک بہترین مربی کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ ہمیشہ دوزخ اور عذاب دوزخ کا ذکر کرتا رہے اور اللہ کو سخت، جابر شخص کی حیثیت سے متعارف کروائے بلکہ اس کی رحمت، مہربانی، شفقت اور لطف کی صفت کا زیادہ تذکرہ کرے۔ اس کے ذریعے سے اللہ کو محبوب کے طور پر منوائے اور لوگوں کو گناہ کے عذاب اور اللہ کی عظمت سے اس طریقے سے ڈرائے کہ وہ ہمیشہ خوف ورجاء کی حالت میں رہیں۔

کھیل کود

جیسے سانس لینا بچے کے لیے ضروری ہے ایسے ہی کھیل کود اس کے لیے ایک فطری امر ہے۔ پرائمری و مڈل میں بچے کی سب سے بڑی سرگرمی اور مشغولیت کھیل ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کم ہو جاتی ہے اور پھر ضروری کام اُس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کھیل کے لیے بچے کے پاس دلیل نہیں ہے۔ البتہ وہ ایسا نہیں کر سکتا کہ کھیلے نہ۔ بچہ ایک موجود زندہ ہے اور ہر موجود زندہ کو چاہیے وہ فعال رہے۔ کھیل بھی بچے کے لیے ایک قسم کی فعالیت اور کام ہے۔ بچے کا نہ کھیلنا اس کی بیماری اور ناتوانی کی علامت ہے۔ اسلام نے بھی بچے کی فطری ضرورت کی طرف توجہ دیتے ہوئے حکم دیا ہے کہ اُسے آزاد چھوڑا جائے تاکہ وہ کھیلے۔

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا:

بچے کو سات سال تک آزاد چھوڑ دیں تاکہ وہ کھیلے لے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ بچوں کے پاس سے گزرے کہ جو مٹی سے کھیل رہے تھے آپ کے بعض اصحاب نے انہیں کھیلنے سے منع کیا۔

رسول اللہ نے فرمایا:

انہیں کھیلنے دو مٹی بچوں کی چراگاہ ہے لے

کھیل بچے کے لیے ایک فطری ورزش ہے۔ اس سے اس کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کی فہم اور عقلی قوتوں کو کام میں لاتی ہے اور اسے مزید طاقت عطا کرتی ہے۔ بچے کے اجتماعی جذبات اور احساسات کو بیدار کرتی ہے۔ اسے معاشرتی زندگی گزارنے اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ماہرین نفسیات کھیل کے اصلی محرک کے بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے جو تحقیقات کی ہیں وہ ہمارے کام کی ہرگز نہیں ہیں ہمارے لیے جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس فطری امر سے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے استفادہ کریں اور اس کی آئندہ کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اسے کام میں لائیں۔ ایک ذمہ دار مہربانی کو نہیں چاہیے کہ وہ کھیل کو بس ایک مشغولیت شمار کرے اور اس حساس اور پر اہمیت عرصے کو بے وقعت سمجھے۔ بچہ کھیل کے دوران خارجی دنیا سے آشنا ہوتا ہے۔ خدائق سمجھنے لگتا ہے۔ کام کرنے کا انداز سیکھتا ہے۔ خطرات سے بچتا اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم دست ہونے، مشق کرنے اور مہارت حاصل کرنے کا انداز سیکھتا ہے۔ اجتماعی کھیل میں وہ دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا اور اجتماعی قوانین کی پابندی کرنا سیکھتا ہے۔

ولیم اسٹرن لکھتے ہیں :

کھیل صلاحیتوں کے رشد و نمو کا ایک فطری ذریعہ ہے یا آئندہ کے اعمال کے لیے ایک ابتدائی مشق کے مانند ہے۔

ایکسی یکسیم و بیچ گرد کی لکھتے ہیں :

کھیل بچوں کے لیے جہانِ احراک کی طرف راستہ ہے۔ وہ راستہ کہ جس پر وہ زندگی گزارتے ہیں، وہ راستہ کہ جس پر بدل کے انہیں جانا ہے۔ کھیلنے والا بچہ اچھلنے کودنے کی ضرورت پوری کرتا ہے چیزوں کے خواص سے آشنا ہوتا ہے۔ کھیل بچے کو آداب معاشرت سیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ بچے نے

جو کچھ دیکھا ہوتا ہے اور جو کچھ وہ جانتا ہے اُسے کھیل میں ظاہر کرتا ہے۔ کھیل اس کے احساس کو مزید بڑھا کر دیتا ہے اور اس کے تصورات کو واضح تر بنا دیتا ہے۔ بچے گھر بناتے ہیں۔ کارخانہ تعمیر کرتے ہیں۔ قطب شمالی کی طرف جاتے ہیں۔ فضا میں پرواز کرتے ہیں، سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور گاڑی چلاتے ہیں۔

آئمن سمیونوویچ ماکاروف جو روس کے معروف ماہر امور پرورش ہیں، کہتے ہیں، کھیل میں بچہ بیٹا ہوتا ہے، بڑا ہو کر کام میں بھی ویسا ہی ہو گا۔ کیونکہ ہر کھیل میں ہر چیز سے پہلے فکر و عمل کی کوشش کا فرما ہوتی ہے۔ اچھا کھیل اچھے کام کے مانند ہے۔ جو کھیل آشکار ہوتا ہے اس میں بچے کے احساسات اور آرزوئیں ظاہر ہوتی ہیں۔ کھیلنے والے بچے کو غور سے دیکھیں۔ اُسے دیکھیں کہ جو پروگرام اس نے اپنے لیے بنایا ہے اُس پر کیسے حقیقت پسندی سے عمل کرتا ہے۔ کھیل میں بچے کے احساسات حقیقی اور اصلی ہوتے ہیں۔ بڑوں کو ان سے کبھی بھی بے اعتنائی نہیں رہنا چاہیے۔
ولیم میکڈولگی رقم طراز ہیں:

قبل اس کے کہ فطرت میدانِ عمل میں داخل ہو، کھیل کسی شخص کے فطری میدان کا مظہر ہوتا ہے۔

لہذا بچہ اگرچہ کھیل میں ظاہر کوئی اہم مرسوم کام انجام نہیں دے رہا ہوتا لیکن اس کے باوجود کھیل کام سے کوئی نمایاں فرق بھی نہیں رکھتا۔ اسی کھیل کے دوران میں بچے کے فطری اور ذاتی میلانات ظاہر ہوتے ہیں اسی میں اس کا اجتماعی و انفرادی کردار صحت پذیر ہوتا ہے اور اس کے مستقبل کو روشن کرتا ہے۔

لے رمان شناسی تجربی کو دک صفحہ ۱۳۰

لے رمان شناسی کو دک از ڈاکٹر جلالی صفحہ ۳۳۲

بچے کے سر پرستوں کو چند قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

بعض ایسے ہیں جو کھیل کو بچے کا عیب اور بے ادبی کی علامت سمجھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ حقیقی المقدور بچے کو کھیل سے باز رکھیں تاکہ وہ آرام سے ایک گوشے میں بیٹھا رہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو بچوں کے کھیل کے مخالف نہیں ہیں اور وہ بچے کو کھیلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے کھیل میں کوئی دخل بھی نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ بچہ خود ہی اچھی طرح جانتا ہے کہ کسے اور کس چیز سے کھیلنا جائز ہے۔

تیسری قسم ایسے سر پرستوں کی ہے جو بچوں کے کھیل کے لیے مشغولیت کے علاوہ کوئی ہدف نہیں سمجھتے۔ وہ کھیل کے مقصد کی طرف توجہ کیے بغیر بچوں کے لیے کھیل کا سامان خریدتے ہیں کھیل کا اچھا بڑا سامان خرید کر بچوں کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں اور اپنے گھر کو کھیل کے سامان کی دوکان بنا دیتے ہیں لیکن بچوں کے کھیل میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتے۔ بچہ اپنی مرضی سے کھیلتا ہے، بگاڑتا ہے اور پھینک دیتا ہے۔ ہنسا ہے اور خوش ہوتا ہے اور اپنے خوبصورت کھلونوں کی بناء پر دوسروں پر فخر کرتا ہے۔

چوتھی قسم ایسے سر پرستوں کی ہے جو نہ صرف بچے کو کھیل کی اجازت دیتے ہیں بلکہ ان کے کھیل پر پوری نظر بھی رکھتے ہیں۔ اور اگر کوئی مشکل پیش آجائے تو وضاحت کرتے ہیں اور اس مشکل کو حل کرتے ہیں۔ بچے کو موقع نہیں دیتے کہ مشکلات میں اپنی فکر و عقل کو استعمال کرے اور اپنی صلاحیت سے مشکلات کو حل کرے۔ اس طرح سے بچے میں خود صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اور اس کی قوت ارادی پر دان نہیں چڑھتی بلکہ وہ تمام تر ماں باپ پر انحصار کرتا ہے کہ وہ فوراً اس کی مدد کر لیں۔

ان چاروں میں سے کوئی طریقہ بھی پسندیدہ اور سودمند نہیں ہے کہ جسے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے مفید اور بے نقص قرار دیا جائے۔ ہر ایک میں ایک یا زیادہ نقص موجود ہیں۔

بہترین روش کہ جو ایک مذموم مار اور آگاہ مربی اختیار کر سکتا ہے یہ ہے کہ اولاً: بچے کو کالاً آزاد چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے میلان کے مطابق کھیلے۔

ثانیاً: اس کے کھیلنے کے لیے ضروری چیزیں فراہم کرے۔

مثلاً: کھیل کے لیے ایسی چیزوں کا انتخاب کرے کہ جن سے بچے کی فکری اور دماغی صلاحیتوں کو تقویت پہنچے۔ اور دوسری طرف اس میں کوئی فنی پہلو بھی موجود ہونا چاہیے جو بچے کو مفید کاموں کے لیے تشویق کرے اور اسے اجتماعی اور معاشرتی امور اور کاموں کی انجام دہی پر آمادہ کرے کھیلوں کی زیادہ تر چیزیں وقت اور پیسے کے ضیاع کے علاوہ کچھ فائدہ نہیں رکھتیں۔ مثلاً اگر آپ اس کے لیے بجلی سے چلنے والی کار یا ریل گاڑی خریدیں یا کوئی اور چیز۔ خریدیں تو آپ کا بچہ صرف ایک تماشہ گزبن جائے گا۔ سارا دن اسی میں گمن رہے گا۔ اسے دیکھے گا۔ ہنسنے گا۔ نہ اس میں کوئی اس کی فکر استعمال ہوگی۔ نہ کوئی ایسی چیز یاد کر سکے گا جو آئندہ زندگی میں اس کے کام آ سکے۔

کھیلنے کے لیے بہترین چیزیں کھیل کا وہ سامان ہے جو فنی پہلو رکھتا ہو اور نامکمل ہو جسے بچے مکمل کریں مثلاً کسی عمارت کے مختلف حصے اور ٹکڑے ہوں۔ نامکمل تصویریں، سلائی اور کڑھائی کا سامان، بجلی کی لائن بچانے اور دیگر میکانیکی کام۔ اسی طرح بڑھی اور دیگر فنون سے متعلقہ چیزیں۔ زراعت اور درخت لگانے میں درکار اشیاء، ٹریکٹر، ادھکیتی باڑی کی مشینیں۔ دھال گبنے اور کپڑے بننے کی مشینیں، ڈرائنگ اور مصوری و نقاشی کی اشیاء۔ الگ الگ الف، ب، اسی طرح سکھانے اور بنانے کی چیزیں اور مجموعی طور پر کھیل کا وہ سب سامان کہ جو بچے کے کام آ سکے اور وہ اسے بناتا رہے بگاڑے پھر بنائے اور اس طرح سے اپنے تجربے اور سچائی کو بڑھاتا رہے کھیل کا ایسا سامان بچے کی دماغی صلاحیت کو تقویت پہنچاتا ہے اور اسے مفید اجتماعی کاموں کی طرف راغب کرتا ہے اور اسے تعمیری اور پیداواری سرگرمیوں کے لیے اجاتا ہے۔ یہ کہ اسے ایک تماشائی اور صرف اور خرچ کرنے والا بنا دیتا ہے۔

اس کے بعد بچہ کو راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے تو ایک اچھا مربی بچوں کے کھیل کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور اس پر نظر رکھتا ہے کھیل کی انحرافی بذات خود ایک طرح کی تعلیم و تربیت ہے۔

ایک اگاہ اور ذمہ دار مربی کھیل کا مفید سامان بچے کے سپرد کرنے کے بعد اسے آزاد چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ کھیلے اور اس میں اپنی فکر کو استعمال کرے لیکن بالواسطہ کھیل کی نگرانی

کرتا ہے اور جہاں ضروری ہو اس کی مدد کرتا ہے۔

مثلاً اگر اس کے لیے کوئی گاڑی یا ٹیل گاڑی خریدتا ہے تو اس سے پوچھے کہ کار اور ریل گاڑی کس کام آتی ہے۔ بچہ سوچنے کے بعد جواب دیتا ہے مسافروں اور سامان کو لے جانے کے لیے۔ پھر وہ مزید اس میں دخالت نہیں کرتا۔ بچہ خود سوچنے لگتا ہے کہ اس پر سامان اور مسافر سوار کرے اور اگر اس کام میں کوئی کمی ہو اور کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو وہ خود اسے مہیا کرے گا۔ اگر گاڑی میں یا کسی اور کھلونے میں کوئی فنی خرابی پیدا ہو جائے تو نہ آپ خود اس خرابی کو دور کریں اور نہ اس کے لیے کوئی اور کھلونا خریدیں۔ بلکہ خود بچے کو تشویق کریں کہ وہ اس کی خرابی کو دور کرے اور مجموعی طور پر پاس کے مسائل حل کرنے میں بلا واسطہ دخالت نہ کریں۔ بلکہ اس سلسلے میں خود بچے سے کام لیں اور اس کی راہنمائی کریں تاکہ اس میں اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہو اور اس کا ذوق اور ہنر ظاہر ہونے لگے۔ اگر آپ اپنی بیٹی کے لیے گڑیا خریدیں تو اسے بالکل کامل صورت میں نہ خریدیں بلکہ اس کی تکمیل کرنے کے لیے خود بیٹی سے کہیں۔ اگر آپ بیٹی سے پوچھیں کہ اس گڑیا کے لیے کیا چیز ضروری ہے تو وہ سوچنے کے بعد جواب دے گی کہ اسے لباس کی ضرورت ہے۔ پھر آپ اسے کپڑا دے سکتے ہیں تاکہ وہ اس کے لیے لباس تیار کرے۔ آپ کی راہنمائی میں وہ اپنی گڑیا کے لیے لباس تیار کرے گی۔ اسے پہنائے گی۔ اس کے کپڑے دھوئے گی۔ گڑیا کے لیے کھانا تیار کرے گی۔ اس کا منہ دھوئے گی۔ اسے نہلائے گی۔ اسے سدا دے گی۔ پھر اسے جگائے گی پھر اسے جہاں کے طور پر لے جائے گی۔ پھر اس کو بات کرنا اور ادب و آداب سکھائے گی۔ اس طرح سے بیٹی گڑیا سے کھیلے گی لیکن ایک سو مند مفید اور تعمیری کھیل۔

اس وقت آپ یہ دیکھیں گے آپ کی بیٹی نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے وہ اپنی گڑیا پر آزمائے گی۔ چچا ایک مقلد ہے۔ بہت سے کام اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں اور دوسرے لوگوں کی تقلید میں انجام دیتا ہے۔ کھلونے اس وقت مفید ہیں جب بچہ ان سے کھیلے اور کام اور ہنر سیکھے۔ نہ یہ کہ انہیں حفاظت سے رکھے اور ان کی حرکات کو کافی سمجھے اور دوسرے بچوں پر غر کرے۔ کھلونوں کے لیے ایک مخصوص جگہ ہونا چاہیے جہاں بچہ کھیل کے بعد انہیں رکھ سکے۔

اس جگہ کی صفائی اور تنظیم و ترتیب بچے کے ذمے ہونی چاہیے۔

کھلونے بہت زیادہ نہیں ہونے چاہئیں کہ بچہ اُن میں الجھا رہے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ اسے کس کے ساتھ کھیلنا ہے بلکہ ضروری مقدار پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ کھلونے بہت خوبصورت اور مہنگے ہوں۔ خود بچہ کاغذ، گتے، ڈبے، ٹکٹوں وغیرہ کے ذریعے کھلونے بنا سکتا ہے یا جو کھلونے اس نے خریدے ہیں انہیں مکمل کر سکتا ہے۔

جمعی طور پر کھیل کو چند قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- ۱۔ انفرادی کھیل کہ جس میں بچہ خود اکیلا ہی کھیل سکتا ہے۔
- ۲۔ اجتماعی کھیل کہ جو دوسروں سے مل کر کھیلا جاتا ہے۔
- ۳۔ فکری کھیل کہ جو فہم و ادراک کو تقویت پہنچاتا ہے۔
- ۴۔ ورزشی کھیل کہ جو جسم اور چٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔
- ۵۔ حملے اور دفاع کا کھیل کہ جس میں کھلاڑی حملہ اور دفاع کے بارے میں سیکھتا ہے۔
- ۶۔ ایک دوسرے سے تعاون کر کے کھیلا جانے والا کھیل کہ جس میں دوسروں سے تعاون کی روح کو تقویت پہنچانی جاسکتی ہے۔

ابتداء میں بچہ انفرادی کھیل کھیلتا ہے۔ اس مرحلے میں بچے کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ کھلونے سے کھیلتا رہے۔ لیکن مربی کی ذمہ داری ہے کہ اُس کے کھیل پر نظر رکھے اس کے لیے کھلونوں کا انتخاب کرے اس کی دماغی قوت کو کام میں لائے اور اس کی سوجھ بوجھ میں اضافہ کرے۔ دوسری طرف، مربی یہ بھی دیکھے کہ بچے کا کھیل فنی اور پیداواری پہلو بھی رکھتا ہو تاکہ اسے مفید اجتماعی کاموں کا عادی بنایا جاسکے۔ کبھی بچہ یہ چاہ رہا ہوتا ہے کہ اپنا کوئی کھلونا توڑ بگاڑ دے اور پھر اسے دوبارہ ٹھیک کرے۔ اس کام میں آزادی دینا چاہیے کیوں کہ وہ تجربہ کرنا چاہتا ہے اور اس کے فنی پہلو کو سیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اُسے کوئی مثل درمیان آجائے تو مربی کو چاہیے کہ اس کی راہنمائی کرے۔

پھر عرصے بعد بچہ کسی حد تک اجتماعی مزاج کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر اُسے اجتماعی اور گروہی کھیل پسند ہوتے ہیں۔ جب مربی دیکھے کہ بچہ معاشرے کی طرف متوجہ

ہے اور اجتماعی کھیل کھیلنے کا آرزو مند ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ بچے کا یہ اجتماعی جذبہ دن بدن ترقی کرتا جائے۔ اس مرحلے پر بھی مربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچے کے کھیل پر نظر رکھے اور اسے مفید اجتماعی کھیلوں کی طرف راہنمائی کرے۔ زیادہ مروج کھیلیں فٹ بال، والی بال اور باسکٹ بال ہیں۔ اکثر بچے اسکول میں اور اسکول سے باہر اپنے فارغ اوقات انہی کھیلوں میں گزارتے ہیں۔ یہ کھیلیں اگرچہ پٹھوں کی ورزش اور مضبوطی کے لیے سودمند ہیں لیکن یہ امر باعث افسوس ہے کہ ان کھیلوں میں ایک بہت بڑا نقص بھی ہے وہ یہ کہ حملہ آور ہونے کی کھیلیں ہیں اور ایسی کھیلیں بچے میں جنگجوئی اور تشدد پسندی کا مزاج پیدا کرتی ہیں۔ ان کھیلوں میں حصہ لینے والے بچوں کی پوری توجہ اس جانب مبذول ہوتی ہے کہ اپنے ساتھیوں یعنی دوسرا انسانوں پر کس طرح برتری حاصل کی جائے اور انہیں کیسے مغلوب اور شکست خوردہ کیا جائے اور یہ انسان کے لیے ایک بڑی صفت ہے۔ ان کھیلوں میں اگرچہ تعاون بھی ہوتا ہے لیکن یہ تعاون بھی دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی نیت سے ہوتا ہے۔ ان کھیلوں سے بھی بدتر کشتی اور باکسنگ ہے۔ جو کہ ابتدائی انسان کے وحشی پن کی ایک کامل یادگار ہے۔ کاش اس طرح کے کھیل بالکل رائج نہ ہوتے اور ان کی جگہ ایسے کھیل مرسوم ہوتے جن میں اجتماعی تعاون کی روح کارفرما ہوتی اور بچوں میں انسان دوستی کے جذبے کو تقویت ملتی اور وہ فائدہ مند پیداواری سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ رسل اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

آج کی انسانیت پہلے کی نسبت بہت زیادہ فکری پرورش اور باہمی تعاون کی عتاج ہے کہ جن کا سب سے بڑا دشمن مادہ پرستی ہے۔
انسان رقابت آمیز اعمال اور مزاحمت و حسد کا متلع نہیں ہے کیونکہ یہ تو وہ چیزیں ہیں کہ جو کبھی انسان پر غالب آجاتی ہیں اور کبھی وہ ان پر غالب آجاتا ہے۔

۱۔ ایران میں یہی کھیل زیادہ رائج ہیں (مترجم)

۲۔ در تربیت ص ۱۲۱

باعث، انہوں نے کہ سرپرست حضرات نہ فقط یہ کہ اس امر کے بارے میں نہیں سوچتے بلکہ دانستہ یا نادانستہ ایسے کھیلوں کی بہت زیادہ ترویج کر رہے ہیں اور بچوں اور نوجوانوں کو حد سے زیادہ ان میں مصروف کر رہے ہیں۔ اسے کاش! اسکولوں اور کالجوں کے سمجھدار اور ذمہ دار سرپرست اس بارے میں کوئی چارہ کار سوچتے اور ہمدرد ماہرین کے ذریعے فائدہ مند اجتماعی کھیلوں کو رواج دیتے جو ایسے مذکورہ کھیلوں کی جگہ لے سکتے۔

اس سلسلہ بحث کے آخر پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بچے کو اگرچہ کھیل کی ضرورت ہے اور یہ اس کے لیے ضروری ہے لیکن کھیل کے اوقات محدود ہونے چاہئیں۔ ایک سمجھدار اور باشعور مربی بچے کے کھیل کے اوقات اس طرح سے مرتب کرتا ہے کہ بچہ خود بخود اجتماعی اور سودمند پیداواری سرگرمیوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یوں زندگی کے دوسرے مرحلے میں کھیل کو چھوڑ کر حقیقی اور سودمند کام انجام دینے لگتا ہے۔ ایسا مربی اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ بچے کا مزاج ہی کھیل کود کا بن جائے اور اس کا کمال ہی کھیل کود بن جائے اور وہ اس بات پر فخر کرنے لگے کہ میں بہترین کھلاڑی ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

جو کھیل کا رسیا ہو گا کامیاب نہ ہو سکے گا۔

رسول اسی کے متعلق لکھا ہے:

یہ نظریہ کہ کسی انسان کی شخصیت کا میار کھیل میں اُس کا سابقہ ہے، ہمارے

سماجی مجموعہ منزل کی علامت ہے کہ ہم یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ ایک جدید اور پیچیدہ

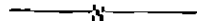
دنیا میں رہنے کے لیے معرفت اور تفکر کی ضرورت ہے۔

اجتماعی کھیلوں کی ایک مشکل یہ ہے کہ ان سے بچوں میں کدورت اور لڑائی جھگڑا

پیدا ہو جاتا ہے۔ اکٹھے کھیلنے والے بچے کبھی ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔

ایسے موقع پر سر پرست حضرات کی ذمہ داری ہے کہ فوراً دخالت کریں اور ان میں صلح و محبت پیدا کر کے انہیں کھیل میں مشغول کر دیں یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں ہے کیونکہ ابھی تک عناد اور دشمنی بچوں کے دل میں جڑ پیدا نہیں کر چکی ہوتی۔ اس لیے وہ بہت جلد ایک دوسرے سے پھر گھل مل جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے بعض اوقات بچوں کا جھگڑا بڑوں میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ کہ جو عقل مند ہیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ماں باپ بغیر تحقیق کے اور کوئی بات سمجھے بغیر اپنے بچے کا دفاع شروع کر دیتے ہیں اور یہ امر کبھی بڑائی بھگڑے مار پیٹ یہاں تک کہ کبھی تھانے تک جا پہنچتا ہے۔ جب کہ ایسا کرنے سے بچوں کی غلط تربیت ہوتی ہے اور یہ بچے پر بہت بڑا ظلم ہے جو بچہ ایسے واقعے کو دیکھتا ہے جو چاہے کہ سچی حقیقت کی کوئی اہمیت نہیں اور کسی کو سچی سے سر دکا نہیں اور ہر ماں باپ تعصب کی بنا پر اپنے بچے کا دفاع کر رہے ہیں۔ اس طرح کا بچہ بے جا تعصب اور سخی کشی کا عملی سبق اپنے ماں باپ سے لیتا ہے اور کل کے معاشرے میں اس کے کام لیتا ہے۔



خود نمائی

خود نمائی اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کا احساس ہر ایک میں تھوڑا بہت موجود ہے۔ ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جاذب نظر اور اہم کام انجام دے کر اپنی شخصیت و اہمیت دوسروں پر ثابت کر سکے تاکہ دوسرے اسے سراہیں، اس کی قدر پہچانیں اور اس کے وجود کو غنیمت شمار کریں۔ تقریباً ایک سال کی عمر کے بعد اس فطری خواہش کی علامتیں بچے میں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ بچہ کوشش کرتا ہے کہ محفل میں ایک سے دوسری جگہ جاتا رہے اور اپنی حرکات سے دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر دے۔ جس کام سے اس کے ماں باپ اور دوسرے لوگ خوش ہوں اور وہ ہنسیں ان کا تکرار کرتا ہے، انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اپنی کامیابی پر فخر کرتا ہے۔ کبھی اشارے اور کبھی تصریح کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ دیکھیں میں کتنا اہم کام انجام دے رہا ہوں۔

خود نمائی کی خواہش فی نفسہ کوئی بری صفت نہیں ہے۔ یہی درونی احساس انسان کو کوشش اور جدوجہد کے لیے ابھارتا ہے تاکہ وہ سبق پڑھ کر بہترین نمبر حاصل کرے یا بہترین مقرر بن جائے یا اچھا خطیب قرار پائے یا ماہر مصور ہو جائے یا ایک زبردست شاعر بن جائے یا ایک اچھا مصنف بن جائے یا ایک اچھا صنعتی ماہر ہو جائے۔

اس صفت کا اصل وجود برّائیاں نہیں لیکن اہم بات اس سے استفادہ ہے۔ اگر اس خواہش کی درست راہنمائی کی جائے اسے صحیح طریقے سے سیراب کیا جائے تو یہ بہترین نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ ابتدائی طور پر بچہ اچھے اور بُرے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ہر کام کی اچھائی

یا بُرائی کا معیار اس کے لیے یہ ہے کہ اس کے والدین اسے پسند کرتے ہیں یا ناپسند۔ ایک اچھا مربی کہ جس کی اس نکتے پر توجہ ہو وہ تحسین و تشویق کے ذریعے بچے کی خود نمائی کی خواہش کی تقویت کرتا ہے۔ اس کے اچھے اور مفید کاموں پر اظہارِ مسرت کرتا ہے اور اس طرح سے اُس میں اچھے اخلاق و آداب کی بنیاد رکھتا ہے اگر اُس سے کوئی غلط اور خفاں ادب کام دیکھتا ہے تو نصرت یہ کہ اظہارِ مسرت نہیں کرتا بلکہ اپنی نادانیاں اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتا ہے اور اس طرح سے اُس عمل کی بُرائی بچے کو سمجھاتا ہے۔ اس کی طرف سے تحسین و تعریف سچی سمجھی اور حقیقت کے مطابق ہوتے ہیں اور اس بارے میں وہ تھوڑی سی بھی ہل انگاری اور غفلت نہیں کرتا۔ اور اس طریقے سے وہ بچے کو اچھائیوں کی طرف جذب کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

البتہ بعض نادان ماں باپ اس بارے میں افراط سے کام لیتے ہیں۔ بچے کے ہر کام پر اگرچہ وہ غلط اور بے ادبی پر مبنی کیوں نہ ہو اظہارِ مسرت کرتے ہیں اور اس طرح سے اس میں ناپسندیدہ اخلاق و آداب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کے بارے میں مبالغہ کرتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر کسی کے سامنے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کی ہمنمائوں کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایسا بچہ ممکن ہے تکبر اور خود پسندی میں مبتلا ہو جائے اور پھر آہستہ آہستہ ایک خود غرض اور جاہ طلب شخص بن جائے اور اپنے لیے ایک بھوٹی شخصیت گھڑے اور لوگوں سے خواہش کرے کہ اس کے ماں باپ کی طرح اس کی موبہم اور خلی شخصیت کی تعریف و توصیف کریں اور اگر وہ اس بارے میں کامیاب نہ ہو تو ممکن ہے اس میں ایک نفسیاتی عقدہ پیدا ہو جائے اور وہ لوگوں کو قدرنا شناس سمجھنے لگ جائے۔ یہاں تک ممکن ہے کہ اپنی خیالی شخصیت کے لیے اور لوگوں کی ناقدری کا بدلہ لینے کے لیے وہ کوئی غلط یا خطرناک اقدام کرے۔ وہ چاہے گا کہ اپنی شکست خوردہ خواہشات کو پورا کرے اور دوسروں کی توجہ اپنی شخصیت کی طرف مبذول کرے چاہے اس کے لیے کچھ بھی ہو جائے۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کے اس

سے استفادہ کریں اور تدبیرِ بجا اس کی تربیت اور تکامل کی کوشش کریں اور اس کی ایک بلند اور بہتر راستے کی طرف راہنمائی کریں۔ ماں باپ کی رضا اور خوشنودی کی جگہ آہستہ آہستہ اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی اس میں نحو پیدا کریں۔ آہستہ آہستہ اس طرح کے چلے کہنے کی بجائے کہ مجھے یہ کام پسند نہیں یا فلاں کام ابو کو پسند نہیں یہ کہیں کہ اللہ کو یہ کام پسند نہیں اور وہ اس کام پر راضی نہیں۔

تقلید

تقلید کی سرشت انسانی فطرت میں موجود قوی ترین جبلتوں میں سے ہے۔ یہ بھی ایک سودمند اور تعمیری سرشت ہے۔ اسی طبیعت کی بدولت بچہ بہت سی رسوم زندگی آداب معاشرت، کھانا کھانا، لباس پہنا، طرز تکلم اور الفاظ اور جملوں کی ادائیگی کا طریقہ ماں باپ اور دوسروں سے سیکھتا ہے انسان ایک متقلد ہے اور اپنی پوری زندگی میں دوسروں کی تھوڑی یا زیادہ تقلید کرتا ہے لیکن ایک سے پانچ چھ سال کی عمر کے دوران اُس میں یہ سرشت زیادہ نمایاں ہوتی ہے، بچہ ایک عرصے تک چیزوں کے حقیقی مصالح اور مفاسد سے ہرگز آگاہ نہیں ہوتا وہ اپنے کانوں کے پیچھے ایک عائق بنا اور درست حد کا تعین نہیں کر سکتا اس مدت میں اس کی تمام تر توجہ ماں باپ اور اور گرد کے دوسرے لوگوں کی طرف ہوتی ہے ان کے اعمال اور حرکات کو دیکھتا ہے اور ان کی تقلید کرتا ہے۔

لفظ پانی ماں باپ سے سنا ہے تقلید کرتے ہوئے وہی لفظ اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔ پھر اس کے معنی کی طرف توجہ کرتا ہے پھر اسے اس کے موقع پر استعمال کرتا ہے۔ ایک بچی دیکھتی ہے کہ ماں صفائی کرتی ہے اور کپڑے دھو رہی ہے وہ بھی بالکل ایسے ہی کام انجام دیتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ ماں آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتی وہ بھی اس سے بچتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ وہ چلوں کو دھوتی ہے ان کے پھلکے اتارتی ہے اور پھر کھاتی ہے وہ بھی یہی عادت اپنا لیتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ امی ابرا اور اس کے بہن بھائی گھر کے امور میں منظم ہیں اور ہر چیز کو اس کی مخصوص جگہ پر رکھتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں اس نظم کے بارے ان کی تقلید کرتی ہے

وہ دیکھتی ہے کہ اس کے ماں باپ ادب سے بات کرتے ہیں وہ بھی مؤدب ہو جاتی ہے وہ دیکھتی ہے کہ گھر کے چلانے میں ماں باپ اور بہن بھائی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں وہ بھی اس تعاون میں اپنا حصہ ادا کرتی ہے۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ سڑک عبور کرتے ہوئے اس کے ماں باپ اس جگہ سے عبور کرتے ہیں جہاں لائیں لگی ہوئی ہیں وہ بھی یہی کام انجام دیتی ہے اور رفتہ رفتہ اسے اس کی عادت پڑ جاتی ہے جب بیٹا دیکھتا ہے کہ اس کا باپ باغبانی کرتا ہے یا لکڑی کا کام کرتا ہے یا تعمیر کا کام کرتا ہے — — وہ بھی شروع شروع میں وہی کام کھیل کی طرح انجام دیتا ہے اور یہی کھیل ممکن ہے اس کی زندگی کے آئندہ پیشے کے طور پر مؤثر ہو۔

بچے کی تعلیم و تربیت اور اس کی تعمیر میں تقلید کا اثر و عظم و نصیحت سے زیادہ ہوتا ہے۔ تقلید خود بخود انجام پاتی ہے اور اس کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی کہ دیکھائی کیا کر رہی ہے بلکہ کہے بغیر ہی وہ اپنی اور ابا کے کام کی طرف پوری توجہ دیتا ہے۔ ایک منکبہ بد اخلاق بے ادب اور بد زبان باپ اپنے بچے کے لیے سر مشق قرار پائے گا۔ اور ایک ہٹ دھرم اگستاخ، بے ادب اور بد زبان ماں اپنے ننھے بچے کو ایسی ہی بری صفات سے چمکے کر دے گی۔

ایک جھوٹا، بزدل اور خیانت کار مری ایک سچا، شجاع اور امانت دار بچہ پر والہ نہیں چڑھ سکتا۔ بچے آپ کی وعظ و نصیحت اور گفتگو پر کوئی توجہ نہیں کرتے وہ آپ کے اعمال اور کردار کی طرف پوری توجہ کرتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ لہذا تقلید کی مرثت کو اہم تربیتی عوامل میں سے شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس مقام پر ماں باپ اور تمام تربیت کرنے والے ایک بہت ہی بھاری ذمہ داری کے حامل ہیں وہ اپنے کاموں کے بارے میں بے توجہ نہیں رہ سکتے وہ اپنے اچھے اعمال و اخلاق سے اپنے بچوں کے لیے بہترین نمونہ بن سکتے ہیں۔ اگر ماں باپ بُرے ہوں گے تو وہ وعظ و نصیحت سے بچوں کی نیکی اور بھائی کی طرف ہدایت نہیں کر سکتے۔ لہذا جن ماں باپ کو اپنے بچوں سے محبت ہے انہیں چاہیے کہ کوشش کریں کہ پہلے اپنے آپ کی اور گھر کے ماحول کی اصلاح کریں اور اپنے بچوں کے لیے بہترین

نمونہ عمل بنیں۔ خود ایسا عمل کریں جیسا وہ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد عمل کرے و تعلیم سے روکنا بہت مشکل ہے آپ کو شش کریں کہ اپنی اولاد کے لیے بہترین نمونہ عمل بنیں۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر آپ دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی اصلاح کریں یہ بہت بڑی برائی ہے کہ آپ دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور خود فاسد رہیں لے

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا:

اللہ تعالیٰ ان باپ کی نیکی اور پرہیزگاری کی وجہ سے ان کی اولاد اور پھر ان کی اولاد کو صالح اور نیک تربیت دے گا لے

ایک ذمہ دار مربی اپنے بچے کے دوستوں اور ہم جولیوں سے تعلق اور بے توجہ نہیں رہ سکتا کیونکہ بچہ بہت سارے کاموں میں اپنے دوستوں اور ہم جولیوں کی تعلیم کرے گا۔ بعض اوقات بچہ سینما میں یا ٹیلی ویژن کی سکرین پر اداکاروں کو قتل، جرم، چوری، اور چاقو زنی کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے اندر بھی اس سے تحریک پیدا ہوتی ہے اور وہ بھی ویسے ہی اعمال کرنے لگتا ہے۔ آپ محلوں اور اخباروں میں ان بچوں کے احوال پڑھتے ہوں گے کہ جو قتل، جرم اور چوری کے مرتکب ہوتے ہیں اور بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ سینما اور ٹیلی ویژن میں انہوں نے جو پولیس کے کام دیکھے یا قتل اور جرم کے مناظر دیکھے تو وہ ان میں تحریک پیدا کرنے کا عامل بن گئے۔ ایسی صورت میں کیا بچوں کو ایسی چیزیں دیکھنے کے لیے کھلا چھوڑا جاسکتا ہے؟

لے غرار الحکم ص ۲۸

لے مکرم الاخلاق ص ۵۲۶

تلاش حقیقت

جب نومولود دنیا میں آتا ہے تو جہانِ خارج کی اسے کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ہر چیز اُس کے لیے برابر ہے۔ وہ شکلوں میں، رنگوں میں اور لوگوں میں فرق نہیں کر سکتا۔ وہ شکلوں اور آوازوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن انہیں پہچان نہیں پاتا۔ لیکن اسی وقت سے اس میں تحقیق، جستجو اور چیزوں کے پہچاننے کی شدید خواہش اور تمنا ہوتی ہے۔ وہ مسلسل اس طرف اور اس طرف دیکھتا ہے اور لوگوں کی صورتیں دیکھ دیکھ کے حیران ہوتا ہے۔ بچہ اپنے حواس کے ذریعے اور اپنی تحقیق و جستجو کی لگن سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا ہے اور کسبِ علم کرتا ہے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا:

وَاللّٰهُ أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ .

اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس عالم میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمہیں کان دیتے۔ آنکھیں دیں، دل دیا تاکہ تم راہِ اللہ کی نعمتوں کو پہچانو اور شکر گزار بن جاؤ۔

کچھ مدت کے بعد بچہ جہانِ خارج کی طرف توجہ کرنے لگتا ہے۔ چیزوں کو ہاتھوں سے پڑھ دیتا ہے۔ انہیں حرکت دیتا ہے۔ پھر زمین پر پھینک دیتا ہے۔ منہ میں لے جاتا ہے۔ آوازوں

کی طرف دھیان دیتا ہے۔ آنکھوں سے لوگوں کی حرکتوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ اس طرح سے تلاشِ حقیقت کی خواہش اور حس کو وہ پورا کرتا ہے اور دنیا کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے تحقیق و جستجو کی سرشت نوح انسان کو ودیعت کی ہے تاکہ اپنی کوشش اور جستجو سے اسرارِ جہان کے پردے ہٹائے اور تخلیقِ عالم کا راز پالے۔ بچہ میں فطری طور پر تحقیق اور جستجو کا مادہ ہوتا ہے اور وہ اس سلسلے میں حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ ماں باپ اس ضمن میں بچے کو تشریق و تحریک بھی کر سکتے ہیں اور اس کے اس داخلی احساس کو دبا بھی سکتے ہیں۔ اگر ماں باپ تحقیق سے متعلقہ چیزیں اسے دیں اور اسے یہ آزادی بھی دیں کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق تجربہ کرے اور اس کی عمر کے تقاضے کے مطابق اسے فکری و علمی اعتبار سے جاذب کھلونے خرید دیں تو اس کی تحقیق و جستجو کی روح پر دامن پڑھے گی۔ بچے کی یہ تلاشِ حقیقت کی فطرت ہی بعد ازاں سائنسی اور علمی ایجادات اور انکشافات کا ذریعہ بنتی ہے۔ ایک کمرے میں موجود مختلف چیزیں اگرچہ پُرانی، ٹوٹی پھوٹی اور غیر ضروری ہوں لیکن اس عمر میں بچے کے لیے بہت قابلِ استفادہ اور نمونہ بن سکتی ہیں۔ لیکن اگر ماں باپ بچے کے داخلی احساس کی تسکین نہ کریں اور ضروری چیزیں اس کے اختیار میں نہ دیں اور اسے تحقیق و تجربے سے منع کریں تو تلاشِ حقیقت کی روح اس کے اندر دوب جائے گی۔

اور وہ سائنسی اور تحقیقی امور میں شکست خوردہ اور مایوس ہوگا۔ اس مرحلے سے اہم تر وہ مرحلہ ہے جب بچہ مختلف قسم کے علمی، تحقیقی اور معلوماتی سوالات کرنے لگتا ہے۔ دو سال سے اوپر کی عمر سوالات کی عمر ہے اس عمر میں بچے کی عقل اور سمجھ ایک حد تک کامل ہو چکی ہوتی ہے اور وہ باتیں کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اور ماں باپ سے بہت سے سوالات کرنے لگتا ہے مثلاً میں بعد میں ماں بزرگ یا باپ؟ ابو ہر روز گھر سے باہر کیوں جاتے ہیں؟ پتھر سخت اور پانی نرم کیوں ہے؟ مجھے وادی اماں اچھی نہیں لگتی میں ان کے گھر کیوں جاؤں؟ بارش میں کیوں نہ کھیلوں؟ پھلیاں پانی میں مریں نہیں جاتیں؟ آپ ہر روز نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ نماز کیا ہے؟ سورج رات کو کہاں چلا جاتا ہے؟ بارش اور بر فباری کہاں سے ہوتی ہے؟ یہ ستارے کیا ہیں؟ کس نے ان کو بنایا ہے؟ کبھی اور مجھ کا کیا فائدہ ہے؟ جب

داد اہان مرے تھے تو انہیں مٹی میں کیوں ڈال دیا تھا؟ وہ کہاں گئے ہیں؟ واپس کب آئیں گے؟ یہ موت کیا ہوتی ہے؟ کم و بیش بچوں کے اس طرح کے سوالات ہوتے ہیں بچوں کے سوالات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ عمر اور افراد کے فرق کے ساتھ سوالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ سمجھدار بچے زیادہ گہرے اور زیادہ سوال کرتے ہیں۔ بچوں بچوں ان کی معلومات بڑھتی جاتی ہیں ان کے سوالات دقیق تر ہوتے جاتے ہیں۔ پھر سوالات، اور تحقیق سے خارجی دنیا کی شناخت کے لیے دوسروں کی معلومات اور تجربات سے استفادہ کرنا چاہتا ہے۔ تلاش حقیقت اور جستجو کی سرشت انسان کی بہت ہی قیمتی سرشتوں میں سے ہے۔ اس سرشت کے وجود کی برکت سے انسان نے کمال حاصل کیا ہے۔ جہاں خلقت کے بہت سے اسرار اور راز کشف کیے ہیں۔ اور سائنس اور صنعت میں حیران کن ترقی کی ہے۔ جن ماں باپ کو اپنی اولاد اور انسانی معاشرے کی ترقی اور کمال عزیز ہے وہ اس خدا و صلاحیت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ بعض ماں باپ بچگانہ سوالات کو ایسے ہی بے کار اور فضول سمجھتے ہیں اور جواب دینے کی طرف ہرگز توجہ نہیں دیتے کہتے ہیں بچہ کیا سمجھتا ہے؟ بڑا ہوگا تو خود ہی سمجھ لے گا۔ آخر ہم بچوں کے سوالوں کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ بچوں کے سوالات سن کر کہتے ہیں۔

بیٹا جی! اتنی باتیں نہ کرو۔ ایسے ہی نہ بولتے رہو۔ مجھے کیا پتہ جب بڑے ہو گے تو خود ہی سمجھ لو گے۔ ایسے سوالوں کا وقت نہیں ہے ان کو چھوڑو! یہ میسر بس میں نہیں ہے۔ ایسے ماں باپ اپنے بچے کی قیمتی ترین انسانی صلاحیت کو خاموش کر دیتے ہیں اور اُسے دبا دیتے ہیں اور اس طرح سے اس کی روح اور نفسیات پر بھاری ضرب لگاتے ہیں۔ اس کی عقلی رشد و فنو کو روک دیتے ہیں۔ پھر شکایت کرتے ہیں کہ ان کے بچے میں سائنسی انگشتات سے دلچسپی کیوں نہیں ہے۔ وہ علمی اور سائنسی سوالات حل کرنے میں عاجز کیوں ہے۔ جب کہ خود ہی وہ اس کام کا سبب بنے ہیں۔ اگر اس صلاحیت کی صحیح تشکیل نہ کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ حقیقی راستے سے بھٹک جائے اور بعد ازاں لوگوں کے راز معلوم کرنے اور لوگوں کے اسرار کے بارے میں تجسس کی صورت میں ظاہر ہو۔ بعض ماں باپ اپنے بچوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔

لیکن انہیں ہرگز اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ جواب صحیح ہو وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ چپ کر جائے جواب صحیح ہو یا غلط۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صحیح جواب بچوں کے لیے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ لہذا انہیں مطمئن کرنے کے لیے ایسا جواب دیتے ہیں کہ بس وہ چپ کر جائے ممکن ہے بچہ اس طرح سے دقیق طور پر خاموش ہو جائے۔ لیکن تلاش حقیقت کے بارے میں اس کی خواہش سیر نہیں ہوئی اور کمال کے راستے پر آگے نہیں بڑھی بلکہ گمراہی اور خلاف حقیقت راستے کی طرف بھٹک گئی ہے جب وہ بڑا ہوگا۔ اور حقیقت اسے معلوم ہو جائے گی تو وہ ان ماں باپ کے بارے میں بدین ہو جائے گا جنہوں نے اسے گمراہ کیا تھا بلکہ یہاں تک ممکن ہے وہ ایک شکی قسم کا شخص بن جائے کہ جو ہر کسی کے بارے میں ہر مقام پر بدگمانی کرے۔ لیکن سمجھدار اور فرض شناس ماں باپ اس قیمتی خدا داد صلاحیت کو ضائع نہیں کرتے اور اُس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ بچوں کے سوالات کا صحیح اور قابل فہم جواب دیں۔ پہلے وہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرتے ہیں مطالعہ کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ بچوں سے ان کی زبان میں بات کرتے ہیں اور ان کے سوالوں کی طرف خوب توجہ کرتے ہیں اور جواب دیتے ہیں ہرگز خلاف حقیقت بات نہیں کرتے۔ اگر کسی موقع پر وہ جواب دینے سے عاجز ہوں تو باقاعدہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں اور اس طرح بچے کی تلاش حقیقت کی اس صلاحیت کو بھی ابھارتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بھی سکھاتے ہیں کہ جب کسی چیز کا علم نہ ہو تو لاعلمی کا اظہار کرنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ بعض ماں باپ بچوں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے حد سے بڑھ جاتے ہیں یعنی ایک چھوٹے سے سوال کا جواب دینے کے لیے تفصیلات میں چلے جاتے ہیں اور جو کچھ بھی انہیں معلوم ہوتا ہے سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ یہ کام بھی درست نہیں۔ کیونکہ تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ بچہ زیادہ باتیں سننے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اسے صرف اپنے سوال کے جواب سے غرض ہوتی ہے اور زیادہ باتوں سے وہ تنگ جاتا ہے تحقیق وجوہات بچوں اور نوجوانوں کی تشویق کریں۔ انہیں بحث و استدلال سے آشنا کریں اور جہاں امکان ہو اور ضروری ہو وہاں انہیں تجربے کے لیے بھی ابھاریں۔ بچہ ایک سوچنے والا انسان ہے۔ اس کی سوچ

کو تقویت دیں تاکہ اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں کام آئیں اور وہ اپنے فکر و شعور سے استفادہ کرے اور اپنی آئندہ کی زندگی کے لیے تیار ہو جائے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

بوجھن بچپن میں سوال کر کے بڑا ہو کر جواب دے سکتے گا۔

ایسر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا:

بچے کا دل نرم زمین کے مانند ہے۔ آپ بوجھن اس میں ڈالیں گے قبول کرے گا۔

ایک خاتون اپنے خط میں لکھتی ہے.....

ایک رات ابو گھر آئے اور مجھ سے ایک پہیلی کہی۔ اور کہا کہ میرے ساتھی اس پہیلی کو نہیں بوجھ سکے۔ سب سو گئے لیکن میں نے ارادہ کیا کہ اس کو بوجھ کر ہوں گی۔ اور دیر تک سوچتی رہی اور آخر کار میں نے اسے بوجھ لیا۔ خوشی خوشی میں نے ابو کو جگایا اور انہیں اس پہیلی کا جواب دیا ابو خوش ہو گئے۔ مجھے شاباش دی۔ ابو ہمیشہ فکری قسم کے کام مجھ سے کہتے اور اس سلسلے میں مجھے تشویش کرتے۔ اسی لیے میں فکری مسائل حل کرنے میں طاق ہو گئی ہوں۔ اور زندگی کی مشکلات کو سوچ بچار سے حل کر لیتی ہوں!

۱۷ غرارالحکم ص ۶۲۵

۱۸ غرارالحکم ص ۳۰۲

خود اعتمادی

تمام زندگی جدوجہد، پیکار، کوشش اور جستجو کا نام ہے۔ ہر انسان کو زندگی بھر میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کے لیے اُسے عالم طبیعت کی قوتوں سے نہ چار جنگ کرنا پڑتی ہے اور انہیں تسخیر کرنا پڑتا ہے بجاریوں اور ان کے اسباب کے خلاف لڑنا پڑتا ہے۔ تجاؤں، زیادتیوں اور آرام و آزادی کے خلاف مزاحمت کرنے والے عوامل کے خلاف جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ کارنر زندگی میں دہی کا میاں ہے جس کا دل بڑا ہو، بہت بلند ہو۔ اور ارادہ قوی ہو۔ ہر کسی کی خوش بختی یا بد بختی کی بنیاد خود اس کے وجود میں موجود ہے۔ دنیا کے بڑے انسانوں کی درخشاں کامیابیوں کا سبب ان کی خود اعتمادی، قوت ارادی اور مسلسل کوشش رہی ہے عظیم اور قوی لوگ زندگی کی مشکلات سے نہیں ڈرتے۔ وہ ذاتی استقلال اور خلا پر بھروسہ کرتے ہوئے ان کے خلاف بے سر پیکار ہوتے ہیں۔ اور کمر بہت باندھ کے جدوجہد کرتے ہیں اور انہیں مغلوب کر لیتے ہیں۔ بہت اور عالی حوصلگی ہر مشکل کو آسان بنا دیتی ہے۔ بلکہ جو چیز دوسروں کے لیے محال ہوتی ہے اسے ممکن بنا دیتی ہے۔ وہ زندگی کے گہرے سمندر میں کسی تنکے کی مانند نہیں ہوتے کہ جو فقط لہروں کے سہارے اُدھر اُدھر جھکتے رہیں بلکہ ایک ماہر سیراک کی طرح اپنے قوی بازوؤں، اپنی ارادوں اور توکل الی اللہ سے جس طرف کو چاہتے ہیں تیرتے ہیں بلکہ دنیا کے واقعات کا رخ بدل دیتے ہیں۔ ہر انسان اپنے ذاتی استقلال، خود اعتمادی، ارادے اور جدوجہد سے اپنی زندگی میں کامیاب ہوتا ہے دین مقدس اسلام میں بھی دنیاوی اور دُنیوی

کامیابی و ناکامی کو انسان کے اعمال اور کوشش کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۚ وَأَنَّ سَعْيَكُمْ سُوَّىٰ يُرَىٰ ۚ
 انسان کے لیے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی کوشش کا حاصل ہے اور وہ جلد
 اپنی سعی کو (مجسم) دیکھ لے گا۔ (نجم - ۳۹، ۴۰)
 حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

الْعَصْرُ بِمَعْنَاهُ

ہر کسی کی قیمت اس کی ہمت کے مطابق ہے۔

جو شخص خود استقلال اور خود اعتمادی کا حامل ہو وہ مشکلات کے حل کے لیے دوسروں کا مشق نہیں رہتا بلکہ اپنی بلند ہمتی اور مجتہد ارادے کے ذریعے میدان عمل میں کود پڑتا ہے اور جب تک اپنے مقصد کو پانیں لیتا کوشش اور جدوجہد سے دستبردار نہیں ہوتا۔
 امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

تمام اچھائیاں اس امر میں جمع ہیں کہ انسان دوسروں کے بھروسے پر نہ
 بیٹھا رہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مومن کی عزت اور بزرگی کا راز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ہاتھوں میں موجود چیز
 سے امید وابستہ نہ رکھے۔

البتہ خود اعتمادی سے محروم افراد اپنی ذات پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ اپنے تئیں حقیر
 اور ناتواں سمجھتے ہیں، زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور ان کے ساتھ مقابلے

۱۔ بیچ البدھ ۵ ص ۱۶۳

۲۔ اصول کافی، ج ۲ ص ۱۳۸

۳۔ اصول کافی ج ۲ ص ۱۳۸

کی جرأت سے عاری ہوتے ہیں۔ وہ مشکل کاموں اور ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں۔ منفی بچوں اور یاس و ناامیدی کی وجہ سے ممکن کاموں کو بھی محال بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کو محرومی اور کنارہ کشی کے عالم میں گزار دیتے ہیں۔

اب جب کہ استقلال اور خود اعتمادی کی اہمیت واضح ہو گئی ہے، اس امر کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ اس انسانی کمال کی بنیاد ہر انسان کے اپنے وجود میں مخفی ہے لیکن تربیت اور تکمال کی محتاج ہے۔ اس کی تربیت کا بہترین اور حساس ترین زمانہ بچپن کا دور ہے۔

روح انسانی میں استقلال اور خود اعتمادی کی بنیاد بچپن ہی میں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ بے اعتمادی اور قوت ارادی سے محرومی، دوسروں کے انتظار میں بیٹھے رہنے کا سرچشمہ بھی بچپن کی غلط تربیت ہی ہے۔ وہ ماں باپ جو اپنے بچوں سے محبت رکھتے ہیں اور انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بھی ہے، انہیں چاہیے کہ اپنی اولاد کی تربیت کریں اور آئندہ کی زندگی کے لیے انہیں تیار کریں۔ اس صورت میں وہ اپنے فریضے پر بھی عمل کریں گے اور اپنی کامیابی کے اسباب بھی فراہم کریں گے۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں،
اپنی اولاد کی اس طرح سے تربیت کر کہ وہ تیری عزت و سربلندی کا باعث بنے۔

چار سال کی عمر سے لے کر آٹھ سال کی عمر تک شخصیت کی پرورش، استقلال، اور خود اعتمادی پیدا کرنے کا بہترین دور ہے اس زمانے میں بچہ استقلال کی طرف میلان رکھتا ہے اور اپنے آپ کو مشکلات سے مقابلے کے لیے تیار کرتا ہے۔ کم سن بچہ اگرچہ اپنی کمزوری کا احساس بھی رکھتا ہے اور وہ کسی بڑی طاقت کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہے تاہم استقلال اور خود اعتمادی ان کی طرف میلان بھی اس کی ذات میں چھپا ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ

اپنی ضروریات کو پورا کرے اور ذاتی استقلال حاصل کر لے۔ وہ نئے نئے کاموں اور اپنی ایجادات سے بہت خوش ہوتا ہے اور فخر سے انہیں دوسروں کو دکھاتا ہے۔ اپنے بچوں سے ایسے جملے بہت سنے ہوں گے:

- * دیکھ میں کیا کر رہا ہوں؟
- * دیکھا میں نے کتنی بڑی پھلانگ لگائی ہے!
- * دیکھو میں اپنے کپڑے خود پہن سکتا ہوں۔
- * میں جوتا خود ہی پہنوں گا۔
- * میں گلاس میں پانی پیوں گا۔
- * میں خود ہی کھانا کھاؤں گا۔
- * میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے لیے چائے ڈالیں۔
- * دیکھو میں نے کسی خوبصورت تصویر بنائی ہے۔
- * میں درخت پر چڑھنا چاہتا ہوں۔

وہ ضد کرتا ہے کہ اس کی جیب میں جو پیسے ہیں انہیں اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کھلونے اپنی مرضی سے رکھے۔ کبھی کبھی ماں باپ کے حکم کے خلاف ضد کرتا ہے۔ کبھی چاہتا ہے کہ ماں باپ کی مدد کرے۔ چھوٹی بیٹی برتن اور لباس دھونے میں ماں کی مدد کرتی ہے۔ چاہتی ہے کہ کھانا پکانے، دسترخوان بچانے اور گھر کی صفائی میں ماں کی مدد کرے۔ چھوٹا بیٹا چاہتا ہے کہ ری کو ٹھیک کرے، تصویر بنائے، خط لکھے اور چیزیں خریدنے میں اپنے باپ کی مدد کرے اور ضد کرتا ہے کہ اپنا لباس اور جوتا خود انتخاب کرے راستے میں چلتے ہوئے ماں باپ سے آگے یا پیچھے چلتا ہے۔ خانہ داری کے امور میں اور گھر کے سامان کے سلیقے میں دخل دیتا ہے۔ بعض چیزیں بالکل نہیں کھاتا۔ ان کاموں سے اور ایسے سینکڑوں دیگر کاموں سے بچہ اپنے وجود کے استقلال کا اعلان کرنا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی شخصیت کا اظہار کرے اور اپنے تئیں کمال تک پہنچائے۔ چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو قوی بنائے وہ چاہتا ہے کہ

جہاں تک ممکن ہو سکے دوسروں پر اپنے انحصار کو کم کرے اور اپنے استقلال میں اضافہ کرے لیکن بچے کی شخصیت ماں باپ کے طرز عمل سے بہت زیادہ وابستہ ہوتی ہے۔ ماں باپ بچے کو آزاد چھوڑ سکتے ہیں تاکہ وہ خود ارادی سے کام کرے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اس کی کامیابیوں پر اور نئی نئی چیزوں پر اظہارِ مسرت کریں۔ اسے شاباشیں دیں اور اس کا حوصلہ بڑھائیں۔ اس کے ذوق اور استعداد کے مطابق مفید کام اس کے ذمہ چھوڑ دیں۔ راہنمائی اور حوصلہ افزائی کے ذریعے اسے کام اور کوشش پر ابھاریں۔ اس طرح بچے کی شخصیت اور استقلال کی تدریجاً تکمیل ہوتی جائے گی۔ وہ اپنے وجود کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور اس میں خود اعتمادی پیدا ہوگی۔ اس کا ارادہ قوی ہوگا۔ ایسے بچوں میں بچپن ہی سے عقلی صلاحیتوں اور خود اعتمادی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

ایک ماہر نفسیات لکھتے ہیں :

ایک شخص نے ایک ننھے ماہی گیر کو دیکھا کہ وہ بڑی مہارت سے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہے۔ اور بڑی بڑی مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ اسے تعجب ہوا، اور اس نے اس کی مہارت کی تعریف کی۔ ننھے ماہی گیر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا ! میری مہارت کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ میں بچپن ہی سے ماہی گیری کر رہا ہوں۔ اس نے پوچھا ! مگر تمہاری عمر کیا ہے ؟ کہنے لگا چھ سال۔ اگر ماں باپ نے اس بچے کی حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کے اسباب فراہم کئے ہوتے تو اس میں ایسی مہارت ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تھی اور اس میں کبھی خود اعتمادی پیدا نہ ہوتی۔ بعض ماں باپ کہ جو اپنے بچوں سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ بچوں کا وجود ان کا محتاج بنا رہے۔ انہیں کام کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کے تمام کام خود انجام دیتے ہیں۔ خود ہی ان کے لئے ارادہ کرتے ہیں اور خود ہی انتخاب ! بہت سے ماں باپ نہ صرف یہ کہ اپنی اولاد میں استقلال اور خود اعتمادی پیدا کرنے

یہ مدد نہیں کرتے بلکہ اپنی ڈانٹ ڈپٹ اور اُن کے کاموں میں کیرے نکالنے سے ان کی روح استقلال طلبی کو سلا دیتے ہیں بچے کو ایجابات سے روکتے ہیں اور اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دیتے ہیں۔ اس کے کام پر تنقید کرتے ہیں اور جڑا بھلا کہتے ہیں۔ اور اس کے کام میں کیرے نکال کر اُسے شرمندہ کرتے ہیں اور اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

اے عزیز ماں باپ! ہمارے بچوں نے بہر حال بڑا ہونسا ہے اور آخر کام ہم سے جدا بھی ہونا ہے اُنہ کی زندگی میں انہیں بھکلات اور مسائل کا سامنا بھی کرنا ہے۔ آپ کو بھی فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور ان کی آزادی کی خواہش کو جواب دینا چاہیے۔ آزادی کی خواہش کوئی عیب کی بات نہیں کہ آپ اس کا مقابلہ کرنے لگیں۔ بلکہ یہ آزادی کسی وجود کے استقلال اور کمال کا اظہار ہوتی ہے آپ کو کشش کریں کہ صحیح طریقے سے اس سے فائدہ اٹھائیں اور بچوں کو اُنہ کی زندگی کے لیے تیار کریں۔ آپ اس پر اصرار نہ کریں کہ جہاں آپ کے بچوں کو ارادہ کرنا چاہیے وہاں آپ خود ان کے لیے ارادہ کریں۔ بلکہ آپ کو چاہیے کہ ان کے لیے مسئلہ کو واضح کر دیں اور اس کے بعد انتخاب اور ارادہ ان کے ذمہ چھوڑ دیں۔ اگر بچہ کوئی کام شروع کرے اور اسے اس میں رغبت نہ ہو تو آپ اس میں مداخلت نہ کریں بے جا دخل اندازی سے اُسے آزدہ خاطر نہ کریں۔ اُسے چھوڑ دیں کہ وہ اپنے سلیقے سے کام مکمل کرے۔ اور اپنی نئی نئی چیزوں سے خوش ہو۔ اس کے کام پر تنقید نہ کریں مگر یہ کہ خود وہ اس چیز کا اظہار کرے۔

اگر آپ کی بیٹی چاہتی ہے کہ خود سے کھانا تیار کرے تو اس کی راہنمائی کریں اور کام اس کے ذمہ چھوڑ دیں۔ اور اس میں وہ خیل نہ ہوں۔ کیا حرج ہے کہ ایک مرتبہ وہ خواب کھانا پکائے۔ اس کے کھانا پکانے پر نکتہ چینی نہ کریں۔ کیا آپ کو معلوم ہے آپ کی نکتہ چینی اور ڈانٹ ڈپٹ اس کی روح کو کس قدر مجروح کر دیتی ہے۔ اور کس قدر اس کی خود اعتمادی کو نقصان پہنچاتی ہے۔

..... ایک خاتون اپنے خط میں لکھتی ہیں :

بچپن میں میں جو کام بھی کرنا چاہتی مجھ سے کہا جاتا تھے نہیں پتہ تو کیا ہے ؟

تو نے یہ برتن توڑ دیا ہے تیرے کھانے میں نمک زیادہ ہے۔ تو نے پانی زیادہ ڈال دیا ہے۔ خراب کر دیا ہے۔ تم کام کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ جھاڑو نہ دے! تجھے کیا پتہ جھاڑو کیسے دیا جاتا ہے۔ مہانوں کے سامنے بات نہ کر۔ اور اسی طرح کی سینکڑوں باتیں۔ جب میں کھانا پکاتی تو کئی دفعہ چکتی کہ کہیں نمک زیادہ نہ ہو۔ پانی زیادہ نہ ہو۔ لیکن پھر مجھے سرزنش کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکی۔ میں خود کو کمزور اور بے حیثیت سمجھتی ہوں۔ احساس کمتری اور خود پر عدم اعتماد سے میں بہت دگھی ہوں۔ یہ حالت اب بھی مجھ میں باقی ہے۔ ایک مجلس کا انتظام میرے ذمہ ہے ہر ہفتے جب کہ مجھے اس مجلس کے انتظام کے لیے جانا ہوتا ہے تو مجھ میں اضطراب

پیدا ہو جاتا ہے۔ اور میرا دل گھبراتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ شاید اچھی تقریر نہ کر سکوں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں یاد ہوتی ہیں اور یہ باتیں متعدد مجالس میں بیان بھی کر چکی ہوتی ہیں لیکن پھر بھی خوف و ہراس ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ میرے سر پر کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ جس کام کی طرف بھی بڑھتی ہوں اپنے آپ کو روکتی رہتی ہوں تاکہ کسی طرح سے درمیان میں ہی کام چھوٹ جائے۔ بہت چاہتی ہوں کہ بے اعتمادی کی یہ کیفیت ختم ہو جائے لیکن نہیں ہوتی۔

..... ایک اور خاتون لکھتی ہیں:

بچپن ہی سے میری ماں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کاموں میں میری مدد کرے۔ وہ مجھے اجازت نہ دیتی کہ میں کوئی کام تنہا انجام دوں۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کی عادت ہو گئی۔ اور کسی درسیں کا سہارا لینا میرا مزاج بن گیا۔ میں کاموں کی انجام دہی اور مشکلات کے حل میں اپنی طاقت سے استفادہ نہ کرتی بلکہ امی سے یا دوسروں سے مدد لیتی۔ بے اعتمادی کی یہ حالت ہو گئی کہ کسی چھوٹی سی مشکل پر بھی بھاگنے لگتی تھی۔ اس کے کہ خود اس کے حل کے لیے کوئی چارہ نہ کرتی دوسروں سے مدد لیتی تھی۔

اپنے تئیں اس کا اہل نہ سمجھتی۔

آخر میں اس امر کی یاد دہانی ضروری ہے کہ ممکن ہے بعض بچے اپنے وجود کے اظہار کے لیے غلط کام شروع کریں۔ مثلاً پھولوں کو مسل دیں۔ درختوں کی ٹہنیوں کو توڑ دیں۔ پرندے، کتے اور بلی کو تکلیف پہنچائیں۔ اپنے ہم بھائیوں کو اذیت دیں۔ دوسروں کو نقصان پہنچائیں۔ اپنی بہن کے بال کھینچیں۔ ایسے امور میں ماں باپ خاموش بیٹھے نہیں رہ سکتے اور ان کے کاموں کی تائید نہیں کر سکتے۔ البتہ اس امر کی طرف انہیں متوجہ رہنا چاہیے کہ بچے کا مقصد کسی سے دشمنی یا سرکشی نہیں بلکہ وہ اپنے وجود کا اظہار چاہتا ہے۔ ایسے امور سے روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی توجہ دوسرے مفید کاموں کی طرف مبذول کر دی جائے۔ اور اسے تعمیری کھیلوں کی طرف اور مفید کاموں میں مہارت حاصل کرنے میں مشغول کر دیا جائے تاکہ وہ غلط کام چھوڑ دے۔

—:—

آزادی

بہت سے ماں باپ بچے کی تربیت اس میں سمجھتے ہیں کہ اس کی آزادی محدود کر دی جائے یا چھین لی جائے۔ کہتے ہیں بچہ اچھائی اور بُرائی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس کی اتنی عقل نہیں ہوتی۔ اگر اُسے آزاد چھوڑ دیں تو وہ خرابی کرے گا۔ چاہیے کہ اسے محدود اور پابند رکھا جائے۔ ایسے ماں باپ اپنے آپ کو بچے کی عقل کے مطابق فرض کر لیتے ہیں۔ اس کے مقام پر سوچتے ہیں۔ اس کی جگہ ارادہ کرتے ہیں۔ اس کی بجائے خود انتخاب کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کے کھانے، پینے اور کھیلنے پر بھی کنٹرول رکھتے ہیں۔ اور اس کے ہر مسئلے پر نظر رکھتے ہیں۔ اور اپنے سلیقے کے مطابق اس کی زندگی کا نظام چلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک بچہ آزادی اور خود ارادی کا حق نہیں رکھتا۔ اور ماں باپ کی اجازت کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ جو کچھ وہ اس کے لیے پسند کریں اسے ناچار بے چون و چرا کرتا ہوگا۔ اور جسے وہ برا سمجھیں مجبوراً بغیر کچھ کہے اُسے ترک کرنا ہوگا۔ ماں باپ کے تربیتی پروگرام اور ان کے حکم اور مانست پر بچوں کو اطاعت کے علاوہ چارہ نہیں۔ پسے خاندان اسی طریقے سے اپنی اولاد کی تربیت کرتے تھے اور وہ زبردستی اور بزور اپنے احکام پر عمل کراتے تھے۔ دورِ حاضر میں بھی بہت سارے خاندان اسی طریقے پر چل رہے ہیں۔

مذکورہ طریقہ کار اگرچہ معمول رہا ہے اور آج بھی ہے لیکن یہ تربیت کی صحیح روش نہیں ہے۔ اس میں بہت سے عیوب و نقائص موجود ہیں۔ اس پروگرام گئے مطابق ممکن ہے کہ بچوں کی ایسی تربیت ہو جائے کہ وہ بہت حد تک اکرام سے رہیں، خاموش رہیں اور

فرمانبردار ہیں اور ماں باپ کی مرضی کے مطابق عمل کریں۔ ایسے بچے زیادہ تر دبے دبے اور قوت ارادی سے عاری رہ جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ اہم کاموں میں ہاتھ ڈالنے کی جرات ان میں نہیں ہوتی۔ اور وہ عزم و ارادہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ دشوار فہم داریوں کو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ یہ قیادت نہیں کر سکتے اور کاڈر نہیں بن سکتے۔ لیکن فرمانبرداری ان کے لیے مشکل نہیں ہوتی ایسے بچے ستم اٹھانے اور ظلم کو قبول کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور بڑے ہو کر اس بُری عادت سے دستبردار نہیں ہوتے چونکہ یہ لوگ آزادی سے محروم رہے ہیں اور اپنی اندرونی خواہشات کی تکمیل نہیں کر سکے ہیں۔ ان کے دل میں گویا ایک گرہ سی پڑ گئی ہے۔ ممکن ہے یہ گرہ بہت سی نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں کا باعث بن جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے عقہ دار افراد تو عمل کے طور پر ظلم کرنے لگیں تاکہ اس ذریعے سے اپنے ماں باپ اور پورے معاشرے سے انتقام لے سکیں اور اپنی کمی کو پورا کر سکیں۔ انہی بُرائیوں کی بنا پر حال ہی میں بعض دانشوروں اور ماہرین نفسیات نے اس ظالمانہ طرز تربیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہے، اور اس کی سخت مذمت کی ہے اور بچے کی کامل آزادی کی حمایت میں آواز اٹھائی ہے۔ ان دانشوروں نے ماں باپ کو نصیحت کی ہے کہ اپنے بچے کو بالکل آزاد چھوڑ دیں تاکہ وہ اپنے ذوق اور سلیقے کے مطابق چلے۔ وہ کہتے ہیں کہ بچے کو آزادی دیں کہ وہ جو کام چاہے کرے اگرچہ وہ کام آپ کی نظروں میں درست نہ ہو یا بچہ اس کام کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ اس چیز سے بچہ آزاد مزاج ہو کر پلان چڑھے گا اور اس کا دل کسی گرہ سے دوچار نہیں ہوگا۔

معروف دانشور فرانڈ اسی نظریے کا حامی ہے اور اس نے مشرق و مغرب میں اپنے اس نظریے کے بہت سے پیروکار پیدا کر لیے ہیں۔ بہت سے ماں باپ نے بھی اس نظریے کو قبول کر کے اس پر عمل کیا ہے اور اپنے بچوں کو کامل آزادی دے دی ہے ایسے ماں باپ اپنے بچوں کو کوئی حکم نہیں دیتے اور ان سے بے تعلق رہتے ہیں۔ یہ طرز عمل بھی درست نہیں۔ اس میں بھی بہت سے نقائص موجود ہیں۔ وہ بچے کو اس طرز عمل کے مطابق پروان چڑھتے ہیں وہ کاموں کی انجام دہی میں کسی بھی محدودیت کے

قابل نہیں ہوتے۔ ایسے بچے زیادہ تر خود عرض، شہوت پرست اور دھونس دھاندلی جہانے والے ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے کسی حق کے قابل نہیں ہوتے۔ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ماں باپ سے چین چھین لیتے ہیں بہن بھائیوں اور دوستوں کے بچوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ہسالیوں اور رشتے داروں کو اذیت دیتے ہیں۔ ان کی خواہشات چونکہ مطلق آزادی کی حامل ہوتی ہیں لہذا ایسے بچے عموماً افراط اور زیادتی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہ افراط ان کے لیے خرابی اور تباہی کا باعث بنتی ہے۔ افراط اور نامعقول آزادی بچے کو اضطراب اور پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہے ممکن ہے ان کی توقعات اس حد تک جا پہنچیں کہ ان کی انجام دہی ایک مشکل کام بن جائے۔ اس طرح کے بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو دوسروں سے ان کی یہ توقع ہوتی ہے کہ ان کے ماں باپ کی طرح ان کی اطاعت کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر جگہ ان کی فرمان روائی ہو۔ وہ کسی کی اطاعت قبول نہیں کرتے معاشرے کے افراد پر ان کی نہیں چلتی اور جب وہ شکست کا سامنا کرتے ہیں تو پھر ان کے دل میں ایک گروہ پڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ گوشہ نشین ہو جاتے ہیں یا اپنی شکست کی تکافی کے لیے ظلم اور خطرناک کام انجام دیتے ہیں۔ بے قید آزادی کبھی بچے کی ہمت کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ شاید بچے کا دل یہ چاہتا ہو کہ وہ بنیر کسی پابندی کے سڑک پر دوڑے یا بجلی کے ننگے تار کو چھوئے یا گرم سمار کو ہاتھ لگائے۔ اس بنا پر تربیت کے یہ دو طریقے کہ جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں ایک افراط کا حامل ہے اور دوسرا تفریط کا۔ یہ دونوں طرز عمل درست نہیں ہیں۔ بچے کی تربیت کے معاملے میں ان پر عمل پیرا نہیں ہوا جاسکتا۔ اس معاملے میں بہترین قابل انتخاب روش بچے کی حدود اور معتدل آزادی ہے۔ اللہ نے انسانی وجود کو مختلف جبلتوں اور محسوسات کا مرکب بنایا ہے کہ جو انسانی شخصیت کی تکمیل کے لیے سودمند ہیں۔ مثلاً محبت، نفرت، شجاعت، خوف، جملہ، دفاع، جستجو، تقلید اور کھیل کا خواہ وغیرہ یہ داخلی کیفیات و محسوسات اللہ کی طرف سے انسانی قوتوں کا سرچشمہ ہیں اور زندگی کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے انسان کو عطا کی گئی ہیں۔ انہی سے انسانی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ ان جبلتوں کو آزاد ماحول میں پرورش اور رشد کا موقع ملنا چاہیے۔ انہیں یکجہلنے

سے انسانی شخصیت بُری طرح مجروح ہوجاتی ہے۔

خوف خطرات سے بچنے کے کام آتا ہے۔ غصہ دشمن پر حملہ آور ہونے کے کام آتا ہے۔ جب شخص میں خوف اور غصہ نہ ہو تو ناقص انسان ہے یہ درست نہیں ہے کہ بچے کے ان احساسات کو دبا دیا جائے یا کھل دیا جائے۔ آزاد ماحول میں بچان احساسات سے استفادہ کر سکتا ہے آزادانہ عمل کر سکتا ہے، اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکتا ہے اور اجتماعی زندگی کے لیے اپنے تئیں تیار کر سکتا ہے۔

دین مقدس اسلام نے آزادی کی طرف جمعیۃً توجہ دلائی ہے۔ نمونے کے طور پر چند ایک احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا :

لَا تَكُنْ عَبْدًا غَيْرَكَ فَقَدْ جَعَلَكَ اللَّهُ حُرًّا۔

غیر کا بندہ نہ بن اے اللہ نے تجھے آزاد پیدا کیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا :

جس شخص میں یہ پانچ خصوصیات نہ ہوں اس کا وجود فائدہ مند نہیں ہے۔

اول۔ دین

دوم۔ عقل

سوم۔ ادب

چہارم۔ آزادی

پنجم۔ خوش اخلاقی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

بچہ سات سال کی عمر تک فرماں روا ہے۔ سات سال کی عمر سے لے کر

پچودہ سال تک فرماں بردار ہے اور چودہ سال کے بعد سات سال ماں باپ کا وزیر اور مشیر ہے۔

البتہ مطلق آزادی بھی ممکن نہیں ہے۔ معاشرے میں زندگی بسر کرنے والا انسان کا مطلقاً آزاد نہیں رہ سکتا کیونکہ معاشرے کے تمام افراد آزادی اور زندگی کا حق رکھتے ہیں۔ ایک فرد کی آزادی کے لیے دوسروں کے حقوق پاؤں نہیں کیے جاسکتے۔ بچے کو بچپن ہی سے سمجھا دینا چاہیے کہ بے قید و شرط آزادی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے لوگ بھی زندگی اور آرام کے حقدار ہیں۔ مثلاً بچہ چاہتا ہے کہ کھیلے۔ کھیل اس کی تربیت کے لیے بھی ضروری ہے۔ اسے اس بات کی آزادی ہونا چاہیے کہ اپنے ذوق اور سلیقے کے مطابق کھیلے لیکن اس کھیل میں ماں باپ، ہمسایوں اور دوسرے بچوں کے حقوق کا بھی خیال رکھے اور ان کی آزادی میں حائل نہ ہو۔ درست ہے کہ اسے کھیلنا چاہیے لیکن اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسے لوگوں کے دود و پوار خراب اور گندہ کرنے اور شیشے توڑنے کا حق نہیں۔ لہذا کھیل میں تو اسے آزادی ہے لیکن ایک محدود اور مشروط آزادی نہ کہ بے قید و شرط آزادی۔ بچہ اپنے غصے کو استعمال کر سکتا ہے۔ اسے مناسب موقع پر استعمال کر کے اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ غصے کے وقت اسے یہ حق حاصل نہیں کہ گھر کے سامان کی توڑ پھوڑ شروع کر دے یا ماں باپ اور دوسرے لوگوں کو کوئی نقصان پہنچائے یا کسی کی توہین کرے یا کسی کا حق پامال کرے۔

اس حکمت عملی کے لیے ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کی عمر، فہم، طاقت، خواہشات اور جذبات کو ملحوظ نظر رکھیں اور اس کے اعمال اور حرکات کو دھتھوں میں تقسیم کریں۔

۱۔ وہ کام جو اس کے لیے جائز ہیں۔

۲۔ وہ کام جن کا وہ مجاز نہیں ہے۔

انہیں ان میں سے ہر ایک کی حدود و پوری طرح سے واضح کرنا چاہیے۔ اس کے

بعد انہیں چاہیے کہ جائز امور میں بچوں کو پوری آزادی دیں تاکہ وہ اپنی جبلت اور طبیعت کے مطابق عمل کر سکیں اور اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکیں۔ بچے کو اجازت دینی چاہیے کہ وہ خود غور کرے۔ ارادہ کرے اور کام کرے۔ نہ صرف بچے کو کامل آزادی دینی چاہیے بلکہ ضروری مواقع پر اس کی مدد بھی کرنا چاہیے لیکن جو کام اس کے لیے مناسب نہیں ان سے سختی سے روکنا چاہیے اور ان کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دینا چاہیے۔

اس شرط پر عمل سے بچے کی آزادی سلب نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کی صلاحیتیں کھلی جائیں گی۔ بلکہ اس کو آزادی ہوگی۔ البتہ حدود کے اندر۔ اور ساتھ ہی اس کے جذبات اور طبیعت پر کنٹرول بھی پیدا ہو جائے گا۔ جبلت پر کنٹرول اس کو کھینچنے اور اسے پیچھے کھینچنے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے نفس پر قابو اور تقویت ارادہ تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو غلط کاموں پر صرف نہ کرے بلکہ انہیں مفید اور سودمند کاموں کے لیے جمع رکھے۔

آخر میں ماں باپ کو نصیحت کی جاتی ہے کہ پہلے صحیح اور غیر صحیح کاموں کی حدود کو قطعی طور پر معین کریں تاکہ بچہ اپنی ذمہ داری کو سمجھ سکے۔ مثلاً ایسے کام جو بچے یا خاندان کی سلامتی اور امن و سکون کے لیے نقصان دہ ہیں۔ نیز ایسے کام جو جسمانی یا مالی طور پر ضرر رساں ہیں۔ اسی طرح شریعت اور قانون کے خلاف کام نیز اخلاقی اور معاشرتی اصولوں کے خلاف کام اور ایسے کام جو دوسروں کی آزادی میں حائل ہوتے ہیں اور ان کے حقوق ضائع کرنے کا باعث بنتے ہیں انہیں بلیک لسٹ کر دیا جانا چاہیے اور بچے کو ان سے سختی سے روک دینا چاہیے۔ ایسے کاموں کے علاوہ دیگر کاموں میں بچہ بالکل آزاد ہونا چاہیے۔ اور ان امور میں اسے خود سوچنا چاہیے۔ بخود ارادہ کرنا چاہیے۔ اور خود انہیں انجام دینا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ بچے کی توانائی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس کے عقلی رشد اور جسمانی طاقت کے مطابق اس کے لیے نظم و ضبط ہونا چاہیے اور سخت قسم کے نظم و ضبط اور غیر منطقی احکام سے پرہیز کرنا چاہیے۔

تیسرا یہ کہ ماں باپ کو چاہیے کہ وہ اپنے قول پر پکے رہیں اور بچے سے پوری صراحت سے کہہ دینا چاہیے کہ

”یہ کام تو انجام دے سکتا ہے اور وہ کام تجھے تھا ترک کرنا چاہیے“
 ماں باپ کو چاہیے کہ بے جا احساسات اور جذبات کو ایک طرف رکھ دیں۔ شک و شبہ
 سے اجتناب کریں تاکہ بچہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور اپنے فریضہ کی ادائیگی میں شک نہ کرے
 امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں،
 بچپن میں کسی بچے کی ماں باپ کے حکم کے خلاف جسارت اور بے اعتنائی
 بڑا ہو کر اس کے سرکش اور نافرمان ہو جانے کا باعث بنتی ہے لہ
 چوتھا یہ کہ ماں باپ کو چاہیے کہ آپس میں ہم آہنگ ہو لیں اور اختلاف سے سختی سے پرہیز
 کریں اور اپنے اختلافات سے بچے کو شک اور دودلی میں مبتلا نہ کر دیں۔

ضدی پن

سب بچوں میں کچھ نہ کچھ ضدی پن اور خود سری ہوتی ہے خصوصاً دو سال کی عمر میں۔ ضدی بچہ اصرار کرتا ہے کہ جو کچھ بھی اس کے دل میں آئے انجام دے اور کوئی اس کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اگر وہ اپنی خواہش کے مطابق کام نہ کر سکے تو پھر وہ روتا ہے جیتنا چلتا ہے تاکہ کوئی اسے مل لائے۔ اپنے آپ کو زمین پر گھسیتا ہے۔ سر دیوار سے ٹکراتا ہے۔ شور مچاتا ہے۔ غصہ کرتا ہے اور کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ برتن توڑتا ہے یہاں تک کہ کبھی ماں باپ یا بہن بھائی پر حملہ بھی کرتا ہے۔ اتنا شور مچاتا ہے کہ ماں باپ پر اس کو کامیابی حاصل ہو جائے اور وہ اپنا مقصد پالے۔ یہ بچپن کی ایسی عادت ہے کہ کبھی کبھی تو نسبتاً بڑے بچوں میں بھی دیکھی جاتی ہے۔ اکثر ماں باپ بچوں کی اس عادت سے نالاں رہتے ہیں اور اس کا حل سوچتے رہتے ہیں۔ بچوں کے ضدی پن کے بارے میں ماں باپ غموں ان دو طریقوں میں سے ایک اختیار کرتے ہیں۔

پہلا طریقہ : بعض ماں باپ کا یہ نظریہ ہے کہ بچے کی ضد کے مقابلے میں سخت رد عمل کا مظاہرہ کیا جائے اور اس کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا جائے۔ ایسے ماں باپ کا کہنا ہے کہ یہ بچہ بہت خود سر اور ضدی ہو چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کیا جانا چاہیے تاکہ یہ اپنے ضدی پن سے دستبردار ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس بچے کو ایک انج بھی اپنا زور چلانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ سختی، زور اور مار پیٹ کے ذریعے بچے کو روکتے ہیں اور اپنی خواہشات اس پر سوار کر دیتے ہیں۔ یعنی درحقیقت وہ

بچے کی ہنٹ دھرمی کے جواب میں ہنٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل درست نہیں ہے کیوں کہ اگرچہ انہوں نے مار پیٹ اور زور کے ذریعے بچے کو اس کی ضد سے پیچھے ہٹا دیا ہے اور چپ کر دیا ہے لیکن دوسری طرف اس کی شخصیت پر بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔

دو سال کی عمر شخصیت اور ارادے کے اظہار کی عمر ہے اور ضدی پن ارادے کی بھنگی اور خود اعتمادی کا بنیادی جوہر ہے۔ بچے کی عقل اس عمر میں اتنی رشد یافتہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خواہشات پر کنٹرول کر سکے اور ان کے نتائج کے بارے میں غور و فکر کر سکے۔ وہ سوچے سمجھے بغیر کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی خواہش کے مطابق عمل کیا جائے تاکہ اس کے وجود کا اظہار ہو سکے اور اس کی شخصیت نمایاں ہو سکے۔ اگر ماں باپ اس کی مخالفت کریں گے تو وہ گویا اس کی شخصیت کو مجروح کریں گے۔ ممکن ہے وہ ایک پرسکون فرد بن جائے لیکن حیثیت اور ارادے سے عاری۔ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی اس کی خواہش پوری نہیں کر رہا اور طاقت کے ذریعے اسے روکا جا رہا ہے تو وہ مایوس اور بے گنا ہو جاتا ہے۔ اضطراب اور پریشانی کی یہی حالت اس میں باقی رہتی ہے البتہ اس بات کا امکان بھی ہے کہ اپنی خواہشات کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے وہ بڑا ہو کر خطرناک کاموں کا مرتکب ہو مثلاً قتل اور ظلم وغیرہ تاکہ اس ذریعے سے وہ اپنے وجود کا اظہار کر سکے اور اپنی شخصیت منوا سکے۔

دوسرا طریقہ : بعض پرورش کنندگان کا نظریہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے بچے کے دل کو راضی کرنا چاہیے۔ اور اس کی خواہش کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اسے اجازت دی جانا چاہیے کہ جو کام وہ چاہے انجام دے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ بچے کی ضد اور اصرار کے سامنے تسلیم حق ہونا چاہیے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بچہ ہے اسے آزادی ملنی چاہیے جب بڑا ہو گا تو خود ہی ضد اور ہانپنے بنانے چھوڑ دے گا۔ یہ طریقہ بھی عیب سے خالی نہیں ہے۔

اولاً : بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ جو بڑے جانی یا مالی نقصان کے حامل ہوتے ہیں اور خود بچے کی یا دوسروں کی جان و مال کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں ایسے کاموں میں بچے کو آزادی دینا خلاف عقل اور خلاف وجدان ہے ہو سکتا ہے دو تین سالہ بچہ بڑی سیڑھی کے ذریعے اوپر

جانا چاہے کہ جس میں احتمال ہے وہ گر پڑے گا اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے ممکن ہے وہ چاہے کہ ماچس سے خود گیس جلائے کہ جس میں امکان ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور پورے گھر کو جلا دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ دوسروں کے احوال اور حقوق پر تجاوز کرنا چاہے یا دوسرے بچوں کو اذیت دینا چاہے۔ ایسے کاموں میں بچوں کو آزادی نہیں دی جاسکتی۔

ثانیاً۔ جو بچہ ہمیشہ مطلق العنان رہا ہو۔ صبر سے اور شور شراب سے اپنے مقاصد حاصل کرتا رہا ہو، جس نے اپنے سامنے کسی کو ٹھہرتے نہ دیکھا ہو رفتہ رفتہ اس طریقے کا عادی ہو جاتا ہے اور ایک خود غرض اور ڈکٹیٹر بن جاتا ہے۔ اُسے لوگوں سے توقع ہوتی ہے کہ وہ بے چون و چرا اس کی خواہش پر عمل کریں اور اس کے طرز عمل اور کردار پر کوئی تنقید نہ کریں۔ اس نے بچپن میں اپنی خواہشات کے مقابلے میں کسی کو قیام کرتے نہیں دیکھا کہ وہ دوسروں کی خواہشات کا اعتنا کرے۔ اگر وہ دیکھے کہ زور دینا دیتی ہے اپنی خواہشات کو میرا ب کر سکے اور اپنے مقصد کو پالے تو بہت خوش ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ وہ سکے تیار نہیں ہوتے کہ اس کی ڈکٹیٹری کو برداشت کریں۔ اس لحاظ سے وہ معاشرے سے الگ ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ آہ و زاری کرتا رہتا ہے۔ اپنے تیل شکست خوردہ ہوتا ہے اور لوگوں کو حق ناشناس سمجھتا ہے۔

اسلام ہٹ دھرمی کو بڑی صفات میں سے شمار کرتا ہے اور اس کی مذمت میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

نمونہ کے طور پر۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

”ہٹ دھرمی برائیوں کا سبب ہے“ اے

امیر المؤمنین علیہ السلام نے فرمایا :

”دھڑائی عقل انسانی کو نقصان پہنچاتی ہے“ اے

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

”ہٹ دھری جنگ اور دشمنی کا باعث ہے“ لے

حضرت علی علیہ السلام نے ہی فرمایا:

”ہٹ دھری کا نقصان انسان کی دنیا اور آخرت کے لیے سب سے زیادہ ہے“ لے

تیسرا طریقہ: بہترین روش اعتدال کو ملحوظ رکھنا ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے کہ جس کے مطابق ماں باپ بچے کی خود سری کو عیب نہیں سمجھتے بلکہ اس کی استقامت اور اصرار کو اس کے وجود اور قوت ارادی کے اظہار کا وسیلہ جانتے ہیں نہ صرف یہ کہ اس کو ختم نہیں کرتے بلکہ تعلیم و تربیت کے لیے اسی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بچے کی خواہشوں کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ بے ضرر خواہشات کے ضمن میں بچے کو آزادی دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے میلان کے مطابق عمل کرے اور اس طرح اپنی قوت ارادی میں اضافہ کرے۔ اس کے بے ضرر یا کم ضرر کاموں میں زیادہ دخالت نہیں کرتے وہ بچے کے دوست بن جاتے ہیں اور کاموں کی ادائیگی میں اس کی راہنمائی کرتے ہیں۔

ایسی صورت میں بچے کو زیادہ تر کاموں میں آزادی حاصل ہوتی ہے اس طرح سے وہ اپنے ارادے کو مضبوط کر سکتا ہے اور اپنے وجود کا اظہار کر سکتا ہے۔ ماں باپ کے باجے میں وہ بھی اچھی رائے رکھتا ہے اور انہیں اپنے رستے میں حائل نہیں سمجھتا۔

لیکن خطرناک نقصان وہ اور خلاف اخلاق و ضعیف کاموں میں نیز ناجائز امور میں اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کے معاملے میں بچے کے سامنے استقامت کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ذرا سی بھی ٹھیل نہیں دیتے وہ پوری بے نیازی سے اور مراحت سے بچے سے کہتے ہیں اس کام کو نہ کرنا۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ حتی الامکان اس کام سے روکنے کی وجہ اسے

لے غرالحکم ص ۱۸

لے غرالحکم ص ۱۰۴

بتائیں اور اسے مطمئن کریں اور اس کی توجہ کسی اور اچھے کام کی طرف موڑ دیں۔ بچہ چونکہ ماں باپ کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے اور اس پر زیادہ پابندیاں نہیں ہوتیں زیادہ تر مان جاتا ہے اور اس کام کو چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ غلط کاموں کے بارے میں غور کرے۔ شور شرابہ کرے۔ زمین پر پاؤں مارے تو آپ سختی سے اسے روک دیں۔ اور اس سلسلے میں کوئی دھیل نہ دیں۔ اس کے شور و شین اور رونے دھونے پر توجہ نہ دیجئے۔ اسے اس کے حال پر رہنے دیں تاکہ وہ سمجھ سکے کہ دنیا میں ہر چیز کا کوئی حساب ہے کہ جو اس کے شور شرابے سے بدل نہیں سکتا۔ آپ کچھ صبر کریں وہ خود شور شرابے سے تھک ہار کر چپ کر جائے گا۔ بچے کو سمجھائیں کہ آپ کی نہ صفتی نہ ہے۔ اسے سمجھائیں کہ زور اور خود سری سے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ دوسروں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کی ہٹ دھرمی اور شور شرابے پر مار پیٹ شروع کر دیں۔ اور سختی سے اسے چپ کر لائیں کیونکہ اس طرح سے اسے چپ تو کر لیا جاسکتا ہے لیکن حسی طور پر اس کی روح اور نفیات پر اس کے بُرے اثرات باقی رہ جائیں گے کیوں کہ وہ آپ سے بدین ہو جائے گا۔ اور آپ کو بھی ایک زیادتی کرنے والا اور ڈکٹیٹر سمجھے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے خلاف اس کے دل میں کینہ پیدا ہو جائے اور وہ انتقام لینے کی ٹھان لے ہو سکتا ہے آپ کی آمریت کو اپنے لیے غور نہ کرے۔ اس بحث کے اختتام پر ضروری ہے کہ مربی حضرات کی خدمت میں چند امور ذکر کیے جائیں۔

۱۔ جہاں تک ممکن ہو بچوں کو عمل کی آزادی دیں۔ ان کے امور میں زیادہ دخالت نہ کریں اور ہر وقت یہ کہہ کر دباؤ نہ کر سکیں بچہ کرسی، درخت یا چھوٹی سیڑھی کے ذریعے اوپر جانا چاہتا ہے آپ کہیں بیٹھے مگر جاؤ گے! وہ چل کا چھلکا اتارنے لگے تو آپ کہیں بیٹھا ہاتھ کو زخمی کر لو گے، وہ سداور روشن کرنے لگے تو آپ کہیں جل جاؤ گے، وہ چائے ڈالنا چاہے تو آپ کہیں پیچک توڑ دو گے، گھر میں کھیلنا چاہے تو کہیں شور نہ کر دے۔ گلی میں جانا چاہے تو آپ کہیں سائیکل کے نیچے آ جاؤ گے۔

پھر یہ خواجہ کیا کرے! آخر وہ بھی انسان ہے۔ اس کا بھی ارادہ ہے۔ وہ بھی اپنے وجود کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ جب آپ اس کے کاموں میں دخالت کریں گے وہ

خستہ حال ہو جائے گا اور اس کے اندر ایک ہٹ دھرمی اور خود مری کی کیفیت پیدا ہو جائے گی بچے کی ہٹ دھرمیوں کی ایک وجہ ماں باپ کی اس کے کاموں میں زیادہ دخالت ہے۔

- ۲۔ جب آپ کا بچہ مذکر سے تو کوشش کریں کہ اس کی ضد کی وجہ معلوم کریں اور اس کو دور کریں تاکہ وہ خود بخود مطمئن ہو جائے۔ اگر اسے جھوک لگی ہو تو کھانا دیں۔ اگر وہ تھکا ہوا ہے تو اسے سلا دیں۔ اگر وہ گھر کے تنگ ماحول، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے شور اور مہانوں کی وجہ سے تنگ آگیا ہے تو اس کے لیے آرام دہ ماحول فراہم کریں۔
- ۳۔ بچے کی توہین اور اسے سرزنش نہ کریں کیونکہ توہین اور سرزنش اسے ضدبانی پہا بھارتی ہے وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ یہ میری توہین کرتے ہیں اور مجھے ملامت کرتے ہیں۔ ہیں۔ میں بھی ان کے سامنے ڈٹ جاؤں گا اور ان سے انتقام لوں گا۔

حضرت علیؓ السلام فرماتے ہیں :

- ۱۔ سرزنش میں زیادتی ہٹ دھرمی کی آگ کو بھڑکاتی ہے۔
- ۲۔ کبھی کسی بچے پر اس کے جانی بن ظلم اور زیادتی کرتے ہیں اور اس کی کوئی حمایت نہیں کرتا تو وہ ہٹ دھرمی اور سرکشی پر اتر آتا ہے اسی صورت میں ماں باپ کو چاہیے کہ اس کی سرکشی کی وجہ معلوم کریں۔ اور اس سے دور کریں تاکہ وہ اسے چھوڑ دے۔
- ۵۔ اگر آپ کا بچہ مذکر ہے اور آپ کو اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی تو آپ اپنے آپ کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ خود آپ کس ضدی بن کا شکار تو نہیں ہیں۔ شاید آپ کا ضدی بن بچے کے ضدی بن کا باعث بنا ہو۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ بچے ان باپ ہی کے ضدی بن کا مظہر ہوتے ہیں اور انہیں کی تقلید کرتے ہیں۔
- ایک خاتون اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہیں کہ مجھے یاد ہے بچپن میں ایک روز ہمارے ماں مہمان آئے۔ میں نے کسی بات پر ضد کی تو اس پر مہانوں کے سامنے

مجھے مار پڑی مجھے مہانوں سے بہت شرمندگی ہوئی۔ میں نے بہت پیچ و پکار کی۔ امی مسلسل کہے جاتی تھیں چپ کر! بیٹی کا شور مچانا اچھا نہیں ہوتا۔ میں آ رہی ہوں تمہیں چپ کر داتی ہوں۔ امی نے اس بارے میں بالکل نہ سوچا کہ میری ضد کی وجہ کیا ہے اور میں کیوں شور مچا رہی ہوں۔ وہ صرف یہ چاہتی تھیں کہ اس طرح کی باتوں سے مجھے چپ کر دے، جو مجھے اور بھی بڑی لگتی ہیں۔ لیکن میں نے بھی زیادہ شور مچایا۔ ماں نے اپنے تئیں اس کا بہترین حل سوچا۔ گڑیا کے جو کپڑے میں نے خود دیئے تھے وہ اٹھا لیں مجھے وہ جان سے زیادہ عزیز تھے۔ انہیں اتنی نے میرے سامنے آگ لگا دی۔ گویا میری ساری امیدیں ختم ہو گئی۔ میں آگ کے شعلے کی طرف دیکھتی تھی اور آنسو بہاتی تھی۔ اس دشیانہ واقعہ سے میرے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی کہ جسے میں آج تک بھلا نہیں سکی۔ اور اب بھی مجھے اس پر آنسوں سے بہتا ہے اور کبھی کبھی میں اپنی اتنی سے کہتی ہوں.....

کام اور فرض کی ادائیگی

کام اور کوشش انسانی زندگی کی بنیاد ہیں۔ کام کے ذریعے انسان روحی بڑھاپا اور مکان مہیا کرتا ہے۔ کام اور محنت کے ذریعے زمین آباد ہوتی ہے۔ اور لوگوں کے لیے آرام و آسائش کے اسباب فراہم ہوتے ہیں یہ اتنی صنعتیں اور حیران کن ایجادات انسانی کام اور محنت کا نتیجہ ہیں۔ یہ علم اور محنت ہے کہ جس نے موجودہ تمدن کو وجود بخشا ہے اور انسان کو یہ عظمت عطا کی ہے۔ ہر ملک کی ترقی اور پیش رفت اس ملک کے افراد کی محنت اور کوشش سے وابستہ ہے۔ اگر کسی ملک کے افراد مختلف جیلوں بہانوں سے کام کرنے سے بچیں۔ بالخصوص پیداواری کاموں سے بچیں تو وہ ملک خوشحال نہیں ہو سکتا۔ ایسی قوم پیدا کرنے والی نہیں صرف حرف کرنے والی ہوگی اور وہ استعماری قوتوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ ہر فرد کی ترقی بھی اس کے علم، کام اور کوشش سے وابستہ ہے۔ دنیا کام اور محنت کا مقام ہے نہ کہ سستی اور تن پروری کا۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

”وَأَنْ كَيْسَ يَدْعُوْا شَاكِرًا لِأَمَّا سَعٰی“

”انسان کے لیے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی کوشش کا حاصل ہے“ اے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

”مَلْعُوْنَ مَنْ أَلْفَى كَلِمَةً عَلَى النَّاسِ“

”وہ جو اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالے رکھے وہ ملعون ہے“ لکھ
 پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ
 ”عبادت کے ستر (۷۰) حصے ہیں۔ جن میں سب سے افضل رزق حلال کے
 حصول کی کوشش ہے“ لکھ

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :
 ”میسرے دوستوں اور شیعوں کو میرا سلام پہنچانا! اور ان سے کہنا! تقویٰ کو بڑھانا
 اور اپنی آخرت کے لیے توشہ تیار کرنا۔ خدا کی قسم میں صرف اس چیز کا
 تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جس پر خود عمل کرتا ہوں۔ محنت اور کوشش کریں۔ غار
 صبح کے بعد جلد کام پر نکل جائیں اور رزق حلال حاصل کریں۔ کام کریں۔ خدا
 تمہیں رزق دے گا اور تمہاری مدد کرے گا“ لکھ

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :
 ”جو شخص دنیاوی امور میں سست اور کاہل ہو وہ مجھے بُرا لگتا ہے۔ جو شخص
 محنت و مشقت میں سست ہو وہ اموں آخرت میں بھی سست ہوگا“ لکھ
 امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :
 ”جو شخص اپنے خاندان کی روزی کے لیے زحمت اٹھاتا ہے اسے جہاد کا
 ثواب ملے گا“ لکھ

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

۱۔ کافی، ج ۵، ص ۷۲

۲۔ کافی، ج ۵، ص ۷۸

۳۔ کافی، ج ۵، ص ۷۸

۴۔ کافی، ج ۵، ص ۸۵

۵۔ کافی، ج ۵، ص ۸۸

”کسان انسانوں کے لیے خدا کے خزانے ہیں۔ وہ اچھا بیج بونٹے ہیں اور خدا اس بیج کو اگانا ہے قیامت میں کسانوں کا سترین مقام ہے۔ اور انہیں ”مبارکین“ کے نام سے پکارا جائے گا۔“

ہر انسان دوسروں کی محنت اور کام سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ دوسروں کی محنت اور دھمت کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی طاقت کے مطابق کام اور محنت کرے اور دوسرے انسانوں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ مزدور بہترین اور شریف ترین انسان ہیں جو لوگ خود طاقات رکھتے ہیں لیکن کام نہیں کرتے اور دوسروں کی محنت پر پلتے ہیں وہ پروردگار عالم کی دھمت سے دور ہیں جن ماں باپ کو اپنی اولاد کی سعادت اور خوش بختی مطلوب ہے اور جنہیں اپنے ملک کی خوشحالی اور ترقی پسند ہے وہ اپنے تربیتی پروگرام میں بچوں کو محنت کرنا بھی سکھائیں۔ اپنے بچوں کی اس طرح سے تربیت کریں کہ وہ بچپن ہی سے کام کرنے کے شوقین اور ملواری ہو جائیں تاکہ بڑے ہو کر نہ صرف یہ کہ وہ کام کرنے کو ننگ و عار نہ محسوس بلکہ اس پر افتخار کریں۔ بہت سے ماں باپ زندگی کے اس انتہائی اہم موضوع سے غفلت برتتے ہیں اور اس طرف بالکل توجہ نہیں دیتے یہاں تک کہ ایک عرصے تک وہ بچوں کے کام خود انجام دیتے ہیں اور انہیں کوئی ذمہ داری نہیں سونپتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے وہ اپنی اولاد کی خدمت کر رہے ہیں جب کہ یہ خدمت نہیں بلکہ بہت بڑی خیانت ہے بچے سے بھی ملک و قوم سے بھی کبھی وہ یہ بہانہ کرتے ہیں کہ کام کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے کام کرنا بچے کے لیے دشوار ہے۔ بڑا ہو گا تو خود ہی کام کے چھپے چل پڑے گا۔ جب کہ ان کی یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ جو کام بچے کی عمر اور طاقت کے مطابق ہو وہ بچے کی طبیعت کے مخالف نہیں ہے جب کہ اس کی جبلت اور ضرورت کے مطابق ہے۔ اگر انسان کو بچپن ہی سے کام کرنے کی عادت نہ پڑے تو بڑا ہو کر کام کرنے میں دیر بھی لگے گی اور اس کے لیے دشوار بھی ہو گا۔ اگر صحیح تربیت کی جائے تو کام کرنا بچے کے لیے پسندیدہ بھی ہو گا اور لذت بخش بھی۔

ایسے ماں باپ کبھی کہتے ہیں! اتنا حوصلہ کس میں ہے کہ انتظار کرے کہ بچہ اپنا کام خود انجام دے ہم اس کے لیے زیادہ جلدی کام کر کے فارغ ہو سکتے ہیں۔ بڑا ہو گا تو خود کام کرتا رہے گا۔

ان نادان ماں باپ کو اگر واقف اپنی اولاد سے محبت ہو تو وہ ایسے بے جا بہانے بنا کر اپنے آپ کو اولاد کی تربیت سے بری الذمہ قرار دیں اور رست، کابل اور بے کار افراد معاشرے میں بطور یادگار بچھوڑیں۔

فرق شناس اور سمجھ دار ماں باپ بچے کی عمر، جسمانی قوت اور اس کے فہم و شعور کو مد نظر رکھتے ہوئے کوئی کام اس کے ذمے لگاتے ہیں نیز اس کام کی انجام دہی میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ مثلاً تین سالہ بچے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنا جوتا اور جرابیں خود پہناؤ اور خود اتارو، اپنی نیکر خود پہنو، تنک دانی، چمچ اور کانا لاؤ۔ جب بچہ کچھ بڑا ہو جائے تو تدریجاً بڑے کام اس کے ذمے لگائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنا بستر خود بچھائے اور خود ہی تکرے، کوٹنا کرکٹ کا برتن خالی کر کے لائے، کھانا پکائے، دسترخوان لگائے اور اٹھائے، برتن دھوئے، کمروں میں جھاڑو دے، مخصوص اوقات میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی حفاظت کرے یا غیبتے میں چھوٹوں اور درختوں کو پانی دے، پالتو جانوروں کو پانی اور کھانا دے۔ روٹی، مہزی، دورو، دہی، مرن، صابن، ٹوٹھر پیسٹ خرید کر لائے، کھیل کا سامان صاف کرے اور سلیقے سے رکھے۔ ایسے کام بچے آرام سے انجام بھی دے سکتے ہیں اور انہیں اپنے ذمہ بھی سے سکتے ہیں۔

جب بچے کچھ اور بڑے ہو جائیں تو کچھ مشکل تر کام ان کے ذمے لگائے جاسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ماں باپ کے لیے چند باتیں ضروری ہیں :

۱۔ بچے کی عمر اور بدنی قوت کو مد نظر رکھتے ہوئے جب بھی وہ دیکھیں کہ بچہ کسی کام کی استعداد رکھتا ہے تو وہ کام اس کے ذمے لگادیں۔ بالخصوص جب بچہ خود کوئی کام کرنے کی خواہش کرے۔ خاص طور پر وہ کام جو خود بچے کی ذات سے مربوط ہیں تاکہ

وہ بچپن ہی سے کام کرنے کا عادی ہو جائے اور است اور آرام طلب فرد نہ بن جائے۔

۲۔ بچے کی قوت اور حوصلے کو پیش نظر رکھا جانا چاہیے اور مشکل اور زیادہ سخت کام اس کے ذمے نہ لگایا جائے۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے وہ کام سے بیزار ہو جائے اور آئندہ کام سے جی بچرائے۔ اگر کام تھکا دینے والا ہو تو وہ بوسکتا ہے بچہ سرکشی کا مظاہرہ کرے۔

۳۔ کوشش کریں کہ کام بچے کے سپرد کرتے وقت افہام و تفہیم سے کام لیں۔ اسے سمجھائیں کہ گھر کے کام خود بخود انجام نہیں پاتے۔ باپ محنت و مشقت کر کے گھر کا خرچ چلتا ہے، ماں بھی گھر کی کام انجام دیتی ہے، تم بھی اسی خاندان کے ایک فرد ہو، گھر کے کام چلانے کے لیے ہمت کرو اور اپنی طاقت کے مطابق ان کاموں میں ملک کر دو۔ ایسے مواقع پر حتی المقدور زور اور جبر سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غلط اور ناصحی اطاعت کا عادی ہو جائے۔

۴۔ اگر ممکن ہو تو کسی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے حق انتخاب بچے کو دیں مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں اگر تو چاہے تو برتن دھوے چاہے تو کمرہ صاف کرے۔

۵۔ کام کی حدود اور مقدار بچوں پر بالکل واضح کریں تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور اس میں شک و شبہ میں نہ پڑیں۔

۶۔ جن بچوں میں صلاحیت ہو ان کے لیے مستقل کام معین کر دیں۔ اس طرح سے کہ وہ متوجہ رہیں اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا ہو۔ مثلاً کسی ایک بچے سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دسترخوان پر ہمیشہ سلاہ ہونا چاہیے۔ سلاہ خریدنا تیرے ذمے ہے۔ صرف، صابن اور ٹوٹھ پیسٹ خریدنا بھی تیرے ذمے ہے۔ ہمیشہ توجہ رکھا کہ گھر مرف، صابن اور ٹوٹھ پیسٹ سے خالی نہ ہو۔

۷۔ کوشش کریں کہ حتی المقدور بچے کے ذمے ایسا کام کریں جو اس کی طبیعت اور پسند کے مطابق ہو تاکہ وہ اپنا کام خوشی خوشی انجام دے۔ البتہ بعض استثنائی مواقع

پر اسے طبیعت کے خلاف کام بھی کرنا چاہیے۔ اور چاہیے کہ وہ ایسے کام بھی ناک منہ چڑھانے بغیر انجام دے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”گھر میں سب کام کرنے والوں کے لیے ایک کام معین کرو اور ہر کسی کی ذمہ داری اس کے سر ڈال دو جب وہ اپنی ذمہ داری سمجھ لیں گے تو پھر یہ نہیں

سوچیں گے کہ یہ کام کسی دوسرے کو کرنا ہے۔“

۸۔ اگر آپ کے گھر میں متعدد بچے ہوں تو تقسیم کاری حالت کو ملحوظ رکھیں تاکہ لڑائی جھگڑا نہ ہو اور وہ خوشی خوشی اپنا کام انجام دیں۔

۹۔ بچوں کو کام کرنے پر مائل کرنے کے لیے آپ ان کے ساتھ مل جل کر کام کر سکتے ہیں کیونکہ بچوں کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ وہ بڑوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔

۱۰۔ اگر ماں باپ کے درمیان گھر کا نظام چلانے میں ہم آہنگی اور تعاون ہو تو وہ اپنی اولاد کے لیے بہترین نمونہ ہیں اور اس طرح سے وہ بچوں میں ذمہ داری قبول کرنے کا شوق پیدا کر سکتے ہیں۔

۱۱۔ جب بچے بڑے ہو جائیں اور وہ کوئی ایسا کام کر سکیں جو ماویا اعتبار سے مفید ہو تو پھیل

کے دنوں میں ان کے لیے کوئی کام اور ممکن ہو تو کوئی پیداواری کام ان کے لیے مہیا کریں اور اس کی انجام دہی میں انھیں تشویق کریں۔ اس طرح سے انہیں کام کرنے کی عادت بھی پڑے گی اور گھر کے خرچ میں وہ مدد کر سکیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ

وہ قوم و ملک کی خدمت بھی کر سکیں گے۔ انہیں سمجھائیں کہ کام کرنے میں کوئی عادتیں بلکہ یہ باعث افتخار و شرف ہے۔ البتہ ان پر زیادہ دباؤ بھی نہ ڈالیں۔ انہیں تفریح اور

کھیل کا بھی موقع دیں یہ درست نہیں کہ ماں باپ کہیں ہم مالی اعتبار سے خوش حال ہیں اور اپنے بچوں سے کام لینے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں

تو وہ ادارہ گرد اور مفت خورد بن جائی گے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر یاد دلادیں کہ کام کرنے کے شوق اور محبت کی بنیاد بچپن میں رکھی جانا چاہیے تاکہ یہ بات بچے کی طبیعت میں رچ بس جائے اور وہ اس کا علوی ہو جائے ورنہ بعد میں یہ کام دشوار ہو جائے گا۔ فرض شناس ماں باپ کو چاہیے کہ اس اہم فرض سے غفلت نہ کریں۔ ایک عورت اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہے۔

”میں بہت سست، بے حوصلہ اور مندی عورت ہوں۔ بے چین اور ڈری ڈری رہتی ہوں۔ میرے محلے میں روم ہے۔ کچھ کام کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ کام کرنا تو میرے لیے بہت مشکل ہے گھر کا نظام سنبھالنے اور کھانا پکانے سے عاجز ہوں۔ اسی وجہ سے شوہر اور اس سے ہمیشہ میری جگہ رہتی ہے۔ اور ان سب بدبختیوں کا سبب میری مال ہے۔ وہ بہت مہربان، باعبر اور باحوصلہ عورت تھیں۔ میں ایک گھر لڑکی تھی۔ لیکن انی کوئی کام میرے سپرد نہیں کرتی تھیں۔ گھر کے سب کام خود انجام دیتی تھیں، انہوں نے مجھے کام کرنا اور گھر کا نظام چلانا نہ سکھایا۔ کوئی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالی کہ مجھے بھی کوئی ذمہ داری نبھانے کی عادت پڑتی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں تھک جاؤں اور اپنے تئیں وہ میرے بارے میں اچھا سوچتی تھیں۔ لیکن اس بات کی طرف ان کی توجہ نہ تھی کہ مجھے آئندہ زندگی جی گزارنا ہے اور مجھے بھی ایک گھر کا نظام چلانا ہے۔

ایک صاحبہ اپنے ایک خط میں لکھتی ہیں :

..... میں گھر کی سب سے بڑی بیٹی ہوں۔ اپنی زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں اور کسی قسم کی کمی محسوس نہیں کرتی۔ بخیل اور حاسد نہیں ہوں۔ دوسروں کے لیے مہربان اور ہمدرد ہوں۔ دنیا کے زور و زور کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔ سب کچھ کرنا جانتی ہوں۔ زندگی کے معاملات احسن طریقے سے نبھاتی ہوں۔ مجھے کسی قسم کا کوئی غم نہیں ہے۔ ایک صاف ستھری، پرسکون اور آرام دہ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ میں اپنے مال باپ کی شکر گزار ہوں کیوں کہ یہ انہی کی علاقہ

تربیت کا نتیجہ ہے۔

جب میرے ابو گھر میں داخل ہوتے تو مجھے پکارتے۔ جو کچھ لانے مجھے تھا دیتے۔ زیادہ پیسے لانے تو میرے پیرو کر دیتے کہ سیف میں رکھ دوں اگر ان کا ہٹن ٹوٹ گیا ہوتا یا ان کے لباس کو استری یا سلائی کی ضرورت ہوتی تو مجھے دے دیتے تاکہ میں یہ کام انجام دوں۔ جب میں وہ کام کر دیتی تو مجھے شاباش دیتے۔ ایک روز میں نے ان کا لباس خوب اچھے طریقے سے سیاہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: میں تمہارے لیے ایک سلائی مشین لاؤں گا۔

چند ہی روز بعد انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور میرے لیے سلائی مشین لے آئے۔ اس دن سے سلائی کا کام میرے ذمے ہو گیا۔ میری اتنی قیمتی کپڑا مجھے دیتیں اور کتیں: جاؤ اسے سیو، اگر خراب ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔

میری اتنی چوکہ مجھے اطمینان دلاتی تھیں لہذا مجھ میں خود اعتمادی بڑھ گئی۔ میں کوشش کرتی کہ کام اچھے طریقے سے انجام دوں۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی کوئی کپڑا خراب کیا ہو۔

خاصہ یہ کہ میں اپنے ماں باپ کی توجہ اور تشویق کی وجہ سے تمام کام کرنا سیکھ گئی۔ کام کرنے اور ذمہ داری نبھانے کی عادی ہو گئی۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی اولاد کی بھی اسی طرح تربیت کروں گی۔



راستگونی

جھوٹ بولنا ایک انتہائی بُری صفت ہے اور گناہانِ کبیرہ میں ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اور ملتیں جھوٹ بولنے کی مذمت کرتی ہیں۔ اور جھوٹ بولنے والے کو پست اور گھٹیا قرار دیتی ہیں۔ جھوٹ بولنے والے شخص کا دنیا والوں کی نظر میں کوئی عزت و اعتبار نہیں ہوتا۔ ایک شریف اور اچھا شخص جھوٹ نہیں بولتا۔ اسلام نے بھی اس بُری صفت کی مذمت کی ہے۔ اور اسے گناہِ کبیرہ اور حرام قرار دیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں،

”جھوٹ خرابیِ ایمان کی بنیاد ہے“ ۱

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں،

کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا جو زیادہ جھوٹ بولتا ہے اس کی کوئی

عزت نہیں ہوتی ۲

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،

”کوئی کام جھوٹ سے بڑھ کے گھٹیا نہیں ۳

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۶

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۲

۳۔ مستدرک، ج ۲، ص ۱۰۰

اللہ کے سبب نبیوں اور سب دینی رہنماؤں نے لوگوں کو سچائی کی دعوت دی ہے۔ سچ ایک فطری اور طبیعی چیز ہے۔ اور انسان کی سرشت کا حصہ ہے سب سچ اور سچے کو پسند کرتے ہیں۔ اور جھوٹے سے نفرت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جھوٹ بولنے والا شخص بھی ایسا ہی ہے۔ اگر بچے کو اس کے حال پر جھوٹ دیا جائے تو فطری طور پر اس کی تربیت ایسی ہوگی کہ وہ سچا ہو گا۔ یہ تو خارجی عوامل اور اسباب ہیں کہ جو اسے خداوندِ مطلق سے مخرب کر دیتے ہیں اور اسے دروغ گوئی کی طرف لے جاتے ہیں۔ جھوٹ بولنا ایک نئے نئے سچے سے اصلاً میل نہیں کھاتا۔ بعد ازاں اس سے منحرف ہو جائے اور جھوٹ بولنے کا عادی بن جائے تو بڑے ہو کر یہ عادت ترک کرنا اس کیلئے دشوار ہو گا اور زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ ایسے دستبردار نہیں ہو گا پھر اس پر نہ کوئی آیت اثر کرے گی نہ روایت اور نہ وعظ و نصیحت۔

مالِ باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچپن ہی سے اس بات کی فکر کریں کہ ان کی اولاد سچی ہو۔ جھوٹ کے ملل و اسباب کو روکیں اور سچائی کو بحال کی سرشت میں شامل ہے اس کی پرورش کریں۔ سچائی کی تربیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور نہ اسے ہٹاتے ہوئے پر ٹھالی دینا چاہیے۔

جو ماں باپ اپنی اولاد کی تربیت کے خواہش مند ہیں اور انھیں ذمہ داری رکھتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ فرمائیں۔

۱۔ بچے کی تربیت پر اثر انداز ہونے والی ایک نہایت اہم چیز خاندان کا ماحول ہے۔ خاندان کے ماحول میں بچہ پر دان چڑھتا ہے اور وہ ماں باپ سے اور ساتھ رہنے والوں سے اخلاق سیکھتا ہے اور ان کی پیروی کرتا ہے۔ اگر گھر کا ماحول سچائی اور درست چربی ہو، ماں باپ اور دیگر افراد صداقت اور سچائی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش آئیں گے تو اس کے بچے بھی یہی سیکھیں گے۔ اس کے برعکس اگر گھر کا ماحول ہی جھوٹ اور دروغ گوئی پر مبنی ہو، ماں باپ ایک دوسرے سے اپنی اولاد سے اور دیگر افراد سے جھوٹ بولتے ہوں گے بے گناہ بچے جو ایسے ماحول میں پرورش پائیں گے یہ بڑی علت ماں باپ سے سیکھیں گے اور دروغ گو بن جائیں گے۔ جن بچوں کے کان جھوٹ سے آشنا ہو گئے ہوں اور جو ہر روز

ماں باپ سے دروغ گوئی کے مظاہر دیکھتے ہوں ان سے کیسے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ
 پتے اور صادق پرواں پر تھیں۔ ایسے ماحول میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ جھوٹے اور فریبی شخص
 کے علاوہ کچھ تربیت نہ کر سکے۔ ایسا دروغ ماحول ہی ہے کہ جو ایک حساس اور اثرناش قبول کرنے
 والے بچے کی غفلت کو بچائی سے منحرف کر دیتا ہے اور دروغ گوئی کا عادی بنا دیتا ہے۔ بعض
 نادان ماں باپ نہ صرف یہ کہ خود جھوٹ بولتے ہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی جھوٹ بولنے کی تلقین
 کرتے ہیں۔ باپ گھر پر ہے لیکن بچے کو کہتا ہے فلاں شخص ملے کہو اگر گھر پر نہیں ہیں بچہ جو
 ٹھیک ٹھاک تھا اور اس نے گھر کا کام نہیں کیا باپ اس سے کہتا ہے استاد سے کہنا میں بیمار
 تھا۔ ایسے سیکڑوں جھوٹ ہیں جن کا بعض گھروں میں ہر روز نکرار ہوتا ہے۔ ویسے نادان ماں باپ
 اپنے بچوں سے بہت بڑی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولنا گناہ ہے لیکن جھوٹ
 سکھانا اس سے کہیں بڑا گناہ ہے۔ جھوٹے ماں باپ جھوٹ بولنے کی سزا کے علاوہ بھی بہت
 بڑی سزائیں کے اندر وہ ہے جھوٹ بولنے کی تربیت دینا۔ کیا یہ سزا بچوں کے لئے
 ماں باپ کہ جو خاندان کے سرپرست ہوتے ہیں وہ جھوٹ بولیں تو یہ کوئی معمولی گناہ نہیں
 ہے بلکہ بہت بڑا گناہ ہے جس کے ساتھ بہت بڑا گناہ منکاب ہے اور وہ ہے بچوں کو جھوٹ
 سکھانا۔ ایسے ماں باپ نہ صرف گناہ کہیں گے مرتکب ہوتے ہیں اور انہیں اس کی سزا ملے
 گی بلکہ وہ اپنے معصوم بچوں کے ساتھ بھی ایک بہت بڑی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔
 جب کہ میں بچے ان کے پاس کی امانت میں ہوں اور یہ خیانت ان کی معاشرے کے ساتھ بھی ہے۔
 ایسے ماں باپ ہی ہیں جو ایک جھوٹے اور خراب کار معاشرے کو وجود دیتے ہیں۔
 ان کے لئے جو ماں باپ چاہتے ہیں ان کے بچے ہوں ان کے پاس ان کے علاوہ کوئی
 چاہ نہیں کہ وہ خود راست گوئی اختیار کریں اور اپنی اولاد کے لیے بہترین ماحول فراہم کریں اور ان
 کے لیے نیک عمل بنیں۔

دل لکھتا ہے۔

”اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچے جھوٹ بولنا نہ سیکھیں تو اس کے علاوہ کوئی
 چارہ نہیں کہ بڑے پوری توجہ سے ہمیشہ بچوں کے سامنے سچائی رکھیں۔“

اختیار کریں ” لے

اسے کاٹش ارسل کتا کہ !!

بچوں کے سامنے بھی اور ہر کسی کے سامنے بھی سچائی اختیار کریں۔

کیونکہ بچوں کی پاک فطرت ہر جھوٹ سے متاثر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ حتیٰ جھوٹ بھی جلد ان کے سامنے آشکار ہو جاتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

” لوگوں کو بغیر زبان کے اچھائی کی طرف دعوت دیں لوگ آپ سے قویٰ،

محنت، نماز، نیکی دیکھیں اور اس طرح سے ان کے لیے ایک نمونہ عمل

ہیسا ہو جائے ” لے

۲۔ بچہ فطری طور پر دروغ گو نہیں ہوتا بلکہ اس کی فطرت اولیہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ راستگو

ہو۔ اس کے جھوٹ بولنے کے لیے کسی سبب کی ضرورت ہے۔ اگر ماں باپ جھوٹ بولنے

کے عمل واسباب پہچان لیں اور ان کی روک تھام کریں تو بچہ جلتنا راست گو ہوگا۔ ایک سبب

جو بچے کو جھوٹ بولنے پر ابھارتا ہے وہ ماں باپ کی ماریٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کا خطرہ ہے

مثلاً بچے نے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ ماں باپ سے ڈرتا ہے کہیں اسے ماریں نہ۔ بلکہ جب

اس سے پوچھتے کہ شیشہ تم نے توڑا ہے تو جواب دیتا ہے نہیں! مجھے بالکل نہیں پتا۔ یا

پھر شیشہ توڑنے کا الزام کسی دوسرے پر لگا دیتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے کہ

حسن نے شیشے کو پتھر مارا ہے واضح ہے کہ اس بچے کے جھوٹ بولنے کی وجہ اس کا

ماں باپ سے خوف ہے۔ اگر ماں باپ سمجھدار، ہوش مند اور منصف مزاج ہوں اور

بچوں کی تربیت کے لیے انہوں نے صحیح حکمت عملی اپنائی ہو تو ان میں ایسا خوف پیدا

نہیں ہوگا کہ جس کی وجہ سے وہ جھوٹ بولیں اور پھر تدریجاً جھوٹ بولنے کی انہیں عادت

لے در تربیت۔ ص ۱۴۸

لے اصول کافی، ج ۲، ص ۷۷

پڑ جائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے شیشہ سہواً اور بلا ارادہ ٹوٹ گیا ہو یاں صورت میں بچہ تنبیہ اور سرزنش کا مستحق نہیں ہے۔ یہ تو کئی دفعہ ماں باپ کے ساتھ بھی پیش آیا ہو گا کہ شیشہ ان سے غیر ارادی طور پر ٹوٹ گیا ہو اور اس صورت میں انہوں نے اپنے آپ کو مجرم نہیں سمجھا ہو گا۔ پھر بیچارے بچے کو وہ کیوں مجرم سمجھتے ہیں اور اس پر کیوں غصہ بھاڑتے ہیں! اور اگر شیشہ کم توجہی اور بے احتیاطی کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے تو ماں باپ کو چاہیے کہ نرمی سے اس کو نصیحت کریں۔ اور سمجھائیں اور اسے کہیں کہ وہ اپنے کاموں میں توجہ اور احتیاط سے کام لے تاکہ اس طرح کے واقعات پیش نہ آئیں۔

اس صورت میں بھی بچہ مار پیٹ اور طاعت کا مستحق نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے وہ خوف زدہ ہو کر بھوٹ کا سہارا لے۔ اور اگر اس نے شیشہ عمدتاً توڑا ہے اور اس کے لیے اسی نے سرکشی اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا ہے پھر بھی مار پیٹ اور سرزنش مکمل نہیں ہے۔ کیونکہ مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ سے بچے کی تربیت نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اس طرح سے اسے خرابیوں اور ضد بازیوں سے روکا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ماں باپ کو اس امر کی طرف خیال رکھنا چاہیے کہ بچہ فطری اعتبار سے شردوست اور بدجنس نہیں ہوتا۔ اس کی شرارت اور ضد کا یقیناً کوئی خارجی سبب موجود ہے۔ لہذا گوشش اور تحقیق کرنی چاہیے تاکہ شیشے ٹوٹنے کا اصل سبب اور وجہ معلوم کی جائے۔ جب سبب دور ہو جائے گا تو پھر اس طرح کے کاموں کی تسمار نہیں ہوگی۔ مثلاً ہو سکتا ہے اس کی تحقیر اور توہین کی گئی ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی طرف کم توجہ دی جاتی ہو۔ ہو سکتا ہے ماں باپ کی سرد مہری کا شکار ہو، ہو سکتا ہے ماں باپ یا کسی اور نے اس پر ظلم کیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس سے غیر سادیا نہ سلوک برتا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے ایسی ہی کسی وجہ سے بچے کے اندر ضد اور سرکشی پیدا ہو گئی ہو۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ شیشہ اس نفسیاتی کیفیت یا احساس کمتری کی وجہ سے یا دوسروں کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے توڑا ہو یا ایسے ہی کسی سبب سے اس نے کوئی اور غلط کام سرانجام دیا ہو۔ اگر ماں باپ اس کے غلط کام کی نفسیاتی وجہ برطرف کر دیں تو بچہ بھی غلط کام اور سرکشی چھوڑ دے گا تو پھر ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جائے گی۔ لہذا ایسے موقع پر بھی مار پیٹ اور ڈانٹ

ڈپٹ کا بیعت نہیں ہو گا کہ جسے کو جس کی وجہ سے جھوٹ بولنا چاہئے۔
 سن ۲۱۱۱ء تک آپ کو معلوم ہو کر آپ کے بچے کو فی غلط کام کیا ہے اور آپ اس کی ذمہ داری
 کو اپنا میں تھیں۔ اس سے اعتراض نہ ہو کہ اس نے کے لیے ایک سخت گیر اور بدتمیز پولیس بولڈ کے طرح
 بلانڈ ہوئی اور سوال نہ کریں ہو سکتا ہے وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حقیقت چھپا سکے اور جھوٹ
 بولے۔ ایسے موقع پر بہتر ہے کہ نیز سوالیہ وجوہات کے اس کے کہیں مثلاً اسی سے کہیں مجھے معلوم
 ہے کہ جو کتاب تم اپنے دوست سے مانگا ہے کہ اسے تم نے بھی تم نے اس سے واپس نہیں کی۔ نیز
 اچھا نہیں ہے! لوگوں کی امانت مقرر موقع پر انیس واپس کرنا چاہیے۔ اپنے دوست کی کتاب قزاق
 اسے لٹا دو اور اس سے مہذرت کہو۔

حکم۔ بچہ کو ایسی دھمکی ہرگز نہ دیں کہ جسے انجام دینے کا آپ کا ارادہ نہ ہو۔ مثلاً اس سے
 نہ کہیے کہ تو نے فلاں کام کیا تو تجھے مار ڈالوں گا یا میٹوں گا یا پولیس کے حوالے کر دوں گا۔
 بلکہ گھر سے نکال دوں گا۔ یا مجھے فلاں کے پاں دعوت پر ساتھ نہ لے جاؤں گا۔ کیوں کہ
 ایسی جھوٹی دھمکیوں سے آپ بچے کو جھوٹ بولنا سکھائیں گے۔ آپ کو چاہیے کہ بچے سے
 دیکھا بات کریں جسے آپ انجام دینا چاہتے ہیں۔ اور جن کا انجام دینا درست بھی ہے۔
 ہر جہاں باپ اپنی اولاد سے سختی کرتے ہیں اور ان کی طاقت اور صلاحیت سے
 زیادہ ان سے توقعات رکھتے ہیں ہو سکتا ہے وہ اس طرح سے بچوں کو جھوٹ کی طرف دھکیل
 دیں۔ مثلاً اگر وہ جانتے ہوں کہ ان کا بچہ پڑھنے کی استعداد نہیں رکھتا اور یہ اس سے توقع
 رکھتے ہوں کہ بیشتر بہترین نمبر لے کر آئے بلکہ کلاس میں فرسٹ آئے۔ ہر روز اس سے
 پوچھتے رہتے ہوں کہ کتنے نمبر لیے ہیں اور پھر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔ بچہ میں بچوں کا
 یہ استعداد نہیں ہے وہ جتنی بھی کوشش کرتا ہے ماں باپ کی توقع کے مطابق نمبر نہیں لپاتا۔
 بچہ چونکہ چاہتا ہے ماں باپ کی خوشنودی حاصل کرے اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے ڈرتا
 ہے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھی جھوٹ بولے یا کہے کہ امتحان کے موقع پر میرے سر میں
 درد ہونے لگا تھا۔ میں اچھے طریقے سے امتحان نہیں دے سکا۔ یا کہتا ہے میرے کلاں
 فیلو نے ایسی باتیں کہیں جس سے میرے حواس کھر گئے، یا کہتا ہے استاد کو مجھ سے غرض نہ

اس لیے اس نے مجھے اچھے نمبر نہیں دیے۔ یا کہتا ہے آج میں نے پورے سو نمبر لیے ہیں۔
اگر اس بچے کے ماں باپ اُس کی صلاحیت اور طاقت کو سمجھ لیتے اور اس سے
بلے جا توقعات نہ رکھتے تو اسے دروغ گوئی پر آمادہ نہ کرتے اور اس طرح اسے رفتہ
رفتہ جھوٹ بولنے کی عادت نہ پڑتی۔

۶۔ بعض ماں باپ جیب اپنے ننھے بچے سے کوئی بڑا کام دیکھتے ہیں تو اس کو بڑی الذمہ
قرار دیتے ہیں اور یہ بڑا کام دوسروں کے ذمے لگا دیتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات حیوانات
اور جمادات پر الزام دھرنے لگتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ حسن تو اچھا بچہ ہے اس نے یہ کام نہیں کیا۔
یہ کسی بلی چوہے نے کیا ہے۔ مہاسیہ کے بچے نے کیا ہے یا کسی درخت نے کیا ہے گندی
دلی نے کیا کیوں یہ کام کیا ہے۔ یہ سب باتیں لگاتار کہیں رہیں تو بچہ بڑا ہوتا ہے تو
یہ باتیں ناواں ماں باپ اپنے تئیں اچھا کام کر رہے ہوتے ہیں کہتے ہیں بہتر ہے بچے سے
سلطے بڑا کام کرنے کی اجازت کو کھولا نہ جائے لیکن اس کے اخلاقی نقصانات اور بد اثریوں
سے فاضل ہیں۔ اس کام کے دو بڑے نقصانات ہیں۔ پہلا یہ کہ بچہ کے مترادف ہے اور اسے جھوٹ
ایک طرف تو یہ بچے کو غلط سیالی کی تلقین کر لیتا ہے مترادف ہے اور اسے جھوٹ
بولنا سکھاتا ہے۔ دوسری طرف علامہ ابراہیم قرطبی نے فرمایا ہے کہ غلط اور جھوٹے کام انجام دے
کر انہیں دوسروں کی گردن پر ڈالا جاسکتا ہے۔ اور یہ کام جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ بڑا
ہے اور اس کا نقصان بھی زیادہ ہے۔

۷۔ اگر اتفاقاً آپ کے بچے جھوٹ بولیں تو کوشش کریں کہ اس کی وجہ معلوم کریں اور
اس کے علاج کے ذریعے ہوں۔ البتہ اس بات پر زور نہ دیں کہ تحقیق وجہ سے ان کا
جھوٹ بولنا ثابت کیا جائے اور انہیں سزا دی جائے اور نہ اس کی وجہ سے ان کا
ثابت ہو جائے تو اس کا اس کے سوا کوئی فائدہ نہ ہو گا کہ بچے کو سزا دی جائے اور نہ اس کی وجہ سے
اور انہیں اس سے اور بھی بے باک ہو جائے گا۔ اور اس کی جرات بڑھ جائے گی۔

وفاتے عہد

انسانی زندگی کا نظام عہد و پیمان کے بغیر نہیں چل سکتا۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ قول و قرار کرتے ہیں یہ عہد و پیمان ہی ہے جس کے ساتھ خاندان تشکیل پاتا ہے۔ شہروں اور ملکوں کو معاہدے ہی ایک دوسرے سے مربوط کرتے ہیں۔ لوگ اس قول و قرار کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور یہ ان کی اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے ایسا نئے عہد کا ضروری ہونا ایک فطری چیز ہے اور ہر انسان فطرتاً اس کو سمجھتا ہے اور عہد و پیمان کی خلاف ورزی کو بُرا اور قبیح سمجھتا ہے ہر شخص جو دوسرے سے عہد و پیمان باندھتا ہے توقع کرتا ہے کہ وہ اس کی پاسداری کرے گا۔ جو گروہ بھی اپنے عہد و معاہدوں کا وفا دار ہوگا ان کا اجتماعی نظام اچھے طریقے سے چلے گا۔ کیوں کہ ان کو ایک دوسرے پر اعتماد اور حسن ظن ہوگا۔ وہ نفسیاتی طور پر آرام اور اطمینان سے رہیں گے۔ ان کے درمیان زیادہ لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا۔ وہ اعصاب کی کمزوریوں اور نفسیاتی پریشانیوں میں کم مبتلا ہوں گے۔ ان کی زندگی سعادت و خوش نختی سے ہمکنار ہوگی۔ لوگ جس قدر بھی اپنے عہد کے زیادہ وفا دار ہوں گے وہ زیادہ سکون آرام سے زندگی گزار سکیں گے۔ جب کہ اس کے برعکس جس ملک کے لوگ اپنے عہد کے وفادار نہ ہوں اس کا نظم و ضبط درست نہیں ہوگا ایسے لوگ باہمی لڑائی جھگڑے میں مبتلا رہیں گے۔ ان کے درمیان نفسیاتی پریشانیاں، اضطراب اور بے چینی زیادہ ہوگی۔ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کریں گے اور بدگمان رہیں گے۔ ہر شخص یا ہر وہ معاشرہ کہ جو اپنے عہد و پیمان کا پابند ہو دوسروں کے نزدیک عزیز، محترم اور قابل اعتماد ہوگا۔ جب کہ عہد شکن لوگ دوسروں کے نزدیک ذلیل اور گھٹیا سمجھے

جائیں گے۔ اسلام کا مقدس دین ایک فطری دین ہے اس میں اس حیات آفریں امر پر بہت تاکید کی گئی ہے اور ایسا نئے جہد کو واجب اور ایمان کی نشانیوں میں سے قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے :

”ادْفِنُوا بِأَلْفَيْدٍ إِنَّ الْمَعَادَ كَانَ مَسْئُولًا“

اپنے وعدے کو پورا کرو کیوں کہ وعدے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

(اسراء، آیہ ۲۴)

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ایک دوسری جگہ فرماتا ہے :

وَالَّذِينَ هُمْ يَدْعُونَ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُدْعَوْنَ .

(اور کیا یہ مومنین کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ امانت ادا کرتے ہیں اور عہد

کی پاسداری کرتے ہیں۔ (سورہ مومنوں - آیہ ۸)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ لَا يَمُوتُ وَلَا يَمُوتُ .

”جس شخص کا عہد تیس اس کا دین ہی نہیں ہے“ اے

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

”جو شخص بھی اللہ اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنا وعدہ وفا کرے“

حضرت علی علیہ السلام الک اشتر سے فرماتے ہیں :

”بیان شکنی سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے اور لوگ بھی“ لگے

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

لے بجا، ج ۷، ص ۹۶

لے کافی، ج ۲، ص ۳۶۴

لے بجا، ج ۷، ص ۹۶

یہ کہتے ہیں کہ یہ مقام پر اپنا دھرم پورا نہیں کر سکتا اور وہ وہاں نہ کہہ اور جہاں کو نہ کہتا چلا جائے۔
 کہ انہیں کہہ سکتا وہاں ضامن نہ بن سکتا۔

اس لئے کہ پورے معاشرے میں ایفائے عہد کا ایجاد ہو اور وہ سب لوگوں کی ایک
 ذمہ داری کے طور پر جانا جائے تو آپ اس اچھی عادت کو بچپن ہی سے بچوں میں پروان چڑھائیں
 تاکہ انہیں ایفائے عہد کی عادت پڑے اور وعدہ خلافی کو قانونِ قدرت کی خلاف ورزی سمجھیں۔
 ایفائے عہد کی تربیت بچپن میں اور گھر کے ماحول سے شروع کی جانا چاہیے۔ بچہ ماں باپ
 کی طرف احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور گفتار و کردار میں ان کی تقلید کرتا ہے۔ ماں باپ بچے
 کے لیے نمونہ عمل ہیں۔ بچے کا ذہن بہت حساس ہوتا ہے اور بہت چھوٹی چیزوں کی تصویر
 بھی اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ وہ ماں باپ کے کلام کو بہت گہری نظر سے دیکھتا
 ہے اور آئندہ کی زندگی میں اس سے استفادہ کرتا ہے۔ بچہ اپنی طبیعت اور قدرت کے باعث
 ایفائے عہد کے ضروری ہونے کو سمجھتا ہے جب ماں باپ اس سے وعدہ کرتے ہیں تو
 اسے ان سے توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے وعدہ پر عمل کریں گے۔ اگر وہ عمل کریں تو بچہ ایفائے
 عہد کا عملی درس ان سے حاصل کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنا وعدہ پورا نہ کریں تو اسے دکھ ہوتا ہے
 اور ماں باپ کو غلط کام کرنے والا سمجھتا ہے جس گھر میں ماں باپ اپنے وعدے پر عمل
 کریں آپس میں اپنے بچوں سے اور دوسرے لوگوں سے وعدہ خلافی نہ کریں اس گھر کے بچوں میں
 بھی ایفائے عہد کی عادت ہوگی جب کہ اس کے برعکس جن گھر میں ماں باپ اپنے وعدوں
 کے پابند نہ ہوں اور عہد شکنی کو بُرا نہ سمجھیں اس گھر کے بچے بھی عہد شکن ہوں گے۔ جو بچے
 ہر روز ماں باپ کی عہد شکنی کو دیکھتے ہیں ان کی نظریں ایفائے عہد کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور
 وعدے کو نقطہ چکر اور فریب دینے کا بہانہ سمجھتے ہیں۔

اگر ماں باپ خود عہد شکن ہوں اور جھوٹے وعدوں سے بچے کو فریب دیں اور
 اپنے وعدے پر عمل نہ کریں۔ یا اپنے غلط طرز عمل سے معصوم بچوں کو عہد شکن کا بھتیجہ بن جائیں اور

علاہ انہیں سمجھائیں کہ انسان اپنے مفادات کے لیے چھوٹے وعدے کر سکتا ہے اور پھر انہیں توڑ سکتا ہے جو مصوم اور سادہ بچے اپنے ماں باپ سے بیگمونی نہیں لے اور وعدہ خلافیاں دیکھتے ہیں۔ کیا ایسے بچوں سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ جھٹکا بولیں یا ان کے کچھ کرانے کے لیے اس سے وعدہ دہی کرتی ہے کہ میں تمہارے لیے مٹھائی لائوں گی یا اس کریم لے کے دوں گی یا مافی کھاؤں گی۔ پھل لے کے دوں گی جتنا تیار خریدوں گی ستنے کپڑے لائوں گی، کھلونے خریدوں گی، تمہیں دعوت پر اور سیر پر لے جاؤں گی۔ یہ وعدے بچے وہ کبھی بھرت اس لیے کرتی ہے کہ بچہ کڑی دوائی پی لے۔ اس لیے کہ بچہ ڈاکٹر کے پاس اور انجکشن لگانے والے کے پاس چلا جائے اسے خوشخبریاں دیتی ہے۔ اس سے کہتی ہے اگر تو نے فلاں کام کیا تو تجھے پیٹوں گی، مار ڈالوں گی، پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ گھر سے نکال دوں گی۔ تہہ خانے میں بند کر دوں گی۔ تم سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ پیسے نہیں دوں گی۔ چدر پر تمہارے پیسے نئے کپڑے نہیں خریدوں گی۔ تمہیں دعوت پر نہیں لے جاؤں گی تمہارے ابو سے شکایت کروں گی اور ایسی سیکنگزوں دہمکیاں۔ اگر آپ مختلف خانداؤں اور خود اپنی زندگی پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ ہر روز سادہ لوح بچوں سے کتنے وعدے کیے جاتے ہیں کہ جن میں سے اکثر پر عمل نہیں ہوتا۔ کیا ماں باپ جانتے ہیں کہ ان وعدہ خلافیوں کی بچوں کی حساس روح پر کتنی بڑی تاثیر ہوتی ہے اور اس طریقے سے وہ ان کے بارے میں کتنی بڑی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بچہ ماں باپ سے جو ناپسندیدہ عمل دیکھتا یا سنتا ہے وہ اس سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کے اثرات آخر عمر تک نہیں جاتے۔

نادان ماں باپ کہ جو وعدہ خلافی کرتے ہیں ایک تو وعدہ خلافی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دوسرا وہ ان وعدہ خلافیوں سے اور بھوٹ سے بچے کی بھی تربیت کرتے ہیں کہ جن کا گناہ مسئلہ طور پر عہد شکنی سے بھی بڑا ہے۔

اس وجہ سے اس ماں باپ سے کہتا ہے کہ آپ جو وعدہ اپنے بچوں سے کریں اسے حتمًا ایفا کریں۔

پہنبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :
 بچوں سے پیار کریں، ان سے مہربانی سے پیش آئیں اور اگر ان سے کوئی
 وعدہ کریں تو اسے حتماً پورا کریں۔ بچے یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ ان کو معذرت
 دیتے ہیں۔ اے
 حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،
 جب آپ بچوں سے کوئی وعدہ کریں تو اسے حتماً پورا کریں۔

ملکیت

مال سے محبت انسان کی طبیعت کا حصہ ہے۔ جن چیزوں کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے انہیں اپنی ملکیت بناتا ہے۔ اور اپنے تئیں اس کا مالک سمجھتا ہے۔ دوسروں سے بھی وہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی ملکیت کا احترام کریں اور اس کے مزاحم نہ ہوں۔ ملکیت کی خواہش انسان کی فطرت میں اس طرح سے موجود ہے کہ اسے کاٹا ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جدھر سے بھی اس کا مقابلہ کیا جائے وہ کسی اور صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔ ملکیت اگرچہ ایک امر اعتباری ہے لیکن ایسا امر اعتباری کہ جس نے حقیقت کی صورت اختیار کر رکھی ہے اور انسان کی فطرت میں جاگزیں ہو چکا ہے اور اس کے بغیر انسانی زندگی کا نظام چلنا ممکن نہیں ہے۔ جب سے بچہ اپنے آپ کو پہچاننے لگتا ہے اور اپنی اختیارات کو سمجھنے لگتا ہے تو اس کا اشیاء سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا احساس اس کے وجود میں پیدا ہو جاتا ہے۔

بچے کو جو چیز زمین پر پڑی مل جائے یا کسی کے ہاتھ سے لے لے دے یا اسے اپنے آپ سے منقص سمجھتا ہے۔ اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے اور آسانی سے تیار نہیں ہوتا کہ کسی کو دے دے۔ وہ اپنے جوتے، لباس اور کھلونوں کا اپنے آپ کو مالک سمجھتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ ان میں تصرف کرے اور اگر کوئی اجازت کے بغیر انہیں استعمال کرے تو اسے غاصب اور متجاوز سمجھتا ہے اور اس کے خلاف قیام کرتا ہے اور لڑتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ بچے اپنے کھلونوں سے یہاں تک کہ نہایت غمیدہ ہوں سی چیزوں سے کتنی محبت کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کے لیے لڑتے

جھگڑتے ہیں اور یہ ان کا حق ہے کیوں کہ وہ مالک ہیں اور اپنے حق کا دفاع کرتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے حق کے حصول کے لیے قیام کرے تو اسے شریر اور غلط نہیں سمجھنا چاہیے۔ احساس ملکیت کوئی غلط چیز نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے لیے فطری ہے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کے اس فطری احساس کو قبول کر لیں اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔

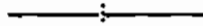
ایسا بہت ہوتا ہے کہ بچے ایک دوسرے کی ملکیت میں تجاوز کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کی چیزوں اور کھلونوں میں تصرف کریں یا انہیں غصب کر لیں ماں باپ کو چاہیے کہ ایسے کاموں کی بچوں کو اجازت نہ دیں۔ کیوں کہ جن میں زیادہ طاقت ہوگی انہیں دوسروں کے حقوق اسی طرح غصب کرنے کی عادت پڑ جائے گی۔ اور چھوٹے غلام بن جائیں گے اور ان کے دل اسی پر طول ہوں گے۔ اگر ماں باپ ایسے امور میں غلام کی حمایت نہ کریں تو وہ شریکیت جرم ہوں گے اور جو بچہ غلام ہو گا وہ ان کے بارے میں بدگمان ہو جائے گا۔ اگر وہ ایسے مسئلے پر چپ رہیں تو اپنے سکوت سے بھی وہ زیادتی کرنے والے کے عمل کی تائید کریں گے اور اسے تقویت دیں گے۔ اور اس طرح سے وہ بچوں کو تجاوز پر سکوت اور سختی کا دفاع نہ کرنا سکھائیں گے۔ اور یہ بھی ایک بہت بڑا جرم ہے۔ ماں باپ کو ایسے امور میں دخل ہونا چاہیے۔ زیادتی کرنے والے بچے کی زیادتی کو روکنا چاہیے اور اسے اجازت نہیں دینا چاہیے کہ وہ طاقت سے کسی دوسرے بچے کے کھلونے چھین لے۔ لیکن یہ کام ماں باپ اور گالی گلوچ کے ذریعے نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ شروع میں اچھے انداز سے اور مشفقانہ طریقے سے اسے سکھائیں کہ یہ چیز تمہاری بہن کی ہے یا تمہارے بھائی کی ہے۔ اور تمہیں ان میں تصرف کا حق نہیں پہنچتا۔ بعد ازاں پوری قاطعیت سے کہیں کہ ہم اجازت نہیں دے سکتے کہ تم اپنی بہن یا بھائی کی چیزوں پر زبردستی قبضہ جالو۔ اور اگر یہ طریقہ بھی مؤثر نہ ہو تو کچھ سختی اور ڈانٹ کر اسے روکیں اور جس بچے کے ساتھ زیادتی ہوتی ہو اس کی حمایت کریں یہ صحیح ہے کہ احساس ملکیت کا احترام کیا جانا چاہیے اور جائز حدود میں اس کی حمایت کی جانا چاہیے لیکن اسے بالکل آزاد اور غیر مشروط نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ انسان کی نفسانی خواہشات ہمیشہ بڑھتی رہتی ہیں اور کسی معین حد پر جا کر ٹھہرتی نہیں۔ اگر ان پر کنٹرول نہ کیا جائے تو انسان کی تباہی اور ملکیت کا سبب بن جاتی ہیں۔

اصول ملکیت انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ ہر ملکیت کے حصول کے لیے کام اور محنت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اور حسبِ مال جائز حدود میں نہ قطع غیب نہیں ہے بلکہ انسان کے لیے ایک فطری امر شمار ہوتا ہے لیکن اگر بالکل آزادی دے دی جائے تو پھر یہ مال پرستی کی صورت اختیار کرے گی۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ ہر مال و دولت پر مکے جاتے ہیں۔ غیب کی ضرورت کے شب و روز دیوانہ وادہ اس کے لیے لگے رہتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ملکیت کے حصول کی دولت کے لیے اپنا آرام و راحت عزت و آبرو، دین و اکرام اور احترام و شرافت سب کچھ فدا کر دیتے ہیں ایسے لوگوں کو عقل مند انسان نہیں سمجھا جاسکتا۔ مال پرستی بھی ایک طرح کی کاجون ہے وہ لوگ کہ جنہیں ضرورت ہوتی ہے نہ خود کھاتے ہیں نہ دوسروں کو دیتے ہیں۔ فقط اور فقط جمع کیے جاتے ہیں اور ڈھیر لگائے جاتے ہیں ایسے لوگوں کو عقل اور خردمند نہیں سمجھا جاسکتا۔

ہذا ماں باپ بچے کے احساس ملکیت کے احترام کے ساتھ ساتھ اس کی زیادہ طلب کی خواہش کو بھی روکیں۔ اس کے کھلونے ضرورت کے مطابق ہونا چاہئیں۔ زیادہ نہیں۔ بس اتنے کہ ان سے وہ کھیل سکے اور کوئی کام سیکھ سکے۔ نہ اتنے کے بس جمع کر رکھے اور دوسرے بچوں کے مقابلے میں فخر کرتا رہے۔ اگر اس کے پاس اتنے کھلونے ہوں کہ اسے ان کی ضرورت نہ ہو اور انہیں اس نے بس جمع کر کے رکھ چھوڑا ہو تو مہتر یہ ہے کہ ماں باپ اسے شوق و لالچ کو وہ دوسرے بچوں کو دے دے جنہیں ان کی ضرورت ہے اسے بڑے پیار محبت سے کہیں! یہ کھلونے تمہارے ہیں تمہیں ان کی ضرورت نہیں جب کہ دوسرے بچوں کے پاس کھلونے نہیں ہیں اور ان کو ضرورت بھی ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ تم ان کا ذوق کر رکھو اور دوسروں کو نہ دو۔ جن کھلونوں کی تمہیں ضرورت نہیں ہے وہ دوسرے ضرورت مند بچوں کو دے دو۔ وہ خوش ہوں گے خدا بھی خوش ہوگا اور ماں باپ بھی۔ بچوں کہ حافظ ذہن ہوتا ہے اور فطری طور پر خیر خواہ ہوتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ماں باپ کی خوشنودی حاصل کرے وہ ان کی بات سنتا ہے اور یوں اس کے اندر جو دوعطا کی ایک پسندیدہ عادت پیدا ہو جائے گی۔ اس صورت میں جب کہ بچے کو کھلونے کی ضرورت نہیں

اور دوسرا بھی کوئی بچہ ان کھلونوں سے کھیلنا چاہتا ہے تو بہتر ہے کہ ماں باپ بچے کو نرمی اور پیار سے تشوین کریں کہ وہ کچھ دیر کے لیے کھلونے دوسرے بچے کو دے دے تاکہ وہ ان سے کھیل سکے۔ اس طرح سے اس میں تعاون اور ایثار کا جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ باہمی تعاون کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے ایسے کھلونے بچوں کو خرید کر دیے جاسکتے ہیں کہ جن سے مشترکہ طور پر کھیلا جائے۔ اور انہیں شوق دلانا چاہیے کہ مل جل کر کھیلیں۔ اور مل جل کر فائدہ اٹھائیں۔

مختصر یہ کہ ماں باپ کو چاہیے تربیت کرتے ہوئے تمام مراحل میں بچوں کے لیے حد اعتدال کو ملحوظ رکھیں احساس ملکیت کے اصول کی حمایت کریں اور خواہیوں کو روکیں، کوشش کریں کہ اس احساس کو کنٹرول کریں اور صحیح راستے پر ڈالیں۔ اور اس امر پر غور رکھیں کہ کہیں وہ مال و دولت کے اندھے عاشق اور زبردست نہ بن جائیں۔



سخاوت

جو دو سٹل ایک اچھی اور پسندیدہ صفت ہے ایک سخی انسان مال و دولت جمع کرنے میں محنت کرتا ہے لیکن مال سے دل بستگی نہیں رکھتا۔ وہ دولت چاہتا ہے لیکن خرچ کرنے کے لیے دوسروں کو دینے کے لیے۔ وہ مال کو ذخیرہ اندوزی کے لیے جمع نہیں کرتا۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ اچھی زندگی گزارتا ہے اور فلاحی کاموں میں شرکت بھی کرتا ہے۔ وہ محروم اور بے نوالو لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے مال سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کچھ سخی شخص مال کو جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کے لیے اکٹھا کرتا ہے، خرچ کرنے کے لیے نہیں اس سے نہ وہ خود فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ اس کا خاندان۔ نہ ہی دل اسے راہ خیر میں خرچ کرنے کو چاہتا ہے۔ ایسا ذخیرہ اندوز شخص ایک ایسا ملازم ہے جو بغیر خواہش کے مال و ثناء کے لیے اکٹھا کرتا ہے۔

اسلام نے بخل کی مذمت اور سخاوت کی تعریف کی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :
 سخاوت ایمان کا حصہ ہے اور ایمان بہشت میں لے جاتا ہے۔
 نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :
 سخاوت ایک ایسا شجر بہشت ہے کہ جس کی شاخیں زمین تک پہنچی ہوئی ہیں۔

جس نے بھی ان میں سے کوئی ایک شان پڑی وہ اسے جنت تک لے جائے گی۔

پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:
بہشت اہل سخاوت کا گھر ہے۔
پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں:

اللہ جو آدم اور سخی ہے اور وہ سخاوت کو پسند کرتا ہے۔
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”بخیل وہ درخت ہے کہ جو آتش دوزخ میں اگتا ہے۔ اور کنجوس لوگ دوزخ میں جائیں گے۔“
پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں:

”مومن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ بخیل اور بزدل ہو۔“

جو خوشش دلوں اور محبتوں کو انسان کی طرف جذب کر لیتے ہیں، لوگ ایک سخی شخص کو پسند کرتے ہیں اس کا احترام کرتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ جو خوشش سے دلوں کو تسخیر کیا جاسکتا ہے اور ان پر حکومت کی جاسکتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

سخی شخص اللہ کے بندوں اور بہشت کے نزدیک ہے اور آتش دوزخ سے دور ہے۔ اور بخیل انسان خدا سے دور ہے۔

۱۔ جامع السعادات، ج ۱، ص ۱۱۳

۲۔ جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۴

۳۔ جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۳

۴۔ جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۰

۵۔ جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۱

بہشت سے دور ہے، لیکن آگ سے نزدیک ہے۔
 بنیخ شخص اپنے اعمال سے واجب حقوق ادا نہیں کرتا اور اس وجہ سے بھی وہ عذاب
 اخروی کا حقدار ہوگا سخاوت انسان کی دنیا و آخرت کو آباد کرتی ہے اور نخل انسان کی دنیا و
 آخرت کو تباہ کر دیتا ہے جو دو سخا کی بنیاد دیگر تمام اچھی صفات کی طرح سے فطری ہے لیکن اسے
 پروان چڑھانا بہت حد تک ماں باپ کے اختیار میں ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر بچہ ایک خاص
 مزاج رکھتا ہے۔ بعض مزاج جو دو عطا کے لیے زیادہ تیار ہوتے ہیں اور بعض نخل اور کنجوسی کے
 لیے زیادہ تیار ہوتے ہیں۔ لیکن بہر حال ماں باپ کی تربیت بلا شک بہت اہم اثرات مرتب کرتی
 ہے۔ ماں باپ اگر باتدبیر اور دانا ہوں تو وہ نخل کے اسباب و عوامل کو روک سکتے ہیں اور
 بچوں کی طبیعت میں جو دو سخا کی پرورش کر سکتے ہیں۔

جو چیز ان میں سے زیادہ اثر رکھتی ہے وہ ماں باپ کا کردار ہے ماں باپ بچے کے لیے
 نمونہ عمل اور سرمشق ہیں۔ اگر ماں باپ سخی ہوں ان خود خرچ کرنے والے ہوں اور نیک کاموں
 میں شرکت کرنے والے ہوں تو ان کے بچے بھی ماں باپ کا کردار دیکھیں گے امدان کی تعلیم
 کریں گے۔ اور رفتہ رفتہ ان کے اندر بھی اس کی عادت پڑ جائے گی اس کے برعکس اگر
 والدین بنیخ اور کنجوس ہوں تو ان کے بچے بھی زیادہ تر انہیں کا غورہ اپنائیں گے اور کنجوسی کے
 عادی بن جائیں گے۔ اخلاق کو پروان چڑھانے میں عادت بہت کردار ادا کرتی ہے۔
 حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

»اپنے نفس کو خشش کا عادی بناؤ اور ہر خلق میں سے بہتر کا انتخاب کر دو کیونکہ
 خوبی عادت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔«

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

»سخاوت اچھی عادتوں میں سے ہے۔«

۱۔ ہیجۃ البیضاء، ج ۲، ص ۲۳۸

۲۔ بحار، ج ۷، ص ۲۱۳

۳۔ غرر الحکم، ص ۱۷

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا۔

”السان کی گنگاری کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لیے کچھ
خرچ نہ کرے اور اُسے محروم رکھے“

ماں باپ بچے میں سخاوت اور بخشش کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے مندرجہ
ذیل طریقوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ بچوں سے کہیں کہ جو چیزیں ان کی ہیں ان میں سے کچھ ماں باپ کو یا بہن بھائی کو دے
دیں اور جب ایسا کریں تو ان کی تعریف و ستائش کریں۔ اور ان کا شکریہ ادا کریں
تاکہ آہستہ آہستہ انہیں سخاوت کی عادت پڑ جائے۔ البتہ اس امر کی طرف توجہ رکھیں
کہ ممکن ہے شروع شروع میں یہ عمل بچوں کے لیے مشکل ہو۔ لہذا یہ عمل کبھی کبھی اور
کم مقدار میں ہونا چاہیے۔ اور اس میں زبردستی بھی نہ کی جائے کہیں اُلٹ نتیجہ ہی نہ نکل
اُسے اور بچے سرکشی ہی نہ کرنے لگیں۔

۲۔ کبھی کبھی بچوں سے کہیں کہ وہ اجازت دیں کہ ان کے کھلونوں سے دوسرے بچے
کھیلیں۔ اسی طرح انہیں نصیحت کریں کہ ان کے پاس جو کھانے کی چیزیں ہیں وہ اپنے
دوستوں اور ہم جو لیول کو دیں اور اس امر پر اُن کو شاباش بھی دیں۔

۳۔ کبھی کبھی انہیں نصیحت کریں کہ وہ اپنے جیب خرچ میں سے کچھ غریب لوگوں کو دیں۔
یا کسی کار خیر میں صرف کریں۔ اور اگر یہ کام ایک دائمی شکل اختیار کرے تو اس کا اثر
بہتر ہوگا۔

۴۔ اپنے بچوں سے کہیں کہ وہ اپنے دوستوں کی گھر پر دعوت کریں اور پھر ان کی خاطر
تواضع کریں۔

۵۔ آپ ہر روز کچھ پیسے بچے کو دے سکتے ہیں کہ وہ کسی غریب کو دے یا کار خیر میں
صرف کرے۔

۶۔ غریب لوگوں کی مشکلات اور ان کی زندگی کی دشواریوں کو بچوں سے بیان کریں ممکن ہو تو انہیں اپنے ہمراہ ہسپتال، تیم خانوں اور غریب مسکین لوگوں کے گھروں میں لے جائیں اور ان کی موجودگی میں ضرورت مندوں کی مدد کریں۔

اس طریقے سے آپ بچوں کے احساسات کو تحریک کر سکتے ہیں اور ان کی طبیعت میں سخاوت کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں تاکہ آہستہ آہستہ وہ قوی ہو جائے اور ایک عادت اور اخلاق کی شکل اختیار کرے البتہ ہم اس بات کے مدعی نہیں ہیں کہ اس طرح کے کام سب بچوں پر سو فیصد کامیاب اثر ڈالیں گے اور سب کے اندر جو درخوا کا جذبہ پیدا کر دیں گے۔ آپ کو بھی ادش امید نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ ہر شخص کی ایک خاص استعداد ہوتی ہے اور خصوصی مزاج ہوتا ہے کہ شاید بسے انہوں نے ماں باپ سے یا بزرگوں سے ورثے میں پایا ہو۔ لیکن یہ دعویٰ یقیناً کیا جاسکتا ہے کہ بچوں کے لیے ماں باپ کی تربیت اور کوشش بے اثر نہیں رہے گی۔ اور کچھ نہ کچھ ان پر ضرور اثر کرے گی۔ کال نتیجہ نہ بھی نکلے تو بھی بے نتیجہ تو نہیں رہے گی۔

ایک خاتون اپنے ایک خط میں لکھتی ہے،

..... ایک پر فضا مقام پر ہمارا ایک بارغ تھا اس میں مختلف قسم کے پھل تھے امی ابو اور ہماری دادی اماں کچھ پھل حاجت مندوں کو بھیجتی تھیں۔ جو خدمت گزار ہوتے ان پر ان کی خصوصی عنایت ہوتی تھی۔ اور یہ کام وہ میرے ذریعے سے انجام دیا کرتی تھیں، چھ سات سال کی عمر سے مجھے اس کام کی عادت پڑ گئی، گاؤں میں دو توبینا خاندان تھے۔ میرا دل ان کی حالت پر بہت اڑھتا تھا۔ ہر روز جب میں ان کے گھر جاتی ان کا ہاتھ پکڑتی، کمرے سے انہیں صحن میں لے آتی اور پھر صحن سے انہیں کمرے میں لے جاتی اور چپٹے سے ان کے ترن بھر کر ان کے کمرے میں رکھ دیتی وہ میرے لیے دھا کرتے جب میں لے یہ بات اپنی اتی ابو کو بتاتی وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ میرے ابو نے یہ شعر پڑھا۔

شکر خدای کن کہ موفق شدی بہ خیر

زانعام و فضل خود نہ معطل گذاشت

میری انی نے کہا جو نامیٹا ہو جائے وہ واقعا ہی مستحق ہے۔
 وہ ہمیشہ اچھے کاموں میں مجھے تشویق کرتے۔ میں اپنا جیب خرچ جمع کرتی اور
 فقرا کو دے دیتی آہستہ آہستہ اس کام کی مجھے عادت ہو گئی۔ اس وقت میں سماجی
 خدمت کے ایک ادارے میں کام کرتی ہوں اور چودہ خاندانوں کی سرپرستی کر
 رہی ہوں۔

میرے طرز عمل نے میرے بچے پر بھی اچھا اثر کیا ہے ایک دن کہنے لگا کہ
 ہر روز مجھے کچھ پیسے دیا کریں میں نے کہا کیا کرو گے؟ اور کتنے پیسے کہنے لگا!
 ہر روز دو روپے۔ میں چاہتا ہوں جمع کروں۔ ہر روز میں اُسے دو روپے دے دیتی ہوں۔
 اور کتنی دھیان رکھنا فصول خرچ نہ کرنا۔ چند دنوں بعد وہ اپنا گھٹے آیا اس میں
 اڑتالیس روپے تھے۔ کہنے لگا اتنی مجھے اجازت دیں یہ پیسے میں فلاں نامیٹا کو
 دے آؤں وہ ہمارے سکول کے لاستے میں رہتا ہے مجھے بے حد خوشی ہوئی
 اور میں نے بے اختیار اس کو چوم لیا۔

نیک کاموں میں تعاون

بعض کام خصوصاً اہم اور بڑے کام اکیلا شخص نہیں کر سکتا۔ البتہ دوسروں کے تعاون اور ہمکاری سے اہم اور بڑے بڑے کام انجام دیے جاسکتے ہیں۔ اگر انسان اکیلا اور تنہا ہی کام کرنا چاہے تو بہت سے اہم اور نہایت مفید کام کرنے سے محروم رہ جائے گا اور وہ کام پڑے نہ جائیں گے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص تنہا ہی سماجی جلدی کا کوئی ادارہ بنا سکے مثلاً ہسپتال، شفا خانہ، سکول، مسجد، یتیم خانہ، لائبریری اور تربیت گاہ وغیرہ۔ بلکہ بیشتر اوقات اکیلا شخص کسی ایسے ادارے کا نظام بھی نہیں چلا سکتا۔ البتہ دوسروں کے تعاون اور مدد سے ایسے اور زیادہ اہم کام انجام دیے جاسکتے ہیں۔ کسی قوم میں امداد باہمی اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ جتنا قوی ہو گا اتنا ہی ان کا اجتماعی امور کا نظام بہتر چل سکے گا۔

اس اعتبار سے دین اسلام ایک کامل اجتماعی نظام ہے کہ جو لوگوں کو باہمی طور پر دوسرے سے تعاون کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

”تعاونوا علی البر والیتقی ولا تعاونوا علی الاثم والعدون“

”ایک دوسرے سے جلدی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تعاون کریں اور گناہ اور سرکشی کے کاموں میں تعاون نہ کریں“۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

”حق کے قیام کے لیے تعاون کرنا امانت اور دیانت ہے۔“

تعاون اور ہمسکاری کا جذبہ بچپن سے ہی پیدا ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے انسان فطری طور پر معاشرتی مزاج رکھتا ہے۔ لیکن اس سے صحیح طریقے سے استفادہ کرنا چاہیے جو ماں باپ اپنے بچوں کی تربیت کے خواہش مند ہیں وہ مختلف طریقوں سے بچوں کے اندر سے یہاں تک کہ مناسب کھیلوں سے تعاون اور ہمسکاری کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں اور ان کی توجہ امور خیر کی طرف جذب کر سکتے ہیں اور اس خداداد فطرت کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ مثلاً بچوں کے لیے مناسب کھلونے خرید کر ان کو باہم مل جل کر ایک ہسپتال یا سکول یا مل بنانے کی دعوت دیں۔ بچوں کے لیے وہ ایک مشترک گلا بنا سکتے ہیں اور ان سے کہہ سکتے ہیں کہ اپنے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے لگے میں ڈالیں۔ کچھ عرصے بعد نکالیں اور ماں باپ کی نگرانی میں امور خیر میں صرف کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ پیسوں سے چھل یا سٹائی خریدیں اور ماں باپ سے مل کر یا تنہا بیادوں کی عیادت کے لیے جائیں۔ وہ غریب لوگوں کی مدد بھی کر سکتے ہیں۔ ماں باپ انہیں کچھ پیسے دے سکتے ہیں تاکہ وہ طے شدہ طریقے سے یا کبھی کبھی کسی امور خیر کے ادارے کو دیں یا کسی عمومی کتاب خانے کے لیے کتاب خریدیں۔ بچوں کو یہ تجویز بھی دی جاسکتی ہے کہ وہ خود سے ایک کمیٹی بنائیں اور اس کی میٹنگ کریں اور کسی اچھے کام کے لیے کوشش کریں۔ اور اس سلسلے میں ان کی مدد کی جاسکتی ہے۔

اگر ماں باپ سماجی خدمت کے کسی ادارے میں شرکت کرتے ہوں تو اپنے بچوں کو بھی ان میں شریک کر سکتے ہیں اور کچھ رقم ان کے حوالے کر سکتے ہیں کہ وہ خود سے اس ادارے کو دیں اور اس کے باقاعدہ نمبر بن جائیں۔

لے غزل حکم می ۴۴

انسان دوستی اور نیچے

سب لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ سب کا مال باپ ایک ہے اور دراصل ہر انسان ایک خاندان کا فرد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہے اور انہیں پسند کرتا ہے۔ ہر کسی کو رعزی دیتا ہے ان کی ضروریات کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور پھر انہیں ان کے اختیار میں دیا ہے۔ عقل اور طاقت دی ہے تاکہ اللہ کی نعمت سے استفادہ کریں۔ اللہ نے ان کی روح کو کمال تک پہنچانے اور ان کی اخروی سعادت کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے ان کی ہدایت کا سامان بھی فراہم کیا ہے ان کی ہدایت و راہنمائی کے لیے انبیاء کو بھیجا ہے۔ اماموں اور دینی رہبروں کو مامور کیا ہے تاکہ وہ انسانوں کی سعادت اور انہیں کمال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور سب کی بھائی اور سعادت کا آرزو مند ہے۔ اس نے سب انسانوں سے چاہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد، مہربان، خیر خواہ ہوں اور ایک دوسرے کے لیے سود مند بنیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کریں اور ایک دوسرے کی ضروریات پوری کریں۔ مشکلوں اور مصیبتوں میں ایک دوسرے کی فریاد کو پہنچیں۔ انسانوں کے خدمت گزار بنیں اور سب کے فائدے کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ انسان کے خدمت گزار اور خیر خواہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں اور بلند مرتبے کے حامل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے بہت زیادہ جزا مقرر کی گئی ہے۔ دین اسلام کہ جو ایک مقدس اجتماعی نظام ہے اس نے اس بارے میں توجہ دی ہے اور ان امور کو سب کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

”سب بندے اللہ کا رزق کھاتے ہیں۔ پس انسانوں میں سے اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو انسانوں کو فائدہ پہنچائے یا کسی خاندان کو خوش کرے“
امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

”مخلافہ ناما ہے کہ لوگ میرا رزق کھاتے ہیں اور بندوں میں سے میرے نزدیک محبوب ترین وہ ہے کہ جو میرے بندوں کے لیے زیادہ ہمدرد ہو اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرے“ ۱۷
رسول خدا سے پوچھا گیا:

کہ لوگوں میں سے اللہ کے نزدیک محبوب ترین کون ہے، آپ نے فرمایا:
وہ کہ جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ رساں ہو ۱۸
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

دین کے بعد سب سے اہم دانائی لوگوں سے محبت اور نیکی ہے ہر کسی سے
اگرچہ وہ اچھا ہو یا برا ہو ۱۹
پیغمبر اسلام نے فرمایا:

”مَنْ أَصْبَحَ وَكَفَّ يَتَمَرَّ بِأُمُورِ الْمُسْلِمِينَ فَلَيْسَ بِمُسْلِمٍ“
جو مسلمانوں کے امور کے اصلاح کی فکر میں نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے ۲۰
حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا:

۱۷ بحار ج ۲، ص ۳۱۷

۱۸ بحار ج ۲، ص ۳۳۷

۱۹ بحار ج ۲، ص ۳۲۹

۲۰ بحار ج ۲، ص ۳۹۲

۲۱ بحار ج ۲، ص ۳۳۷

اللہ کے خاص بندے وہ ہیں کہ لوگ اپنی ضروریات کے وقت ان کی پناہ میں آئیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قیامت میں اللہ کی امان میں ہوں گے۔
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”جو شخص کسی مسلمان کی فریاد سنا اور اس کا جواب نہ دے وہ مسلمان نہیں ہے۔“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور وہ مہربان لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔“
 پیغمبر اکرم اور ائمہ اطہار سے ایسی سینکڑوں احادیث مروی ہیں کہ بوجدیش کی کتب میں موجود ہیں۔

شارع مقدس اسلام نے ایک وسیع نظر سے پورے انسانی معاشرے کو اور بالخصوص اہل ایمان کے معاشرے کو ایک اکائی کے طور پر جانا ہے اور اپنے پیروکاروں سے خواہش کی ہے کہ وہ سب کی بھلائی اور سعادت کی کوشش کریں اور سب کے خیر خواہ بنیں۔ اسلام جو فیصلہ ایک معاشرتی دین ہے اور وہ افراد کی بھلائی کو معاشرے کی بھلائی سمجھتا ہے اور وہ ہر طرح کی خود غرضی کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ ایک مسلمان اور دیندار شخص خود غرض نہیں ہو سکتا اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کے مفادات کو نظر انداز کر دے۔

انسان دوستی ایک بہت ممتاز انسانی صفت ہے اور یہ انسان کے مزاج میں داخل ہے البتہ تربیت کے ذریعے سے اسے کمال تک پہنچایا جاسکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ختم بھی ہو جائے۔ یہ عادت بھی تمام پسندیدہ انسانی صفات کے اند ہے کہ جس کی بنیاد یحییٰ ہی میں رکھی جانا چاہیے۔ ماں باپ کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو انسان دوست مہربان اور خیر خواہ

۱۔ بحار، ج ۴، ص ۲۱۸

۲۔ بحار، ج ۴، ص ۲۲۹

۳۔ بحار، ج ۴، ص ۲۹۲

بنائیں۔ اگر ماں باپ غمگین ہوں اور خیر خواہ ہوں اور خیر خواہی کے آثار ان کی گفتار و کردار میں نظر آئیں تو وہ اپنے بچوں کو بھی مہربان اور انسان دوست بنا سکتے ہیں۔

فرض شناس اور آگاہ ماں باپ کبھی کبھی اپنے بچوں کے سامنے ان کی حالت بیان کر سکتے ہیں جو محتاج ہوں، غریب ہوں، ناتواں ہوں اور ممکن ہو تو ایسے لوگوں سے انہیں ملوا بھی سکتے ہیں اور بچوں سے کہہ سکتے ہیں یہ سب انسان ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔ ان کے حقوق پامال کیے گئے ہیں یہ محروم و بے نوا ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کا دفاع کریں اور ان کے پامال شدہ حقوق انہیں واپس دلوائیں اور اب وقتی طور پر جو کچھ ہمارے بس میں ہے ان کی مدد کریں۔ وہ بچوں کی موجودگی میں بلکہ خود بچوں کے ذریعے سے ایسے افراد کی مدد کریں۔ ماں باپ کبھی کبھی ظالموں کے ظلم اور مظلوموں کی ظلم ناک حالت بچوں سے بیان کریں نیز ایک مسلمان انسان کی اس بارے میں ذمہ داری بھی انہیں بتائیں۔ وہ بچوں کو ہسپتالوں اور شفا خانوں میں بھی لے جاسکتے ہیں اور محتاج بیماروں کو انہیں دکھا سکتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اسلامی ذمہ داریاں انہیں بیان کر سکتے ہیں اور اپنی طاقت کے مطابق ان کی مدد بھی کر سکتے ہیں۔ ننھے یتیم بچے کہ جن کے سر پر کوئی نہ ہو کی حالت بھی وہ بچوں کے سامنے بیان کر سکتے ہیں اور ممکن ہو تو ان سے ملوا بھی سکتے ہیں۔ اور بچوں کو بتا سکتے ہیں کہ ان کی حمایت اور مدد کس قدر ضروری ہے۔



عدل و مساوات

چند افراد پر مشتمل خاندانی ایک پھوٹے سے ملک کی طرح ہے اور مال باپ اس پھوٹے سے ملک کو چلاتے ہیں۔ جیسے ایک ملک کا اچھا نظام عدل و مساوات کے بغیر ممکن نہیں ایک گھر کے نظام کے لیے بھی عدل و مساوات ضروری ہے۔ صاف دلی اور خلوص، محبت و الفت، اعتماد و حسن ظن، آرام و راحت عدل و مساوات کے ماحول میں ہی میسر آ سکتی ہے۔ ایسے ہی ماحول میں جیسے بچے پرورش پا سکتے ہیں اور ان کی داخل صلاحیتیں نکھر سکتی ہیں اور وہ مال باپ سے علیٰ طور پر عدل و مساوات کا درس لے سکتے ہیں۔ جیسے بڑے عدل و انصاف کے اقیانوس مند ہیں ایسے ہی بچے بھی عدل و مساوات کے پیالے ہیں۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :
ایک پیالے انسان کے لیے جیسے ٹھنڈا اور اچھا پانی بہت اچھا لگتا ہے
اس سے کہیں زیادہ لوگوں کے لیے عدل و انصاف کا ذائقہ شیریں تر اور عمدہ تر ہوتا ہے۔ کاموں کو چلانے کے لیے اگرچہ کوئی چھڑا سا کام ہی کیوں نہ ہو عدل سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے؛ لہ
امام صادق علیہ السلام نے فرمایا :

تین طرح کے لوگ قیامت میں خدا کے قریب ترین ہوں گے !

اول۔ وہ کہ جو غصے کے عالم میں اپنے ناختموں پر ستم نہ کرے۔
دوم۔ کہ جو دوا افراد میں صلح کے لیے ان کے پاس آئے جائے لیکن حق کی ذرا بھر
خلاف ورزی نہ کرے۔

سوم حق کہے اگرچہ خود اس کے اپنے نقصان میں ہو یہاں
اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے :

”إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ“

”اللہ عدل اور نیکی کا حکم دیتا ہے“

عادل اور منصف ماں باپ سب بچوں سے ایک جیسا سلوک کرتے ہیں۔ اور کسی کو
دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے، بیٹی ہو یا بیٹا، خوبصورت ہو یا بدشکل، بڑا ہو یا چھوٹا۔ باصلاحیت ہو
یا کم استعداد، جسمانی طور پر سالم ہو یا غیر سالم سب کو اپنی اولاد سمجھتے ہیں اور ان کے درمیان تفاوت
کے قائل نہیں ہوتے، مہربانی، اظہارِ محبت، پیار، احترام، کھانے پینے لباس، حبیب خراج، مگر
میں کاموں کی تقسیم اور زندگی کے باقی تمام امور میں بچوں کو برابر سمجھتے ہیں اور سب سے ایک طرح
کا سلوک کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

”عدم موجودگی میں بھی اپنی اولاد میں عدل کو ملحوظ رکھیں۔ مگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری
اولاد تم سے احسان، محبت اور عدالت کے ساتھ پیش آئے تو وہ بھی تم سے
اسی بات کی توقع رکھتے ہیں“

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ جو اپنے ایک بچے سے پیار
کر رہا تھا اور دوسرے سے نہیں تو لاپٹ نے اُس سے فرمایا :

لے بخار، ج ۷، ص ۳۳

لے سورہ نحل، آیہ ۹۰

لے مکارم الاخلاق، ج ۱، ص ۲۵۲

تم عدل و مساوات کا خیال کیوں نہیں رکھتے بلکہ
ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ اس کا بیٹا وہاں پر لگا گیا۔
اس شخص نے اپنے بیٹے کو پھونک کر اپنے زانو پر بٹھالیا۔ قنوطی دیر کے بعد اس کی بیٹی آئی تو اس
شخص نے بچی کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا:
تم نے اپنی اولاد کے درمیان عدالت اور برابری کا لحاظ کیوں نہیں رکھا۔
حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

عدالت و مساوات کی پائنداری بہترین سیاست ہے۔
ایک عورت اپنے دو پھرنے بچوں کے ہمراہ زوجہ رسول حضرت عائشہ کے پاس آئی۔
حضرت عائشہ نے اس عورت کو تین کھجوریں دیں۔ ان بچوں کی ماں نے ہر بچے کو ایک ایک
کھجور دے دی پھر تیسری کھجور کے بھی دو حصے کر کے آدھی آدھی دونوں کو دے دی۔ جب
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے انہیں واقعہ سنایا۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کیا تجھے اس عورت کے عمل پر حیرت ہوئی ہے؟ اللہ عدالت و مساوات کا
خیال رکھنے کی بنا پر اس عورت کو جنت میں داخل کرے گا۔
اگر ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ عادلانہ تہاؤ کے بجائے امتیازی طرز عمل کا مظاہرہ
کریں اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں تو ان بچوں پر اخلاقی لحاظ سے ناقابل تلافی بُرے اثرات
پڑیں گے۔ مثلاً:

۱۔ گھر کے اساتذہ میں بچے علی طور پر ماں باپ سے ناانصافی کا سبق سیکھیں گے اور

۱۔ مکارم الاخلاق، ج ۱، ص ۲۵۲

۲۔ مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۱۵۶

۳۔ غرر الحکم، ص ۶۳

۴۔ سنن ابن ماجہ، ج ۲، ص ۱۲۱

رفتہ رفتہ اس کے عادی ہو جائیں گے۔

۲۔ جن بچوں سے نا انصافی کی گئی ہو ماں باپ کے بارے میں ان کے دل میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے وہ کسی رد عمل کا مظاہرہ کریں اور نا فرمانی و سرکشی پورا کریں۔
۳۔ غیر عادلانہ سلوک سے بن بھائیوں کے درمیان حسد اور دشمنی پیدا ہو جائے گی اور وہ ہمیشہ رٹنے بھڑکتے رہیں گے۔ ممکن ہے وہ کسی سخت رد عمل کا اظہار کریں اور کسی مسئلے پر شرارت اور زیادتی کے مرتکب ہوں۔

۴۔ وہ بچے جن سے نا انصافی کی گئی ہے، احساس محرومی و مظلومی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بات اُن کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ ممکن ہے یہی بات اُن کی پریشانی، اضطراب، الجھن، اعصاب کی کمزوری اور متعدد نفسیاتی بیماریوں کا باعث بن جائے۔
ان تمام قباحتوں کے ذمہ دار وہ ماں باپ ہیں جنہوں نے عدل و مساوات کے لازمی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فرق روار کھا ہو۔

البتہ ماں باپ اپنی تمام اولاد کے ساتھ ایک جیسا سلوک نہیں کر سکتے۔ مختلف عمر میں بچوں کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ مختلف ادوار اور مختلف جنس ہونے کے اعتبار سے بھی ان کی ضروریات ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ عدل و مساوات کا قانون بھی ایسے مواقع پر ایک جیسے سلوک کا تقاضا نہیں کرتا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بڑے بچے کو گود میں لیا جائے اور اُس سے دودھ پیتے بچے کی طرح پیار کیا جائے؟ اسی طرح کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تین سالہ بچے کو اتنا ہی پیچ خرچ دیا جائے جتنا اٹھارہ سالہ بچے کو دیا جاتا ہے؟ کیا بیٹی بھی بیٹے کی طرح آزادی سے آنے جانے اور ملنے جلنے کا حق رکھتی ہے؟ عدالت و مساوات بھی اس بات کا تقاضا نہیں کرتی اور ہم بھی اس بات کا منورہ نہیں دیتے۔

بہر حال ماں باپ کو چاہیے کہ وہ پوری طرح سے عقل و تدبیر کے ساتھ ایسے سلوک کا انتخاب کریں کہ جس سے اُن کے بچے نا انصافی کا احساس نہ کریں یہ بات حسد کی بحث میں بیان کی گئی ہے اس حصے کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

ایک صاحب اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں :

... بچپن کی یہ یاد تو بہت ہی تلخ ہے کہ جسے میں فراموش نہیں کر سکتا۔ ابو میرے اور بھائی کے درمیان فرق روار کھتے تھے اس کی پوری خواہشوں پر عمل کرتے اور میری طرف اعتنا نہ کرتے۔ اس کا احترام کرتے اور میری توہین کرتے۔ اسے مجھ سے زیادہ پیار کرتے اور اس پر نوازشیں کرتے نتیجہ یہ ہوا کہ ابو اور بھائی مجھے بہت بُرے لگنے لگے۔ میرا دل چاہتا کہ اس غیر انسانی سلوک پر ابو سے بدلہ لوں لیکن یہ کام میرے بس میں نہ تھا۔ پریشانی کے مارے ہر وقت میں تنہا تنہا رہتا۔ جہاں خانے میں چلا جاتا۔ دیواروں میں کہیں تھوکتا اور انہیں خراب کر کے رہتا۔ شیٹے توڑ دیتا۔ اور کیا کرتا؟ کچھ اور کر نہیں سکتا تھا۔ لیکن ابو کو اس بات کا خیال بھی نہ تھا اور انہیں ہرگز پتہ نہ تھا کہ میں یہ نقصان ان کو پہنچا رہا ہوں۔ ایک خاتون اپنی ڈائری میں لکھتی ہیں :

..... ہمارے قریبی عزیزوں میں سے ایک خاتون کی دوستیاں تھیں۔ ایک زیادہ لائق تھی اور دوسری کچھ کم۔ دونوں سکول جاتیں۔ بڑی بیٹی جو زیادہ باصلاحیت نہ تھی کم نمبر لاتی اور چھوٹی زیادہ نمبر لاتی۔ ماں جس کے پاس بھی بیٹھتی چھوٹی کی تعریف کرتی رہتی اور بڑی کو برا بھلا کہتی۔ چھوٹی کو زیادہ نوازتی، شاباشیں کہتی اور بڑی سے کہتی تمہارے مہر میں خاک اکیا فضول بھی ہو۔ پیسے حرام کرتی ہو اور سبق یاد نہیں کرتی ہو۔ کھانا کھانے اور لباس بدلنے کا نہیں کیا فائدہ۔ بد بخت، سست آخر کیا ہوگی،

وہی بڑی بیٹی اب شادی شدہ ہے۔ اس کے چند بچے ہیں۔ وہ ایک معمول کی خاتون نہیں ہے۔ بیماری لگتی ہے۔ احساس کمتری کا شکار ہے۔ چُپ چُپ اور ڈری ڈری رہتی ہے۔ کسی دعوت میں ہو تو کونے میں جا بیٹھتی ہے اور بات نہیں کرتی۔ جب میں اس سے کہتی ہوں کہ تم بھی کچھ کہو۔ تو آہ بھرتی ہے کہ کہتی ہے کیا کہوں اس کی شادی سے پہلے کی بات ہے کہ میں ایک مرتبہ اسے اعصاب کے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔

ڈاکٹر نے مخاطبہ اور اس سے گفتگو کے بعد کہا! یہ صاحبہ مریض نہیں ہے بلکہ اس کے ماں باپ مریض ہیں جنہوں نے اس بے گناہ بیٹی کو ان دنوں تک پیچھا رہا ہے۔

ایک دن ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا کہ کھانا پکا لیتی ہو وہ روئے لگی اور اس نے کہا پکا لیتی ہوں لیکن جب بھی کھانا پکاتی ہوں تو آئی ابو پر واہ نہیں کرتے! کہتے ہیں! ماشاء اللہ اس کی بہن خوب کھانا پکاتی ہے۔

بچوں کا احترام

بچہ بھی ایک انسان ہوتا ہے اور ہر انسان کو اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے اس کی قدر جانیں اور اس کا احترام کریں۔ دوسرے جب اس کا احترام کرتے ہیں تو وہ اسے اپنی بڑائی سمجھتا ہے اور اسے ایک طرح کی قدر دانی سمجھتا ہے۔ جن ماں باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہے انہیں چاہیے کہ ہیشاں کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان کے وجود کو اہمیت دیں۔ بچے کی تربیت میں اس کا احترام اہم عوامل میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ جس بچے کو عزت و احترام میسر ہو وہ بزرگوار، شریف اور باوقار بنتا ہے۔ اور اپنے مقام کی حفاظت کے لیے بُرے کاموں سے بچتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اچھے اچھے کام کر کے دوسروں کی نظریں اپنے مقام کو اور بھی بڑھائے تاکہ اس کی دباؤ سے زیادہ عزت کی جائے۔ جس بچے کا ماں باپ احترام کرتے ہوں وہ اپنے عمل میں ان کی تقلید کرتا ہے اور ماں باپ کا اور دوسرے لوگوں کا احترام کرتا ہے۔ بچہ ایک چھوٹا سا انسان ہے اسے اپنی شخصیت سے پوری محبت ہے۔ توہین اور تحقیر سے آزرده خاطر ہو جاتا ہے۔ ماں باپ جس بچے کی توہین و تحقیر کرتے ہوں اس کے دل میں اُن کے بارے میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور جلد یا بدیر وہ سرکش اور نافرمان بن جاتا ہے اور ان سے انتقام لیتا ہے۔ نادان ماں باپ کہ بدستی سے جن کی تعداد کم نہیں سمجھتے ہیں کہ بچوں کا احترام ان کی تربیت کے منافی ہے۔ ماں باپ کے شایان شان نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے بچے کا احترام کیا تو وہ بگڑ جائے گا۔ اور پھر ہمارا احترام نہیں کرے گا۔ وہ بچوں سے بے اعتنائی

اور ان کی بے احترامی کو ان کی تربیت کا ذریعہ شمار کرتے ہیں اس طرح وہ ان کی شخصیت کو کچل دیتے ہیں اور ان کے دل میں احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ جب کہ یہ روش تربیت کے حوالے سے بہت بڑا اشتباہ ہے اگر ماں باپ بچے کا احترام کریں تو اس سے نہ صرف یہ کہ ان کا مقام بچے کی نظر میں کم نہ ہوگا بلکہ اس طرح سے اُس کے اندر بھی بزرگواری اور وقار کی روح پروان چڑھے گی۔ بچہ اسی بچپن سے سمجھنے لگتا ہے کہ ماں باپ اسے ایک انسان سمجھتے ہیں اور اس کی اہمیت کے قائل ہیں۔ اس طرح سے جو کام معاشرے میں اچھے نہیں سمجھے جاتے وہ ان سے بچتا ہے۔ وہ اچھے کام کرتا ہے تاکہ اپنے مقام کو محفوظ رکھے یہ بات باعث افسوس ہے کہ ہمارے معاشرے میں بچوں کا جس طرح سے احترام ہونا چاہیے نہیں کیا جاتا اور انہیں خاندان کا ایک باقاعدہ بزرگ شمار نہیں کیا جاتا۔ یہاں تک کہ دعوتوں میں بچے ماں باپ کے طفیل ہوتے ہیں انہیں باقاعدہ دعوت نہیں دی جاتی۔ اور انہیں کسی سخی جگہ پر یا کمرے کے دروازے کے ساتھ جگہ ملتی ہے اور ان کے لیے باقاعدہ پلیٹ، چمچ وغیرہ پیش نہیں کیا جاتا۔ اتنے وقت اور جانے وقت کوئی ان کا احترام نہیں کرتا۔ گاڑی میں ان کے لیے مخصوص نشست نہیں ہوتی۔ یا تو وہ کھڑے ہوں یا ماں باپ کی گود میں بیٹھے ہوں۔ محفل میں انہیں بات کرنے کا حق نہیں ہوتا اگر وہ بات کریں بھی تو کوئی ان کی سنتا نہیں انہیں بے احترامی سے بلایا جاتا ہے۔ میل ملاقات اور بات چیت میں ان سے مؤدبانہ سلوک نہیں کیا جاتا۔ ان کے لیے سلام، خوش آمدید، خلا حفظ اور شکریہ نہیں ہوتا۔ ان کی خواہش کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا گھر میں ان سے مشورہ نہیں لیا جاتا۔ گھٹیا اور توہین آمیز کام کرنے کے لیے ان سے کہا جاتا ہے۔

دین مقدس اسلام نے بچوں کی طرف پوری توجہ دی ہے اس نے بچوں کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اپنی اولاد کی عزت کرو اور ان کی اچھی تربیت کرو تاکہ اللہ تمہیں بخش دے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

سب سے گھٹیا انسان وہ ہے جو دوسروں کی توہین کرے۔
 رسول اللہؐ ہمیشہ اور ہر جگہ بچوں سے محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ جب وہ
 سفر سے واپس آتے تو بچے ان کے استقبال کے لیے دوڑتے۔ رسول اللہؐ ان سے پیار
 کرتے، محبت کرتے اور ان میں سے بعض کو اپنے ساتھ سوار کر لیتے اور اپنے اصحاب سے
 بھی وہ کہتے کہ دوسروں کو وہ سوار کریں۔ اور اس حال میں شہر کے اندر لوٹتے۔

بچوں سے یہاں تک شیر خوار بچوں کی توہین سے بھی سختی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ام الفضل
 کہتی ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسین علیہ السلام کو جب کہ وہ شیر خوار تھے مجھ سے
 لے لیا۔ اور بیدنے لگا لیا۔ حسین علیہ السلام نے رسولؐ کے کپڑوں پر پیٹ کر دیامیں نے حسینؑ
 کو رسول اللہؐ سے زبردستی لے لیا۔ اس طرح سے کہ وہ رونے لگے! رسول اللہؐ نے مجھ
 سے فرمایا ام الفضل! آرام سے اس پیٹ کو پانی پاک کر دے گا لیکن حسین علیہ السلام کے
 دل سے ناراضی اور نالاہتی کون دور کرے گا؟

ایک صاحب لکھتے ہیں،

اں باپ کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہ تھی۔ نہ صرف وہ میرا احترام نہ کرتے
 تھے بلکہ اکثر میری توہین اور سرزنش کرتے رہتے کاموں میں مجھے شریک نہ
 کرتے اور اگر میں کوئی کام انجام دیتا تو اس میں سے کچھ لے نکالتے۔ دوستوں
 کے سامنے یہاں تک کہ میرے دوستوں کے سامنے میری بے عزتی کر
 دیتے۔ مجھے دوسروں کے سامنے بولنے کی اجازت نہ دیتے۔ اس وجہ
 سے ہمیشہ میرے دل میں اپنے بارے میں احساس ذلت و حقارت رہتا۔
 میں اپنے تئیں ایک فضول اور اضافی چیز سمجھتا۔ اب جب کہ میں بڑا ہو گیا ہوں

۱۔ مجلد ۱، ص ۱۰۲، ص ۲۵

۲۔ غرالحکم، ص ۱۸۹

۳۔ ہدیۃ الاحباب، ص ۱۶۶

اب بھی میری وہی کیفیت باقی ہے۔ بڑے کام سامنے آجائیں تو میں اپنے آپ کو کمزور سمجھنے لگتا ہوں کاموں کی انجام دہی میں فیصلہ نہیں کرتا۔ میں اپنے تئیں کہتا ہوں میری رائے چونکہ درست نہیں ہے اس لیے دوسروں کو میرے بارے میں اظہار رائے کرنا چاہیے۔ اپنے تئیں حقیر و ناچیز سمجھتا ہوں مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے یہاں تک کہ دوستوں کی موجودگی میں مجھ میں بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور اگر کچھ کہہ بیٹھوں تو کئی گھنٹے سوچتا رہتا ہوں کہ کیا میری بات درست تھی اور صحیح موقع پر تھی۔

خود شناسی اور بامقصد زندگی

حیوان کی ساری زندگی کھانے، سونے، خواہشات نفس کی تکمیل اور اولاد پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ حیوان کی عقل اور آگاہی کالی نہیں ہوتی وہ اچھائی اور بُرائی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس پر کوئی فرض اور ذمہ داری نہیں ہے اس کے لیے کوئی حساب و کتاب اور ثواب و عذاب نہیں ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی عاقبت نہ پروگرام اور مقصد نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کہ جو اثرات المخلوقات ہے وہ حیوان کی طرح نہیں ہے۔ انسان عقل، شعور اور آگاہی رکھتا ہے۔ اچھے، بُرے، خوبصورت اور بدصورت میں تمیز کر سکتا ہے۔ انسان کو ایک دائمی اور جاوید زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ نابودی اور فنا کے لیے۔ اس اعتبار سے اس کے سر پر ذمہ داری بھی ہے اور فرض بھی۔ انسان خلیفۃ اللہ ہے اور امین الہی ہے۔ انسان کی زندگی کا حاصل فقط کھانا، سونا، خواہشات کی تکمیل اور نسل بڑھانا ہی نہیں ہو سکتا انسان کو ایسے راستے پر چلنا چاہیے کہ وہ فرشتوں سے بالاتر ہو جائے۔ وہ انسان ہے اسے چاہیے کہ اپنی انسانیت کو پروان پر اٹھائے اور اس کی تکمیل کرے انسان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے البتہ ایک بلند ہمت نہ کہ پست حیوانی ہمت۔ انسان رضائے خدا کے لیے اور مخلوق خدا کی خدمت کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتا ہے نہ کہ زودگذر دنیاوی مفادات کے حصول کے لیے۔ انسان متناشی حق اور پیرو حق ہے۔

اے انسان! وجود ایسا گوہر گراں بہا ہے کہ جو حیوانات سے بہت متاثر ہے یہ امر بہت افسوس ناک ہے کہ بہت سے انسانوں نے اپنی اس انمول انسانی قیمت کو گنوا دیا ہے۔

اور اپنی قیمتی زندگی کو ایک حیوان کی طرح سے گزار رہے ہیں اور ان کی نظر میں حیوانوں کی طرح سے کھانے، پینے، سونے اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کے علاوہ کوئی ہدف نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان سو سال زندہ رہے لیکن اپنی انسانی قیمت کو نہ پہچان سکے اور اپنے بارے میں جاہل ہی مر جائے۔ دنیا میں ایک حیوان کی صورت آئے اور ایک حیوان کی صورت چل بسے! بے مقصد اور سرگرداں رہے اور اس کی ساری جدوجہد کا نتیجہ بدبختی کے علاوہ کچھ نہ نکلتے۔

انسان کو جاننا چاہیے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کہاں جانا ہے؟ اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کی کس راستے پر چلنا چاہیے۔ اور اس کے لیے حقیقی کمال اور سادت کیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

بہترین معرفت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچان لے اور سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ اپنے آپ کو نہ پہچانے لے
امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں،

جس نے اپنے آپ کو نہ پہچانا وہ راہ نجات سے دور اور جہالت و گمراہی کے راستے پر رہا لے

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

خدا کے نزدیک انسانوں میں سے ناپسندیدہ ترین شخص وہ ہے کہ جس کا زندگی میں مقصد شکم سیری اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کے علاوہ کچھ نہ ہو لے
حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،

۱۔ عزرا حکم، ص ۱۷۹

۲۔ عزرا حکم، ص ۷۷

۳۔ عزرا حکم، ص ۲۰۵

”جس نے اخروی سعادت کو اپنا مقصد بنالیا وہ بلند ترین خوبیوں کو پائے گا۔“

ماں باپ کو چاہیے خود شناسی اور با مقصدیت کا درس بچے کو دیں، وہ تدریجاً اپنی اولاد کی تعمیر کر سکتے ہیں اور انہیں بہ مقصد اور خود شناس بنا سکتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی اولاد کو انسانیت کا بلند مقصد سمجھا سکتے ہیں اور ان کے سامنے زندگی کا مقصد واضح کر سکتے ہیں۔ بچے کو ماں باپ کے ذریعے رفتہ رفتہ سمجھنا چاہیے وہ کون ہے؟ کیا تھا؟ کہاں سے آیا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ آخر کار اسے کہاں جانا ہے۔ اس دنیا میں اس کی ذمہ داری اور فریضہ کیا ہے۔ اور اسے کس پروگرام اور ہدف کے تحت زندگی گزارنا چاہیے اس کی خوش نصیبی اللہ بد نصیبی کس میں ہے۔ اگر ماں باپ خود شناس ہوں اور ان کی اپنی زندگی با مقصد ہو اور وہ اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوں تو وہ خود شناس اور با مقصد انسان پروان چڑھا سکتے ہیں۔

گھر کی آمدنی اور خرچ

کسی گھر کے انتظامی امور میں سے اہم ترین اُس کا معاشی پہلو ہے اور گھر کی آمدن اور خرچ کا حساب ہے اور باجمہر خاندان آمد و خرچ کے حساب کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور آمدنی کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ ہر خاندان کو جاننا چاہیے کہ پیسہ کس راستے پر خرچ کرے سمجھا خاندان قرض سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پریشانیوں میں گرفتار نہیں ہوتا اور زندگی آرام سے اور دوسرے کے بغیر گزارتے ہیں۔ ان کے اقتصادی حالات خراب بھی ہوں تو تندرست رہیں بہتر بناتے ہیں۔ اور زندگی کو مفرد بے سروسامانی سے نکال لیتے ہیں۔

اس کے برعکس جس خاندان کا معاشی اعتبار سے، اور آمدن و خرچ کے اعتبار سے نظام درست نہ ہو اور اس کے افراد بغیر کسی حساب کے خرچ کرتے ہوں تو ایسا خاندان عموماً دوسروں کا مقروض اور مرہون رہتا ہے، اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ایسا خاندان ناچار سودی قرض لیتا ہے۔ یا قرض پر مہنگی چیزیں خریدتا ہے۔ یعنی دوسروں کے لیے زحمت اٹھاتا ہے۔ ایسے خاندان کی زندگی زیادہ تر خوش نہیں گذرتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کی ابتدائی ضروریات سے محروم رہے اور ان کی زندگی کی حالت مناسب نہ ہو اگرچہ اس کی آمدنی اچھی ہی کیوں نہ ہو لیکن چونکہ ان کے گھر میں کوئی عقل و تدبیر نہیں ہوتی اور ایسے گھر کے لوگ ہوس اور بلند پروازی کا شکار ہوتے ہیں لہذا زیادہ تر گرفتار بلا ہی رہتے ہیں۔ کسی خاندان کی خوش حالی اور آسائش صرف مکا کر لانے پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس سے بھی اہم عقل و تدبیر اور کسی منظم معاشی پروگرام کے مطابق اس کو خرچ کرنا ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”جب اللہ کسی خاندان کے لیے بھلائی اور سعادت چاہتا ہے تو انہیں زندگی میں تدبیر اور سلیقہ عطا کر دیتا ہے“ لے

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”تمام کمالات تین چیزوں میں جمع ہیں

ان میں سے ایک زندگی میں فہم و تدبیر (سے) اور معاشی امور میں عقل دے

کام لینا ہے لے

حضرت صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

”فضول خرچی غربت و ناداری کا باعث بنتی ہے اور زندگی میں اعتدال اور

میان روی بے نیازی اور استغناء کا باعث بنتے ہیں“ لے

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اعتدال سے آدھی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں لے

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

فضول خرچ کی تین نشانیاں ہیں۔

۱۔ جو چیز اس کے پاس نہیں ہوتی وہ کھاتا ہے،

۲۔ جس چیز کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے وہ خریدتا ہے اور

۳۔ جس لباس کی قیمت ادا نہیں کر سکتا اسے پہنتا ہے لے

لے کافی، ج ۵، ص ۸۸

لے کافی، ج ۵، ص ۸۷

لے وسائل، ج ۱۲، ص ۱۴

لے مستدرک، ج ۲، ص ۲۲۲

لے وسائل، ج ۲۱، ص ۱۴

گھر کے مالی امور کو منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے میاں بیوی کے درمیان ہم آہنگی پائی جائے اگر میاں یا بیوی گھر کی آمدنی کو مد نظر رکھیں اور بغیر کسی حساب کتاب کے خرچ کریں تو ان کے گھر کا کام نہیں چل سکتا۔

دوسرے درجے پر بچوں میں بھی باہمی تعاون اور ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر کے بچے بھی اگر آمدنی کو پیش نظر رکھیں اور بغیر کسی حساب کتاب کے خرچ کریں تو بھی خاندان مشکلات اور مصائب کا شکار ہو جائے گا۔

ماں باپ کو چاہیے کہ مالی امور میں اپنے بچوں کے ساتھ ہم فکری پیدا کریں اور انہیں گھر کی آمدنی اور خرچ سے آگاہ کریں۔ بچوں کو تدریجاً یہ بات سمجھنا چاہیے کہ پیسے آسانی اور ایسے ہی ہاتھ نہیں آجاتے بلکہ اس کے لیے محنت صرف ہوتی ہے۔ انہیں جاننا چاہیے کہ باپ زحمت اٹھاتا ہے اور ہر روز کام پر جاتا ہے تاکہ پیسے کم کر لائے اور گھر کے اخراجات پورے کرے۔ اور اگر ماں بھی کہیں کام یا ملازمت کرتی ہو تو یہ بات بھی بچوں کو سمجھنا چاہیے اور اگر ماں خانہ دہانہ ہو تو بچوں کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ گھر کا نظام آسانی سے نہیں چلتا بلکہ اس کی ماں شب و روز محنت کرتی ہے۔

چاہیے کہ بچے آہستہ آہستہ ماں باپ کے کام اور گھر کی آمدنی کی مقدار کو جانیں انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ماں باپ کی آمدنی ہی سے گھر کے سارے اخراجات پورے ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نہیں اور انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ گھر کے تمام اخراجات کو ان پیسوں کے اندر پورا ہونا چاہیے اور سارے اخراجات ایک ہی سطح کے نہیں ہوتے بلکہ بعض اخراجات کو ترجیح دینا پڑتی ہے مثلاً مکان کا خرچ یا مکان کا کرایہ، پانی اور بجلی کا بل، روٹی اور کپڑے کے پیسے، گھر میں روزمرہ کی ضروریات کا سامان اور ڈاکٹر کی فیس دیگر ضروریات پر مقدم ہیں۔ پہلے مرحلے میں زندگی کی ضروریات پوری کرنا چاہئیں باقی چیزیں بعد میں آتی ہیں۔ باقی چیزیں بھی ایک سطح کی نہیں ہوتیں بچوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے اور ماں باپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

بچوں کو ابتدائی زندگی ہی سے اس امر کا عادی بنایا جانا چاہیے کہ ان کی خواہشات

اور تو قہات کو گھر کی آمدنی سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ انہیں بے جا خواہشات اور بڑھ چڑھ کر خرچ کرنے سے بچنا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو گھر کا ایک باقاعدہ فرد سمجھیں اور گھر کا خرچ چلنے میں اپنے آپ کو شریک سمجھیں۔ وہ یہ نہ سمجھنے لگ جائیں کہ ہم کوئی بلند مرتبہ لوگ ہیں اور ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ ہمارے خرچے پر سے کریں۔ بچوں کو صرف اپنی خواہشات کو پیش نظر رکھ کر گھر کی باقی ضروریات کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ بچے کو داخلی عمر ہی سے اپنی خواہشات سے چغلم پٹنی کر کے گھر کی ضروریات کو ترجیح دینے کی عادت پڑنی چاہیے۔

انہیں بچوں نے آئندہ بڑے ہو کر نظام چلانا ہے۔ لہذا انہیں ابھی سے فضول خرچ نہیں ہونا چاہیے گھر کی مالی حالت خوب اچھی ہی کیوں نہ ہو پھر بھی ماں باپ کو نہیں چاہیے کہ وہ بچوں کو اجازت دیں کہ وہ بے حد و حساب خرچ کرتے رہیں۔ انہیں چاہیے کہ بچوں کو سمجھائیں کہ سب لوگ ایک خاندان کے فرد ہیں اور امیروں کو چاہیے کہ غریبوں کی مدد کریں اور اگر کوئی کم آمدنی والا خاندان ہے اور مشکل سے روزانہ کے اخراجات پر سے ہوتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اپنی روزانہ کی آمدن کے مطابق اخراجات کریں۔ البتہ انہیں نہیں چاہیے کہ اپنی مشکلات کی شکایت اپنے بچوں سے کریں بلکہ انہیں صبر و استقامت کا درس دیں اور انہیں آئندہ زندگی کو بہتر کرنے کے لیے آمادہ کریں۔ جب بچے میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو اسے کام کرنے پر ابھاریں بچے سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر تم بھی کام کرو گے تو اس سے آمدنی ہوگی اور پھر ہمارے گھر کے حالات بھی بہتر ہو جائیں گے۔ بچے کو یہ عادت ڈالیں کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ گھر میں دے دے کیونکہ وہ اسی خاندان کے ساتھ مل کر رہتا ہے بچے میں مفت خوری کی عادت نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ بچوں کا حیب خرچ بھی گھر کی آمدنی کے مطابق ہونا چاہیے۔



قانون کا احترام

لوگ قانون کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے۔ معاشرے کے نظام کو چلانے کے لیے برائیوں کو روکنے کے لیے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے اور عوام کے آرام و آسائش کے لیے قانون ضروری ہے جن ملکوں میں قانون بنانے والے افراد اور عوام کے اچھے باہمی ربط ہو تے ہیں اور جہاں لوگوں کے لیے قانون بنائے گئے ہیں وہاں لوگ قانون کا احترام بھی کرتے ہیں اور قانون کے احترام سے ہی ملک میں امن و امان اور عوام کی زندگی کے لیے آرام و راحت وجود میں آتا ہے۔

لیکن جن ملکوں میں قانون بنانے والے لوگ حکومتوں کے مفادات کے لیے قانون بناتے ہیں اور عوام کے حقیقی مفادات ان کی نظر میں نہیں ہوتے وہاں عوام کی نظر میں قانون کا کوئی احترام بھی نہیں ہوتا اور ملک بھی امن اور چین سے محروم رہتا ہے۔ بد قسمتی سے پہلے ہمارے ملک کی بھی یہی حالت تھی۔ بیشتر قوانین اسلامی اور عوامی نہ تھے بلکہ حکومتوں کی خواہش پر اور مغرب و مشرق کی سامراجی طاقتوں اور ان کے چیلوں کے فائدے میں قانون بنتے تھے۔ مزدور، محنت کش اور محروم افراد کے حقیقی مفادات کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ رعب و دبدبہ سے اور کرد و فریب سے عوام دشمن قوانین ہی کو عوام پر نافذ کریں۔ لیکن ایران کے مسلمان عوام چونکہ ان قوانین کو اسلامی اور اپنے مفادات کا محافظ نہیں سمجھتے تھے۔ لہذا ان کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ البتہ ان قوانین میں کچھ عوامی فائدے کے قوانین بھی موجود تھے لیکن چونکہ عوام کا ان پر اعتماد نہیں تھا لہذا ان کا احترام بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ حائر

صحیح اور سودمند قانون کا احترام ضروری ہے اور ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ یہ بات اپنی اولاد کو سمجھائیں۔ جب بچہ اپنے ماں باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ سڑک پار کرتے ہوئے سڑک پار کرنے کی معینہ جگہ (زیر سیرا سنگ) ہی سے سڑک پار کرتے ہیں تو اس میں بھی اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور پھر وہ اس کی خلاف ورزی کو اچھا نہیں سمجھتا۔

خصوصاً ماں باپ کو چاہیے کہ بچوں کو سمجھائیں سڑک کو استعمال کرنا ڈرائیوروں کا حق ہے اور زیر سیرا سنگ پیدل چلنے والوں کا حق ہے اور دوسرے کے حق پہ تجاوز درست نہیں ہے۔ جب بچہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ قانون پر عمل درآمد خود اس کے اور معاشرے کے فائدے میں ہے تو پھر تدریجاً ماں باپ کے عمل کو دیکھتے ہوئے اس کے اندر بھی اس بات کی عادت پڑ جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :
 ”عادت فطرت ثانیہ ہے“ لہ

ادب

ہر ماں باپ کی یہ جتنی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے مہذب ہوں اچھے اور باادب بچے ہر ماں باپ کی سر بلندی کا خلیعہ ہوتے ہیں اور وہ ان پر فخر کرتے ہیں۔ جو بچے دوسروں سے ملاقات کے موقع پر سلام کرتے ہیں اور جلد ہونے پر خدا حافظ کرتے ہیں۔ مصافحہ کرتے ہیں۔ حال پوچھتے ہیں، پیار سے انداز سے بات کرتے ہیں، بزرگوں کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے آنے پر احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صاحبان علم، باتقویٰ اور نیک افراد کا احترام کرتے ہیں۔ محفل میں مؤدب رہتے ہیں شور نہیں کرتے اور اگر کوئی کچھ دے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کسی کو گالی نہیں دیتے، دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچاتے، دوسروں کی بات نہیں کاٹتے، کھانے کے آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ بسم اللہ کہتے ہیں۔ چھوٹے نواسے لیتے ہیں، آہستہ آہستہ چباتے ہیں، اپنے سامنے سے کھاتے ہیں، زیادہ نہیں کھاتے، کھانا زمین پر نہیں پھینکتے۔ اپنے ہاتھوں اور لباس کو خراب نہیں کرتے، صاف ستھرے اور پاکیزہ رہتے ہیں کسی کی توہین نہیں کرتے۔ دوسروں کا لحاظ کرتے ہیں اور صحیح طریقے سے بیٹھتے اور اٹھتے ہیں، صبح انداز سے چلتے ہیں۔ اطاعت شعار اور فرماں بردار ہوتے ہیں۔ کسی کا تمسخر نہیں اڑاتے۔ اور دوسروں کی بات کان لگا کر سنتے ہیں ایسے بچے باادب ہوتے ہیں۔

صرف والدین بلکہ سب لوگ باادب بچوں سے پیار کرتے ہیں اور گستاخ اور بے ادب بچوں سے نفرت۔

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ادب انسان کا کمال ہے“ ۱۷

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ادب انسان کے لیے خوبصورت لباس کے مانند ہے“ ۱۸

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”لوگوں کو اچھے آداب کی سونے اور چاندی سے زیادہ ضرورت ہے“ ۱۹

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”ادب سے بڑھ کے کوئی زینت نہیں“ ۲۰

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”باپ کی بہترین وراثت اپنے بچے کے لیے یہ ہے کہ اُسے اچھے آداب

کی تربیت دے“ ۲۱

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”بے ادب شخص میں بُرائیاں زیادہ ہوں گی“ ۲۲

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

”سات سال تک اپنے بچے کو کھیلنے کی اجازت دو اور سات سال سے

آداب زندگی سکھاؤ“ ۲۳

۱۷ غرالحکم، ص ۲۴

۱۸ غرالحکم، ص ۲۱

۱۹ غرالحکم، ص ۲۴۲

۲۰ غرالحکم، ص ۸۳۰

۲۱ غرالحکم، ص ۲۹۳

۲۲ غرالحکم، ص ۶۲۴

۲۳ بحار، ج ۱۰، ص ۹۵

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں،

”بچے کے والدین پر تین حق ہیں،

۱۔ اس کے لیے اچھا نام منتخب کریں،

۲۔ اسے باادب بنائیں اور

۳۔ اس کے لیے اچھا شریک حیات انتخاب کریں۔“

ہر ماں باپ کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ ان کی اولاد باادب ہو لیکن یہ اگر خود بخود بخود اور بغیر کوشش کے پوری نہیں ہو سکتی اور نہ ہی زیادہ وعظ و نصیحت سے بچوں کو مؤدب بنایا جاسکتا ہے۔ اس مفقود تک پہنچنے کے لیے بہترین راستہ ان کے لیے اچھا نمونہ عمل مہیا کرنا ہے۔ ماں باپ کو خود مؤدب ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنی اولاد کو عملی سبق دے سکیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”بہترین ادب یہ ہے کہ اپنے آپ سے آغاز کرو۔“

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

”اپنے آپ سے تعلیم کا آغاز کرنا چاہیے اور پھر دوسروں کو تعلیم دیں۔ پہلے

اپنے کردار کو مؤدب بنائیں پھر دوسروں کو وعظ و نصیحت کریں۔“

بچہ تو بڑا متفرد ہوتا ہے تقلید کی فطرت اس کے اندر بہت اہم اور طاقتور ہوتی ہے۔

بچہ ماں باپ اور دوسرے لوگوں کے گفتار و کردار کی پیروی کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ

تلقین بھی تربیتی عوامل میں سے ایک ہے۔ لیکن تقلید انسانی جبلت میں زیادہ قوی اور طاقت

ور ہوتی ہے خصوصاً بچپن میں جن ماں باپ کی خواہش ہے کہ ان کے بچے مؤدب ہوں

انہیں چاہیے کہ پہلے اپنے طرز عمل کی اصلاح کریں وہ باادب ماں باپ بنیں۔ انہیں چاہیے کہ

۱۔ وسائل، ج ۱۵، ص ۱۲۳

۲۔ غزالی، ص ۱۹۱

۳۔ بیچ البالغہ، ج ۲، ص ۱۶۶

ایک دوسرے سے، اپنے بچوں سے اور تمام لوگوں سے مودبانہ طرز عمل اختیار کریں۔ اور ادب زندگی کی پابندی کریں تاکہ بچے ان سے سبق حاصل کریں ان سے درس حیات حاصل کریں۔ اگر ماں باپ آپس میں ایک دوسرے سے باادب ہوں، گھر میں آداب و اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوں، بچوں سے بھی باادب رہتے ہوں لوگوں سے مودبانہ طریقہ سے میل ملاقات کرتے ہوں ایسے گھر کے بچے فطری طور پر مودب ہوں گے۔ وہ ماں باپ کا طرز عمل دیکھیں گے اور اسے اپنے لیے نمونہ عمل بنائیں گے اور اس کے لیے ان کو وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

جو ماں باپ خود آداب کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ انہیں بچوں سے بھی ادب کی توقع نہیں کرنی چاہیے اگرچہ سیکڑوں مرتبہ انہیں نصیحت کریں۔ جو ماں باپ ایک دوسرے کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں اور خود اپنے بچوں کے ساتھ بھی غیر مودبانہ سلوک کرتے ہیں وہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ان کے بچے باادب ہوں۔

ایسے گھر کے بچے زیادہ تر ماں باپ کی طرح یا ان سے بھی زیادہ بے ادب ہوں گے اور انہیں اچھی تعلیم اور وعظ و نصیحت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بچے بھی سوچتے ہیں کہ اگر ماں باپ کی بات صحیح ہوتی تو وہ خود عمل نہ کرتے لہذا یہ ہیں دھوکا دے رہے ہیں۔

البتہ تعلیم بالکل بے اثر نہیں ہوتی لیکن اس کا پورا اثر اس وقت ہوتا ہے کہ جب بچے اس کا نمونہ عمل دیکھیں۔ باادب ماں باپ بچوں کو اچھے آداب کی نصیحت بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اچھے انداز سے۔ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے، تندی، بدتمیزی اور بے ادبی سے نہیں۔ بعض ماں باپ کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ بچوں کا کوئی خلاف ادب کام دیکھتے ہیں تو دوسروں کی موجودگی میں ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں اور بڑا بھلا کہتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں اے ادب! تو نے سلام کیوں نہیں کیا؟ خدا حافظ کیوں نہیں کہا؟ گونگے ہو! احمق اور بے شعور بچے تو نے دوسروں کے سامنے پاؤں کیوں پھیلائے؟ کسی کے ہاں آکر شور کیوں مچا رہے ہو! حیوان کہیں کے دوسروں کی باتوں میں بوٹتے کیوں ہوں۔

یہ نادان ماں باپ اپنے تئیں اس طرح سے اپنے بچوں کی تربیت کر رہے

ہو سکتے ہیں جب کہ بے ادبی سے ادب نہیں سکھایا جاسکتا۔ اگر بچے سے کوئی بے ادبی سرزد ہو جائے تو اسے نصیحت کرنی چاہیے۔ لیکن بے ادبی سے نہیں۔ نہ دوسروں کے سامنے بلکہ تنہائی میں اور جھلے انداز سے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں کو سلام کرتے تھے اور فرماتے تھے:

”میں بچوں کو سلام کرتا ہوں تاکہ سلام کرنا ان کا معمول بن جائے“ اے

پجوری چکاری

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے بچہ دوسروں کے مال کی طرف ہاتھ بڑھتا ہے کھانا، پھل یا کسی اور بچے کے کھلونے زبردستی لے لیتا ہے۔ باپ کی حیب سے یا ماں کے پرس سے پجوری پھسے پیسے نکال لیتا ہے۔ ماں نے کھانے کے لیے چیزیں چھپا کے رکھی ہوتی ہیں اس میں ہاتھ داتا ہے۔ دکان سے چکلے سے چیز اٹھا لیتا ہے۔ بہن یا بھائی یا ہم جماعت کی پنسل، پین، ربڑ یا کاپی اٹھا لیتا ہے۔ اکثر بچے بچپن میں اس طرح کے کبابزادہ کام کرتے ہیں۔ شاید ایسا شخص کوئی کم ہی ملے کہ جسے بچپن کے دنوں میں اس طرح کے واقعات ہرگز پیش نہ آئے ہوں بعض ماں باپ اس طرح کے واقعات دیکھ کر بہت ناراضت ہوتے ہیں اور بچے کے تارکیک مستقبل کے بارے میں اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ وہ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان کا بچہ آئندہ ایک قاتل یا چور بن جائے گا اس وجہ سے وہ اپنے آپ میں کڑھتے رہتے ہیں۔ سب سے پہلے ان ماں باپ کو اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہیے کہ زیادہ مارتا نہ ہوں اور اس پر اظہارِ افسوس نہ کریں۔ کیونکہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھا لینا یا چرنا لینا اس امر کی دلیل نہیں کہ آپ کا بچہ آئندہ شریر، غاصب اور چور ہو گا کیونکہ بچہ ابھی رشد و خمیز کے اس مرحلہ پر نہیں پہنچا کہ کسی کی ملکیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکے اس کا اپنی اور دوسرے کی ملکیت میں فرق کر سکے۔ بچے کے احساسات اس کی عقل سے زیادہ قوی ہوتے ہیں اس لیے جو چیز بھی اسے اچھی لگتی ہے انجام سوچے بغیر اس کی طرف پکتا ہے۔ بچہ فطری طور پر شریر نہیں ہوتا اور بچے کی یہ غلطیاں اس کے باطن سے پیدا نہیں ہوتی۔ یہ تو عارضی سی چیزیں ہیں۔ جب بڑا

ہوگا تو پھر ان کا مرتکب نہیں ہوگا۔ ایسے کتنے ہی پرہیزگار، امین اور راست باز انسان ہیں کہ جو بچپن میں اس طرح کی غصتی منی خطائیں کرتے رہے ہیں۔ البتہ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ آپ ایسی خطاؤں کو دیکھ کر کوئی رد عمل ظاہر نہ کریں اور اس سے بالکل لاتعلق رہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر بچے کو شر یا رد ناقابل اصلاح نہ سمجھ لیں۔ ایسے ہی داد و فرما دینے والے گھن بکے صبر اور بردباری سے ان کا علاج کریں۔

خاص طور پر دو تین سالہ بچہ اپنے اور غیر کے مال میں فرق نہیں کر سکتا اور ملکیت کی حدود کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ جس چیز تک اس کا ہاتھ پہنچ جائے اسے اپنا بنالینا چاہتا ہے۔ جو چیز بھی اُسے اچھی لگے اٹھالینا چاہتا ہے اس مرحلے پر ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس مرحلے پر ماں باپ جو بہترین روش اپنا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ بچے کو عملاً اس کام سے روک دیں۔ اگر وہ زبردستی کوئی چیز دوسرے بچے سے لینا چاہے تو اسے اجازت نہ دیں اور اگر وہ لے لے تو اس سے لے کر واپس کر دیں۔ جو چیز وہ چاہتے ہیں کہ بچہ نہ اٹھاٹھے اسے اس کی دسترس سے دور رکھیں۔ زیادہ تر بچے جب رشد و فہم کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور ملکیت کی حدود کو اچھی طرح جان لیتے ہیں تو پھر دوسروں کے مال کی طرف وہ ہاتھ نہیں بڑھاتے اور چوری نہیں کرتے البتہ بعض بچے اس عمر میں بھی اس غلط کام کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر ماں باپ کو خاموشی اور لاتعلق نہیں رہنا چاہیے یہ درست نہیں ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کی چوری چکاری کو دیکھیں اور اس کی اصلاح نہ کریں اور یہ کہتے رہیں کہ ابھی بچہ ہے۔ اس کی عقل ہی اتنی ہے جب بڑا ہوگا تو پھر چوری چکاری نہیں کرے گا۔ البتہ یہ احتمال ہے کہ جب وہ بڑا ہو تو چوری نہ کرے لیکن یہ احتمال بھی بہت ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی چوریوں سے اُسے چوری کی مستقل عادت پڑ جائے اور وہ ایک چور اور غاصب بن کر ابھرے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ بچہ کسی کا یا ماں باپ کا مال اٹھا لے اور کوئی اس سے کچھ نہ کہے۔ اور اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کے غلط کام پر اُسے منع کرنے کی بجائے اس کا دفاع اور اس کی حمایت کرنے لگیں اگر کوئی ان سے شکایت کرے کہ ان کے بچے نے اس کا مال چرایا ہے تو یہ ضرور غل کرنے لگیں کہ ہمارے

بچے پر یہ الزام لگایا کیوں گیا؟

اس طرح کے نادان ماں باپ اپنے طرز عمل سے اپنی اولاد کو چوری چکاری کی تشویش کرتے ہیں اور عملاً انھیں سبق دیتے ہیں کہ وہ چوری کریں اور محکمہ جائلز اور اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لیے شور مچائیں۔

اس بنا پر ماں باپ کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کے غلط کاموں سے لا تعلق ہیں بلکہ انہیں کوشش کرنا چاہیے کہ وہ انہیں ایسے کام سے روکیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ برائی ان کے اندر جڑ پکڑے اور عادت بن جائے اور عادت کو ترک کرنا بہت مشکل ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

”عادت کو ترک کرنا انتہائی کٹھن کام ہے“

ماں باپ کو پسے مرحلے پر کوشش کرنا چاہیے کہ ان عوامل کو دور کریں کہ جو بچے کی چوری کا سبب بنسے ہیں تاکہ یہ عمل اصلاً پیش ہی نہ آئے۔ اگر بچے کو پنسل، ربڑ، کا پی یا قلم کی ضرورت ہے تو ماں باپ کو چاہیے کہ اس کی ضرورت کو پورا کریں۔ کیونکہ اگر انہوں نے اس کی ضروریات کو پورا نہ کیا تو ہر کتاب ہے کہ وہ اپنے ہم درس کی چیز اٹھا لے یا ماں باپ کی جیب سے پیسے چوری کرے۔ اگر اسے کھیل کے لیے گیند کی ضرورت ہے اور ماں باپ نے لے کر دیں تو ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے بچے کا گیند زبردستی لے لے۔ یا محلے کی دوکان سے چوری کرے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ حتی المقدور بچے کی حقیقی ضروریات کو پورا کریں۔ اور اگر ممکن نہ ہو تو بچے کو پیار سے سمجھائیں اور اس کا حل خود اس پر چھوڑ دیں۔ مثلاً اُسے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں کہ تمہارے لیے رنگوں والی پینسل خرید سکیں۔ تم فلاں دوکان سے اُدھار لے لو۔ بعد میں اُسے پیسے دے دیں گے۔ یا آج اپنے دوست سے عادیثاً لے لو بچے پر زیادہ سختیاں اور کنٹرول اور سخت پابندیاں اس کے ذہن میں چوری کا راستہ پیدا کر سکتی ہیں۔ اگر ماں باپ کھانے پینے کی چیزیں کسی الماری میں یا کسی اور ڈبے میں رکھ

کس کو تالا لگا دیں اور اس کی چابی چھاپیں تو بچہ اس سوچ میں پڑ جائے گا کہ کسی طرح سے چابی ڈھونڈ سکے اور مناسب موقع پا کر اس چیز کو نکالے۔ یہ بات خاص طور پر اس وقت ہوتی ہے جب ماں باپ خود کھائیں اور بچے کو نہ دیں۔

جب ماں باپ اپنے پیسے سات تھوں میں کسی جگہ چھپا دیں تو ممکن ہے بچے میں تحریک پیدا ہو اور وہ اتنا انہیں تلاش کرے کہ آخر پاسے ممکن ہو تو ماں باپ کو پیسے زیادہ بھی بانڈھ بانڈھ کر نہیں رکھنے چاہئیں۔ انہیں بچوں سے مل جل کر اور ہم رنگ ہو کر رہنا چاہیے اور ان کے ساتھ انعام و تقسیم پیدا کرنا چاہیے۔ انہیں سمجھائیں کہ زندگی کسی حساب کے تحت ہی بسر ہو سکتی ہے کھانے پینے کی چیزوں کو معین وقت پر ہی استعمال کرنا چاہیے اور پیسے ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ہیں انہیں کسی حساب کے مطابق ہی خرچ کرنا چاہیے۔

بچوں کو چوری، ڈاکے اور قتل کی فلمیں دکھانا چاہئیں۔ ریڈیو اور کتابوں کی ایسی کہانیوں سے بھی بچوں کو دُور رکھنا چاہیے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ چوری کرنے کے جرم میں عدالت میں پیش ہونے والے بچوں نے یہ بیان دیا ہے کہ یہ کام انہوں نے سینما یا ٹیلی ویژن میں ہوتے دیکھا ہے۔

سب سے اہم یہ ہے کہ ماں باپ اور گھر کے سارے افراد کو کوشش کریں کہ ان کے گھر کا ماحول امانت داری اور سچائی پر مبنی ہو۔ دوسروں کی ملکیت کا احترام کیا جائے اور اس پر تجاؤ نہ کیا جائے۔ ماں باپ کی اجازت کے بغیر ان کی حیب سے پیسے نہ نکالے اور اسے بتائے بغیر اس کے اموال میں بے جا تصرف نہ کرے۔ شوہر بھی بتائے بغیر زوجہ کی الماری اور سوٹ کیس کو نہ چھڑے اور اس کے لیے مخصوص چیزوں میں تصرف نہ کرے۔ ماں باپ کو بھی بچوں کی ملکیت کا احترام کرنا چاہیے اور بچوں کی اجازت کے بغیر ان سے مخصوص الماری اور اچھی کیس کو ہاتھ نہ لگائیں اور ان کے کھیلوں کے سامان میں تصرف نہ کریں۔

بچے کے چھوٹے سے تجاؤ پر اس کی عزت و اکبر کو نالود کر کے اسے ذلیل و خوار نہ کریں اسے یہ نہ کہیں اسے چور! اسے خیانت کا راتم چور بن جاؤ گے اور جیل خانے میں جاؤ گے ان تو مین آف نر خطا بات کے ساتھ آپ بچے کو چوری سے نہیں روک سکتے بلکہ

اس سے وہ ڈھیٹ بن جائے گا اور ممکن ہے کہ ان سب باتوں کا انتقام لینے کے لیے وہ بڑی بڑی چوریاں شہرِ دہلی کو دے۔

وہ بہترین طریقہ کہ ماں باپ کو جس کا انتخاب کرنا چاہیے یہ ہے کہ محبت اور نرمی کے ساتھ بچے کو سمجھائیں چوری کی بُرائی کو بیان کریں اور ملکیت کی وضاحت کریں۔ مثلاً اسے کہیں تم نے جو فلاں چیز اٹھائی ہے وہ کسی اور شخص کی ہے اسے فوراً واپس لوٹا دیں۔ اور آئندہ ایسا عمل نہ دہرائیں۔

لیکن اگر اس طرزِ عمل سے بھی کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہ کیا جاسکے تو مجبوراً بچے کو سختی اور ڈانٹ ڈپٹ سے روکا جائے اور اگر ناگزیر ہو تو بعض مواقع پر مار سپٹ سے بھی بچے کو چوری سے روکا جاسکتا ہے۔

حسد

حسد ایک بُری صفت ہے حاسد شخص ہمیشہ دوسروں کی خوشی اور آرام و سکون کو دیکھ کر رنج اور دکھ میں مبتلا رہتا ہے کسی اور شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھنے کے بعد غلین ہو جاتا ہے اور اس سے نعمت کے چھین جانے کی آرزو کرتا ہے۔ چونکہ عموماً یہ کسی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اس سے وہ نعمت بھی نہیں چھین سکتا لہذا غلین رہتا ہے اور حسد کی آگ میں دن رات جلتا رہتا ہے۔ حاسد شخص دنیا کی لذت اور آسائش سے محروم رہتا ہے حسد اور کینہ پروری انسان پر عرصہٴ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ اور انسان سے راحت و آرام چھین لیتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 ”حاسد انسان کو سب لوگوں سے کم لذت اور خوشی محسوس ہوتی ہے“
 حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:
 ”حسد حاسد کی زندگی کو تار یک کر دیتا ہے“
 امیر المؤمنین علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:
 ”حاسد شخص کو ہر گز راحت اور مسرت نصیب نہیں ہوتی،“

۱۔ مستدرک، ج ۲، ص ۲۲۷

۲۔ مستدرک، ج ۲، ص ۲۲۸

۳۔ مستدرک، ج ۲، ص ۲۲۷

حد انسان کے دل اور اعصاب پر بڑے اثر مرتب کرتا ہے اور انسان کو بیمار اور علیل کر دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

”حاسد شخص ہمیشہ بیمار اور علیل رہتا ہے“ ۱۷

حسد ایمان کی بنیادوں کو تباہ کر دیتا ہے اور انسان کو گناہ اور نافرمانی پر ابھارتا ہے بہت سے قتل، جرم، بھگڑے، لڑائیاں اور حتیٰ تلفیاں حسد ہی کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ حاسد کبھی عموماً کی غیبت اور بدگوئی کرتا ہے اور اُس پر تہمت بھی لگاتا ہے اس کے خلاف باتیں بناتا ہے۔ اس کا مال ضائع کرتا ہے۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

”حسد ایمان کو یوں تباہ کر دیتا ہے جیسے آگ ایندھن کو جلا دیتی ہے“ ۱۸

حد انسان کی طبیعت کا حصہ ہے۔ ایسا شخص کوئی کم ہی ہوگا کہ جو اس سے خالی ہو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

”تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے کوئی شخص خالی نہ ہوگا۔

۱۔ گمائی بد،

۲۔ خال بد،

۳۔ اور حسد ۱۹

لہذا اس بڑی صفت کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جانا چاہیے اور اسے بڑھنے اور

پھلنے پھولنے سے روکنا چاہیے۔ اگر اس بڑی عادت کو نظر انداز کر دیا جائے تو چوں کہ اس کا ریشہ انسان کی طبیعت کے اندر ہوتا ہے لہذا یہ پھلنے پھولنے لگتی ہے اور اس حد تک

۱۷ مستدک ج ۲، ص ۲۲۸

۱۸ شافی ج ۱، ص ۱۴۳

۱۹ جمعۃ البیضاء ج ۲، ص ۱۸۹

جا پہنچتی ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا اور اس کا قلع قمع کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہترین موقع کہ جب اچھے اخلاق کی پرورش کی جاسکتی ہے اور بُرے اخلاق کو پھٹنے پھولنے سے روکا جاسکتا ہے۔ بچپن کا زمانہ ہے۔ اگر یہ چھوٹی عمر میں ہی بچوں کی طبیعت میں موجود ہوتا ہے لیکن ماں باپ اپنے اعمال اور طرز عمل سے اس بُری عادت کو تحریک بھی کر سکتے ہیں اور اس کا قلع قمع بھی۔ اگر ماں باپ اپنی ساری اولاد سے عادلانہ سلوک کریں اور کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دیں۔ لباس، خوراک کے معاملے میں، گھر کے کاموں کے معاملے میں۔ جیب خراج اور اظہار محبت کے معاملے میں میل جول کے معاملے میں عدالت و مساوات کو ملحوظ نظر رکھیں۔ پھوٹے بڑے میں خوبصورت اور بد صورت میں۔ بیٹے بیٹی میں۔ باصلاحیت اور بے صلاحیت میں کوئی فرق نہ کریں تو بچوں میں حسد پروان نہیں چڑھے گا اور ممکن ہے تدریجاً ختم ہی ہو جائے۔ بچوں کی موجودگی میں کبھی کسی ایک کی تعریف و ستائش نہ کریں ان کا آپس میں موازنہ نہ کریں۔ بعض ماں باپ تعلیم و تربیت کے لیے اور بچوں کی تشریف کے لیے ان کا آپس میں موازنہ کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں! احمد زیادہ کچھ تمہاری بہن نے کتنا اچھا سبق پڑھا ہے کتنے اچھے نمبر لاتی ہے۔ گھر کے کاموں میں ماں کی مدد کرتی ہے۔ کتنی باادب اور خوش منہ ہے تم بھی بہن کی طرح ہر جاؤ تاکہ اتنی ابوم سے بھی پیار کریں۔ یہ نادان ماں باپ اس طرح چاہتے ہیں کہ اپنے بچے کی تربیت کریں جب کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اس طریقے سے مقصد حاصل ہو۔ جب کہ اس کے برعکس معصوم بچے کے دل میں حسد اور کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور اسے حسد اور دشمنی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس طرح سے بچہ کے دل میں اپنی بہن یا بھائی کے لیے کینہ پیدا ہو جائے اور وہ اسے نقصان پہنچانے پر تڑپ جائے اور ساری عمر ان کے دل میں حسد اور دشمنی باقی رہے۔

بھی اپنے بچوں کا دوسرے بچوں سے موازنہ نہ کریں اور اپنی اولاد کے سلسلے دوسروں کی تعریف نہ کریں۔ یہ درست نہیں ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد سے کہیں! فلاں کے بیٹے کو دیکھو کتنا اچھا ہے! کتنا باادب ہے۔ کتنا اچھا سبق پڑھا ہے۔ کتنا فرمانبردار ہے گھر کے کاموں میں اتنی ابو کا کتنا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کے ماں باپ کس قدر خوش قسمت ہیں۔ ان کے حال پر رشک آتا ہے۔ ایسے ماں باپ کو سمجھنا چاہیے کہ اس طرح کا موازنہ

اسی طرح کی سرزنش کا نتیجہ حسد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ زیادہ تر ان کا نتیجہ اُٹ ہی کھلتا ہے اور انہیں ڈھٹائی اور انتقام پر ابھارتا ہے۔

ماں باپ کو ایسے طرز عمل سے سختی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ البتہ سارے بچے ایک سے نہیں ہوتے کوئی بیٹا ہے کوئی بیٹی ہے۔ کوئی باصلاحیت ہے کوئی نہیں ہے کوئی خوش اخلاق ہے کوئی بد اخلاق ہے کوئی خوبصورت ہے کوئی نہیں ہے۔ کوئی فرمانبردار ہے کوئی نہیں ہے۔ کوئی تیز کوئی سست ہے۔ ہو سکتا ہے ماں باپ ان میں سے کسی ایک سے دوسروں کی نسبت زیادہ محبت کرتے ہوں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دل کی محبت اور پسند انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اور جب تک اس فرق کا علم اظہار نہ ہو تو یہ نقصان دہ نہیں ہے۔ لیکن ماں باپ کو عمل اور زبان سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے سختی سے بچنا چاہیے۔ عمل، گفتار اور انہماک محبت کرتے ہوئے مساوات اور برابری کو پوری طرح سے ملحوظ رکھنا چاہیے اس طرح سے کہ بچہ محسوس نہ کرے کہ دوسرے کو مجھ پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ اگر آپ کسی بچے کو اس کے کام پر تشوین کرنا چاہتے ہیں تو سختی طور پر کریں۔ دوسرے بہن بھائیوں کی موجودگی میں نہ کریں۔ البتہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ماں باپ عادلانہ طرز عمل اور مساوات سے بہن بھائیوں کے درمیان محبت سے حسد بالکل ختم کر دیں کیونکہ حسد انسان کے باطنی مزاج میں موجود ہوتا ہے۔ ہر بچے کی خواہش ہوتی ہے کہ وہی ماں باپ کو زیادہ لگاؤ ہو اور اس کے علاوہ دوسرا ان کے دل میں نہ سمائے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ماں باپ دوسرے سے اظہار محبت کر رہے ہیں تو اسے اچھا نہیں لگتا اور اس کے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا کوئی چارہ نہیں۔ بچے کو آہستہ آہستہ یہ بات سمجھنی چاہیے کہ وہ تنہا ماں باپ کا محبوب نہیں بن سکتا۔ دوسروں کا بھی اس میں حق ہے۔ ماں باپ اپنے عاقلانہ اور عادلانہ طرز عمل سے بچے کو دوسرے بہن بھائیوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر سکتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے اُن کو حسد سے بچا سکتے ہیں۔

اگر آپ دیکھیں کہ آپ کا بیٹا دوسرے بھائی یا بہن سے حسد کرتا ہے۔ اسے اذیت کرتا ہے۔ اڑتا ہے، پھکیاں مینسا ہے۔ گالی دیتا ہے، اس کے کھلونے توڑتا ہے، ان

کے حصے کے چل اور کھانا چھین لیتا ہے۔ اس صورت میں ماں باپ خاموش نہیں رہ سکتے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے ان کی خاموشی کے اچھے نتائج نہ نکلیں۔ ناچار زیادتی کرنے والے بچے کو انہیں روکنا چاہیے لیکن مار پیٹ سے اصلاح نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس طریقے سے ممکن ہے صورت حال اور بھی بگڑ جائے اور اس کے حقد میں اضافہ ہو جائے۔ بہتر ہے کہ اسے سختی سے روکیں اور کہیں میں اجازت نہیں دے سکتا کہ اپنی بہن یا بھائی کو تنگ کر دے۔ آخر یہ تمہاری بہن ہے اگر تم اسے پیار نہ کرو گے تو کون کرے گا اور یہ تمہارا بھائی ہے تمہیں تو چاہیے کہ دوسرے ان پر زیادتی کریں تو تم ان کی حفاظت کرو۔ یہ تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ انہوں نے تمہیں کتنے پیار سے بہن بھائی دیے ہیں اور ہمیں تم سب سے پیار ہے۔ تمہیں نہیں چاہیے کہ ایک دوسرے کو ستاؤ اور تنگ کر دو۔

آخر میں ضروری ہے کہ اس بات کا ذکر کیا جائے کہ بچوں کے درمیان کامل مساوات کو ملحوظ رکھنا شاید ممکن نہ ہو۔ ماں باپ چھوٹے بڑے، بیٹی اور بیٹے کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیسے کر سکتے ہیں۔ بڑے بچوں کو نسبتاً زیادہ آزادی دی جا سکتی ہے۔ لیکن چھوٹوں کو آزادی نہیں دی جا سکتی۔ بڑے بچوں کو زیادہ جیب خرچ کی ضرورت ہوتی ہے اور چھوٹوں کو نہیں۔ چھوٹے بچوں کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی رکھوالی کی جائے اور ماں باپ ان کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ کہیں آتے جاتے ہوئے بیٹیوں کی نسبت بیٹوں کو زیادہ آزادی دی جا سکتی ہے اور مناسب بھی نہیں کہ بیٹیوں کو زیادہ آزادی دی جائے۔ لہذا مساوات اور عدالت کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ عمر اور جنس کے اختلاف کے تقاضوں کو بھی ماں باپ کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے۔ اور ان کی ضروریات کے فرق کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے خواہ مخواہ فرق پیدا ہوتا ہے لیکن سمجھا رہاں ماں باپ اس طرح کے فرق کو اپنی اولاد کے سامنے بیان کر سکتے ہیں اور انہیں سمجھا سکتے ہیں کہ یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ عمر اور جنس کے فرق کی وجہ سے ایسا ہے مثلاً بڑے بیٹوں سے کہا جا سکتا ہے۔ تمہارا یہ بھائی چھوٹا اور کمزور ہے۔ خود سے کام نہیں

کر سکتا۔ اپنے آپ کو گنداکر لیتا ہے۔ خود سے کھانا نہیں کھا سکتا۔ اسے امی اور ابو کی زیادہ ضرورت ہے لیکن تم ماشاء اللہ بڑے ہو گئے ہو۔ تم میں توانائی زیادہ ہے اور ننھے کی طرح سے تمہاری دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم اس پر زیادہ وقت لگاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں اس سے زیادہ محبت ہے۔ بلکہ چارہ ہی نہیں ہے۔ مطمئن رہو کہ ہماری تم سے محبت کم نہیں ہوگی۔ جب تم پھوٹے سے تھے تو اسی طرح سے تمہارا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔

آخر میں اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اسلام کی نظر میں حسد اگرچہ قبیح اور برا ہے اور اسے گناہوں میں سے شمار کیا گیا ہے لیکن رشک نہ صرف یہ کہ برا نہیں ہے بلکہ جدوجہد، کوشش اور انسانی ترقی کے عوامل میں سے ہے۔ رشک اور حسد میں فرق یہ ہے کہ دوسروں کے پاس کسی نعمت کو دیکھ کر اگر ان نالاحظ ہو جائے اور یہ آرزو کرے کہ یہ ال کے پاس نہ رہے تو یہ حسد ہے۔ جب کہ رشک یہ ہے کہ انسان دوسروں سے اس نعمت کے چھین جانے کی آرزو نہ کرے۔ بلکہ یہ آرزو کرے کہ یہ نعمت اسی کو بھی میسر آئے۔ اور یہ آرزو بڑی نہیں ہے۔

ایک صاحب لکھتے ہیں :

میری ایک بہن تھی مجھ سے دو سال بڑی تھی امی ابو بہن کی نسبت مجھ سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ جو بھی میں آرزو کرتا فوراً اسے پورا کر دیتے۔ ہر جگہ میری تعریف کرتے لیکن میری بہن کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے۔ جب کہ بہن مجھے بہت تنگ کرتی ادھر ادھر جب بھی اسے موقع ملتا مجھے مارتی ہمیشہ مجھے تنگ کرتی رہتی۔ بڑا جھگڑا کہتی۔ مذاق اڑاتی۔ میرے کھلونے خراب کر دیتی۔ اسے اچھا نہ لگتا کہ میں ایک منٹ بھی خوش رہوں ! میں ہمیشہ سوچتا رہتا کہ بہن مجھے آخر تنگ کیوں کرتی ہے آخر میں نے کیا کیا ہے ! وہ مجھ سے بہت

حد کرتی تھی اور شاید اس کی وجہ دہی ماں باپ کا مجھ سے ترجیحی سلوک تھا۔
 وہ اپنے تئیں مجھ سے بھلائی کرنا چاہتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ
 بہن مجھ سے انتقام لے گی اور صبح و شام مجھے ستائے گی۔ اب جب کہ
 میرے والدین دنیا سے جا چکے ہیں میری بہن مجھ پر انتہائی مہربان ہے۔ وہ
 تیار نہیں ہے کہ مجھے ذرہ بھر بھی تکلیف پہنچے۔

غصہ

غصہ انسانی طبیعت کا حصہ ہے اس کی بنیاد انسانی جبلت میں موجود ہے اس غیر معمولی نفسیاتی کیفیت کا آغاز انسان کے دل و دماغ سے ہوتا ہے۔ چہرہ کیفیت شعاع آگ کے مانند پورے جسم پر چھا جاتی ہے آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں، منہ سے بھاگ نکلنے لگتی ہے۔ انسان کے اعصاب اس کے کنٹرول سے نکل جاتے ہیں۔ غصیلے شخص کی عقل کام نہیں کرتی اور اس حالت میں اس میں اور کسی پاگل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایسے عالم میں ممکن ہے اس سے ایسی غلطیاں سرزد ہوں جن کی سزا اسے پوری عمر جگتنا پڑے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :
 غصہ سے بچو کیونکہ اس کی ابتداء جنون سے ہوتی ہے اور انتہا ہیشیانی ہے^۱
 امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :
 غصہ تمام بُرائیوں اور جرائم کی کنجی ہے^۲
 غصہ انسان کے دین اور ایمان کو بھی نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے نیک اعمال کو بھی غارت کر دیتا ہے۔

۱۔ مستدرک، ج ۲، ص ۳۷۶

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۰۳

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

غصہ ایمان کو یوں ختم کر دیتا ہے جیسے سرد کر شہد کو تباہ کر دیتا ہے لہ

غصے کے عالم میں انسان احمقانہ باتیں کرتا ہے اور اس سے ایسے غلط کام صادر ہوتے ہیں جو اس کے باطن کو آشکار کر دیتے ہیں اور اسے دوسروں کی نظریں رسوا کر دیتے ہیں۔
حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

غصہ ایک بُرا سا تھی ہے کہ جو انسان کی خامیوں کو آشکار کر دیتا ہے۔ انسان کو بُرائی سے قریب اور نیکی سے دور کر دیتا ہے لہ

دماغی غصہ انسان کے دل اور اعصاب پر بُرے اثرات مرتب کرتا ہے اور انہیں کمزور و مضطرب کر دیتا ہے۔ لہذا جو شخص اپنی حیثیت، صحت اور دین کا خیر خواہ ہے اسے چاہیے کہ اس بُری صفت کا سختی سے مقابلہ کرے اور اس امر کے لیے خبردار رہے کہ کہیں غصہ اس کے اعصابی کنٹرول کو چھین لے اور اس کا دین و دنیا اور عزت و اُبرو برباد کر دے۔ اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ غصہ ہر جگہ اور ہر حال میں بُرا، ناپسندیدہ اور نقصان دہ نہیں ہے بلکہ اگر اس سے صحیح موقع پر صحیح طریقے سے استفادہ کیا جائے تو یہ انسانی زندگی کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ اسی جبلت سے انسان اپنی جان، مال، اولاد، دین، وطن اور دیگر انسانوں کا دفاع کرتا ہے۔ اس جبلت کی موجودگی کے بغیر انسان اگر دُشمنانہ زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ جبلت اگر عقل کے اختیار میں رہے تو نہ فقط نقصان دہ نہیں ہے بلکہ بہت مفید ہے۔

راہِ خدا میں جہاد، دین و وطن کا دفاع، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، عزت و ناموس کی حفاظت، ظلم کے خلاف قیام، مظلوموں کی حمایت، کفر اور بے دینی سے مقابلہ اور ستم رسیدہ انسانوں کی حمایت — یہ سب کام اسی قوت کی برکت سے انجام پاتے ہیں۔

لے اصول کافی، ج ۲، ص ۲۰۲

لے مستدرک، ج ۲، ص ۲۲۶

ایک متدین اور ذمہ دار مسلمان زندگی کے تلخ و ناگوار حوادث کے سامنے، ظلم اور سختی کشی کے سامنے، استبداد اور آمریت کے سامنے، بڑائی اور گناہ کے سامنے، لوگوں کے احوال پر تجاوز کے مقابلے میں، سامراج اور استعمار کے مقابلے میں، ملتوں کو غلامی کے طوق پہنانے کے مقابلے میں، بے دینی اور مادہ پرستی کے مقابلے میں غاموش اور لائق رہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اس کے غصے کو اس کی عقل پر بالادستی حاصل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر تو نے غصے کی پیروی کی تو یہ تجھے ہلاکت تک جا پہنچائے گا۔

یہ درست نہیں ہے کہ اس قوت کو بالکل ختم کر دیا جائے اور انسان لائق، بے حس اور بے غیرت ہو جائے۔ بلکہ افراط و تفریط سے اجتناب کرنا چاہیے اور اس قوت کو صحیح طریقے سے پروان چڑھانا چاہیے تاکہ ضروری مواقع پر اس سے استفادہ کیا جاسکے۔ دیگر صفات کی طرح بچپن ہی سے انسان میں نشو و نما حاصل کرتا ہے یہ تمام انسانوں کی سرشت کا حصہ ہے لیکن اس کی کمی یا زیادتی کا تعلق تربیت، اسول اور ماں باپ سے ہے ماں باپ اپنے طرز عمل سے اس قوت کو حالت اعتدال میں بھی رکھ سکتے ہیں اور افراط یا تفریط کی طرف بھی لے جاسکتے ہیں۔ اس امر کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ سب انسانوں کا مزاج ایک سا نہیں ہوتا کسی میں غصہ زیادہ ہوتا ہے اور کسی میں پیدائشی طور پر کم۔ عقل مند اور باتدبیر ماں باپ بچے کے خاص مزاج کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی تربیت کرتے ہیں اور اس کی جبلی قوتوں کو اعتدال پر لاتے ہیں اور اسے افراط و تفریط کے عوال سے بچاتے ہیں۔

بچہ غصے میں چیتا پھلتا ہے، اس کا بدن کانپتا ہے، چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے زمین پر پاؤں مارتا ہے اور ٹوٹتا ہے ایسے عالم میں وہ سخت کست جلتے ہوئے ہے کونے میں جا لگتا ہے لیکن اس کا مقصد شرارت نہیں ہوتا۔ ضروری ہے کہ بچے کے غصے کی وجہ دریافت کی جائے اور اسے دُور کیا جائے۔

غصہ کی طور پر کسی پریشانی اور ناراحتی سے پیدا ہوتا ہے۔ شدید درد تھکاوٹ، زیادہ بے خوابی، بھوک، شدید پیاس اور گرمی اور سردی کا غیر معمولی احساس نومولود اور چھوٹی عمر کے بچوں کو بے آرام کر دیتا ہے اور اس کے غصے کو بڑھاتا ہے۔ بچے کی توہین کرنا اور اسے اذیت دینا۔ اس کی خواہشوں کے خلاف قیام کرنا، اس کی آزادی کو سلب کرنا، خواہ مخواہ اس پر پابندیاں عائد کرنا، دوسرے کو ترجیح دے جانے کا احساس اور نا انصافیاں، اس امر کا احساس کہ مجھ سے پیار نہیں کیا جاتا، اس پر زبردستی بات ٹھونسن، بچے کی خود اعتمادی کو نقصان پہنچانا، ناتوانی کا احساس اور کامیاب نہ ہونے کا احساس، شکل اور طاققت فرسا، اسکامات، سخت ڈانٹ، ڈپٹ ان میں سے ہر امر بچے کا چین بھین لیتا ہے اور اس کے غصے کو بڑھاتا ہے اور اگر ایسی چیزوں کا ٹکڑا ہوتا رہے تو بچے کے اندر غصے کی سرشت کو تقویت ملتی ہے اور وہ ایک غصیلہ اور چرچڑا شخص بن جاتا ہے۔ بعض ماں باپ علما بچوں کو غصے کا سبق دیتے ہیں۔ ان پر چھینٹے ہیں اور سختی کرتے ہیں۔ ان کے غصے کے مقابلے میں غصے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے انہیں زیادہ غصیلہ بناتے ہیں۔

اگر آپ کا بچہ غصے میں آیا ہو تو آپ اس کے مقابلے میں غصہ نہ کریں۔ اس بات کا اطمینان رکھیں وہ کسی بڑائی کا ارادہ نہیں کرتا۔ آپ اس امر کی کوشش کریں کہ اس کی ناراضگی کی وجہ معلوم کریں۔ اگر اسے درد ہے تو اس کا علاج کریں۔

اگر بھوکا اور پیاسا ہے تو اسے کوئی چیز کھانے پینے کے لیے دیں۔ اگر تھکا ہوا ہے تو اسے سلا دیں۔ اگر آپ کے کاموں یا طرز عمل کی وجہ سے وہ غصے میں ہے تو آپ تلافی اور اصلاح کریں۔ اگر اس کا غصہ خیال اور دھڑ بھٹکنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے تو اس کے اشتباہ کو دور کریں۔ اگر اسے روحانی طور پر تقویت کی ضرورت ہے تو آپ وہ مہیا کریں۔ اگر اس کی کوئی جائز خواہش ہے اور آپ اسے پورا کر سکتے ہیں تو پورا کریں لیکن جب وہ معمول کی حالت پر آجائے تو کہیں کہ انسان کو جو چیز چاہیے ہو اسے زبان سے مانگنا چاہیے نہ کہ غصے اور زور سے اس وقت توہین نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے لیکن آئندہ اگر تم نے غصے اور زور سے کوئی بات منوانے کی کوشش کی تو پوری نہیں کی جائے گی۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :
 " غصے سے بچو کیسے یہ تم پر مسلط ہی نہ ہو جائے اور ایک عادت ہی نہ بن جائے
 پڑ پڑے بچے زور لے رہے ہیں اور چھوٹی سی بات پر غصے میں آجاتے ہیں۔ کیونکہ
 ان کی روح قوی نہیں ہوتی۔ لہذا وہ کوئی بھی ناپسندیدہ بات برداشت نہیں کر سکتے اور معمولی
 سی چیز پر بھی متاثر ہو جاتے ہیں اور غصے میں آجاتے ہیں۔

بدزبانی

بدگوئی ایک بڑی عادت ہے بدزبان اپنی بات کا پابند نہیں ہوتا۔ جو کچھ اس کے منہ میں آتا ہے کہے جاتا ہے، گلی بکتا ہے، ناسزا کہتا رہتا ہے، شرمچاتا ہے، برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ طعن زنی کرتا ہے، زبان کے چرکے لگاتا ہے۔

بدزبانی حرام ہے اور گناہان کبیرہ میں سے ہے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بدزبانی کرنے والے پر اللہ نے بہشت کو حرام قرار دیا ہے اور گالی دینے والے، بے حیا اور بدتمیز پر بھی جنت حرام ہے۔ بدگو شخص جو کچھ دوسروں کے بارے میں کہتا ہے اس کا خیال رکھتا ہے اور جو کچھ دوسرے اس کے بارے میں کہتے ہیں اس پر دھیان دیتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

دشنام طرازی، بدگوئی اور زبان درازی نفاق اور بے ایمانی کی نشانیوں میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

وَيُنْزِلُ كُلَّ هَمْزَةٍ لَمَذَّةً ۝

انفوس ہے ایسے سب افراد پر کہ جو لوگوں کی عیب جوئی اور طعن و تمسخر کرتے

ہیں۔ (ہمزۃ - ۱)

بد زبان افراد گھٹیا اور کم ظرف ہوتے ہیں۔ اس بُری عادت کی وجہ سے لوگوں کو اپنا دشمن بنایا کرتے ہیں۔ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ لوگ ان کی زبان سے ڈرتے ہیں اور ان سے میل ملاقات سے مُدھر بھاگتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لوگوں میں سے بدترین وہ ہے کہ لوگ جس کی زبان سے ٹھیں اور اس کے ساتھ تم نشین کو پسند نہ کریں۔

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لوگ جس کی زبان سے بھی ٹھیں وہ جہنم میں جائے گا۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مومن طعن زنی نہیں کرتا، جو اچھا نہیں کہتا رہتا، دشمن نام طرازی نہیں کرتا اور بدزبانی نہیں کرتا۔

بچہ فطری طور پر بد زبان نہیں ہوتا۔ یہ بری صفت وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائی یا،

دوستوں، ہم جو لیوں اور ہم جماعت بچوں سے سیکھتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ماں باپ کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں باپ اپنے بچے کے لیے موثر ترین نمونہ عمل ہوتے ہیں۔

لہذا ماں باپ نہ فقط اپنے قول و عمل کے ذمہ دار ہیں بلکہ بچوں کی تربیت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ یہ ماں باپ ہی ہیں جو بچے کو خوش کلام یا بد زبان بنا دیتے ہیں۔ بعض ماں باپ مذاق

۱۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۲۵

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۲۶

۳۔ معیۃ البیضا، ج ۲، ص ۱۲۷

کے طور پر یا غصے میں اپنے بچوں کو بدزبان کا عملی درس دیتے ہیں۔ بسن گھروں میں اس طرح کے کلمات روزمرہ کا معمول ہیں:

کتے کا بچہ، کتے کی ماں، کتیا کی بیٹی، احق، بے وقوف، بے شعور، گدھا، حیوان، حرام زادہ، پاگل، سست، بے ادب، بے غیرت، خدا تمہیں موت دے، گاڑی کے نیچے آؤ وغیرہ۔
کبھی ماں باپ ایک دوسرے کی عیب جوئی کرتے ہیں، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہیں یا ایک دوسرے کو گالی دیتے ہیں۔

ماں باپ جن کا فرض یہ ہے کہ بچوں کی کمزوریوں کو چھپائی وہ کبھی خود بچوں کی عیب جوئی کرنے لگتے ہیں، انہیں طعنے دیتے ہیں، ان پر طنز کرتے ہیں اور انہیں سخت سست کلمات کہتے ہیں۔ کیا ایسے ماں باپ کو توقع ہے کہ ایسے خاندان کا بچہ خوش زبان ہوگا۔ ایسی توقع عموماً پوری نہیں ہوتی۔ ایسے ماں باپ کو توقع رکھنا چاہیے کہ ان کے بچے انہی کی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر بدزبان ہوں گے۔ انہیں امید رکھنا چاہیے کہ وہ بعینہ یہی الفاظ بچوں کے منہ سے سُنیں گے۔ وعظ و نصیحت اور مار پیٹ سے بچے کو اس بُری عادت سے نہیں روکا جاسکتا۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ ماں باپ اپنی اصلاح کریں اور پھر بچے کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ کبھی بچے یہ بُری عادت اپنے بھائیوں سے سیکھتے ہیں لہذا ماں باپ کو اس امر کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ ان کے بچوں کے دوست کس طرح کے ہیں۔ انہیں اس بات کی اجازت نہ دیں کہ بدزبان بچوں سے میل جول رکھیں۔

اگر آپ کبھی اپنے بچے سے کوئی فحش یا بُری بات سنیں تو ہنس کر یا مسکرا کر اس کی تائید نہ کریں۔ گالی اور غصے کے ذریعے سے بھی بچے کو ایسی بات سے نہ روکیں کیونکہ اس طریقے کا نتیجہ زیادہ تر اس ہی نکلتا ہے بلکہ اسے اچھے انداز سے اور پیار سے سمجھائیں۔ اس سے کہیں! گالی دینا بُری عادت ہے اچھے بچے کبھی گالی نہیں دیتے۔

چنل خوری

چنل خوری ایک انتہائی بُری عادت ہے کہ جو بد قسمتی سے بہت سے افراد میں پائی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں بُری بات کرے تو چنل خورائے اُگے ہنستا ہے اور کہتا ہے فلاں نے تیرے بارے میں ایسا دیا کہا ہے چنل خوری پست فکری اور شیطنیت کی صفات میں سے ہے۔ اس سے ایک دوسرے کے درمیان کینہ اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ بہت سے جرائم، جھگڑے، قتل، لڑائیاں اسی چنل خوری کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کتنے گھروں کو اس عادت نے خراب کر دیا ہے میاں بیوی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے والدین سے بچوں کو جدا کر دیا ہے۔ چنل خور لوگوں کے راز فاش کرتا ہے۔ جب کہ خدا اس امر پر راضی نہیں ہے۔ چنل خور کی لوگوں میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اسے شیطان، جاسوس اور بد ذات سمجھا جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ اس سے ہم نشین اور دوستی سے گریز کرتے ہیں اور اس پر اور اس کے والدین پر لعنت بھیجتے ہیں۔ بدترین چنل خوری ظالموں کے لیے جاسوسی کرنا اور ٹوہ لگانا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ظالم کے لیے جاسوسی کرے اور کسی مسلمان کو مصیبت میں پھنسا دے۔ اور اس کی قید، ازیت یا قتل کا سبب بنے تو وہ ظالم کے ظلم میں شریک ہے۔ روزِ قیامت اُسے سزا ملے گی۔ اگرچہ وہ ظلم اور قتل کے جرم میں ظاہراً شریک نہ ہو۔

رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :
سب سے بُرا شخص وہ ہے جو اپنے مسلمان بھائی کی بادشاہ کے پاس چنل کے

اور اس کی جاسوسی کرے۔ یہ جاسوسی اس کے لیے بھی باعث ہلاکت ہے؛
 اس کے بجائے کے لیے بھی اور بادشاہ کے لیے بھی ملہ
 اسلام کے دین مقدس نے جاسوسی اور چنل خوری کو حرام قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں
 بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں؛
 چنل خور پر بہشت حرام کر دی گئی ہے اور وہ اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ملہ
 امیر المؤمنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں؛
 تم میں سے شریر اور برے وہ ہیں کہ جو چنل خوری سے دوستوں کے درمیان
 جدائی ڈال دیتے ہیں اور پاکدامن افراد کی عیب جوئی کرتے ہیں ملہ
 چنل خوری کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ کبھی دشمنی اس کا باعث بنتی ہے۔
 چنل خور کو کسی ایک یا دونوں افراد سے دشمنی ہوتی ہے اس لیے ایک سے دوسرے کی بات
 بیان کرتا ہے تاکہ ان میں پھوٹ پڑ جائے۔ اور وہ آپس میں لڑ پڑیں۔ کبھی کوئی شخص خود غائی
 اور دوستی و خیر خواہی جاننے کے لیے چنل کھاتا ہے۔ اور کبھی اس کا مقصد فقط محفل آرائی
 ہوتا ہے۔ بہر حال مقصد کچھ بھی ہو کام بہت برا ہے کہ ایک مسلمان کو جس سے بہر حال اجتناب
 کرنا چاہیے۔ دین مقدس اسلام نے چنل سننے تک کو حرام قرار دیا ہے۔
 پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں؛
 چنل خوری نہ کرو اور نہ چنل خور کی باتوں پر کان لگاؤ۔ ملہ

ملہ بحار، ج ۴۵، ص ۲۶۶

ملہ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۶۹

ملہ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۶۹

ملہ مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۹۱

علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

توہ لگانے والے اور چنیل خور کی بات کی تکذیب کرو وہ غلط ہر یا صمیم لے
 واضح ہے کہ اگر کوئی شخص چنیل خور کی باتوں پر کان نہ دھرے گا تو وہ ناجار اس عادت
 سے دستبردار ہو جائے گا۔ جو شخص کسی کی چنیل آپ کے سامنے کرتا ہے آپ اطمینان رکھیں کہ
 وہ آپ کا حقیقی دوست اور خیر خواہ نہیں ہے۔ اگر وہ آپ کا دوست ہوتا تو کہنے والے کے
 سامنے تمہارا دفاع کرتا نہ کہ اس کی بات آکر تمہارے سامنے نقل کرتا۔ تاکہ تم غصے میں مبتلا اور پریشان
 ہو۔ اور کبھی وہ تمہیں غلط کاموں پہ ابھارتا ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ رازدار ہو اور اپنی زبان پر کڑھولی
 کرے اور جاسوسی اور چنیل خوری سے پرہیز کرے۔ بہت سے لوگ یہ ناپاک عادت پیچھن ہی میں
 ماں باپ کے ہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ لہذا ماں باپ کی بھی اس سلسلے میں ذمہ داری ہے۔ اپنی
 اولاد کو اس بُری عادت سے بچانے کے لیے پہلے ماں باپ کو چاہیے کہ وہ کسی کی چنیل نہ
 کھائیں ماں کو نہیں چاہیے کہ وہ پھوپھی، باجی، خالہ اور مہمانیوں کی شکایتیں اپنے شوہر سے
 کرے۔ اور شوہر بھی بڑی سے دوسروں کی چنیل نہ کھائے۔ کیونکہ اگر ماں باپ کو چنیل خوری
 کی عادت ہوگی تو ان کی اولاد بھی ان کی تقلید کرے گی۔ اور اس بُری عادت کو ان سے سیکھے
 گی۔ کبھی کوئی بچہ اپنی امی، بہن یا بھائی کی شکایت ابو سے کرتا ہے اور چنیل کھاتا ہے۔ اس
 موقع پر باپ کی ذمہ داری ہے کہ فوراً بچے کو روکے اور اس سے کہے کہ چنیل کھانا بُرا
 کام ہے کیوں امی کی بات میرے سامنے بیان کرتے ہو؟ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم دوسروں
 کی باتیں مجھ سے بیان کرو۔ پھر میں نہ دیکھوں کہ تو چنیل کھاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی چنیلوں پر
 رد عمل بھی بالکل ظاہر نہ کریں اور انہیں بالکل نظر انداز کر دیں۔ بچوں کو یہ بُری عادت نہ پڑے
 اس لیے

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

”چنیل خور کی چنیلوں پر کان نہ دھرو“

عیب جوئی

لوگوں میں یونہی کیڑے نکالنا بھی بُری اور مذموم عادتوں میں سے ہے۔ عیب جوئی کرنے والے شخص سے لوگ نفرت کرتے ہیں احساس سے میل ملاپ پسند نہیں کرتے۔ عیب جوئی دشمنی اور کینے کا باعث بن جاتی ہے، دوستیوں کے بندھن توڑ دیتی ہے اور دوستوں کے مابین جدائی ڈال دیتی ہے۔ اگر کسی کی غیر موجودگی میں اس کی عیب جوئی کی جائے تو یہ غیبت ہے اور سامنے کی جائے تو بھی بُرائی ہے۔ دینِ مقدس اسلام نے اس بُری عادت کو گناہانِ کبیرہ میں سے شمار کیا ہے اس بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ مثلاً :

رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ دیتے ہوئے باوازا بلند فرمایا، اسے وہ لوگو! کہ جو زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہو۔ لیکن تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا! مسلمانوں کی غیبت اور بدگوئی نہ کرو اور ان کے عیب تلاش نہ کرتے رہو کیونکہ ہر وہ شخص جو اپنے بھائی کے عیب ڈھونڈے اس کا عیب آشکار کر دے گا اور اسے لوگوں کی نظروں میں رُسوا کر دے گا۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:
جو شخص بھی کسی مومن سے متعلق کوئی ایسی بات کہے کہ جس سے اس
کی عزت و اکبرد جاتی ہو، اللہ اسے اپنے دوستوں کے زمرے سے
نکال کر شیطان کے دوستوں میں شامل کر دے گا اور شیطان بھی اسے قبول
نہیں کرے گا۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
جو کوئی بھی کسی مسلمان مرد یا عورت کی غیبت اور بدگوئی کرے گا، اللہ
چالیس روز تک اس کی نافرمانی قبول نہیں کرے گا مگر یہ کہ جس کی اس
نے غیبت کی ہے اسے راضی کر لے۔
امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

غیبت اور بدگوئی حرام ہے اور نیکیوں کو یوں تباہ کر دیتی ہے جیسے آگ
ایندھن کو جلا ڈالتی ہے۔

بدقسمتی سے آنا بڑا گناہ ہمارے لوگوں کا معمول بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ اب
یہ لوگوں کو بُرائی ہی معلوم نہیں ہوتا اور لوگ اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ ماں باپ کی بُرائی
کرتی ہے اور باپ ماں کی۔ ہمسائے اور رشتے دار ایک دوسرے کی غیبت جوئی کرتے
ہیں۔ معصوم بچے یہ بُری عادت اپنے گھر اور ماں باپ ہی سے اپناتے ہیں۔ بچے و دوسرے
بچوں کی غیبت جوئی کرتے ہیں۔ تدریجاً بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر اس خوک کو پھوڑا لان کے
لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

بعض نا سمجھ ماں باپ اپنے بچوں کی بُرائی بھی کرتے ہیں جب کہ انہیں اپنی اولاد

۱۔ جامع السعادات ج ۲، ص ۲۰

۲۔ جامع السعادات ج ۲، ص ۲۰

۳۔ جامع السعادات ج ۲، ص ۲۰

کی کوتاہیوں کو چھپانا چاہیے۔ کبھی ماں باپ اپنی اولاد کی بُرائی اس کے سامنے مذاق کے طور پر یا
غصے میں بیان کرتے ہیں۔

ایسی صورت میں بچے ماں باپ کے بارے میں بدظن ہو جاتے ہیں، یا ان میں بھی یہ
عادت پڑ جاتی ہے اور یا پھر اپنے بارے میں وہ احساسِ کسری کا شکار ہو جاتے ہیں لہٰذا ماں باپ
کو بچوں کی عیب جوئی سے پرہیز کرنا چاہیے۔



گھر میں بچوں کا لڑائی جھگڑا

ایک بہت بڑی گھریلو پریشانی بچوں کا لڑائی جھگڑا ہے۔ بچے جب ایک سے زیادہ ہو جائیں تو پھر ان کے درمیان لڑائی جھگڑا بھی شروع ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے کو اپنے لیے بدشگون سمجھتا ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو دھکتے دیتے ہیں، کھلونے پھینکتے ہیں، ایک دوسرے کی کاپی پر لکیریں کھینچ دیتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، ایک ٹھنڈ مچاتا ہے تاکہ دوسرا اسکوں کا سبق یاد نہ کر سکے۔ ہر بچہ جانتا ہے کہ وہ کن طریقوں سے اپنے بھائی یا بہن کو ستا اور ٹلا سکتا ہے وہ ایک دوسرے کی خوب خبر لیتے ہیں۔ اس صورت حال پر ماں باپ بے چارے کڑھتے رہتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے کی شکایت ان کے پاس آتی ہے۔ خرابی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بچوں کی لڑائی ماں باپ پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔ ماں، باپ سب کچھ کرتے ہیں کہ بچے کی تربیت کی طرف توجہ نہیں دیتے، وہ تم سے ڈرتے تک نہیں، یہ تمہاری لاپرواہی کی وجہ ہی ہے گھر میدان جنگ بن چکا ہے۔

باپ، ماں سے کہتا ہے: اگر تو سمجھدار عورت ہوتی تو یہ بچے اتنے شیطان اور نالائق نہ ہوتے۔ تیری حمایت کی وجہ سے بچوں کی یہ حالت ہے۔

یہاں پر ماں باپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ ان سے اس بات کی توقع نہ رکھیں کہ وہ نینتالیس سالہ کسی شخص کی طرح آرام سے کسی کونے میں بیٹھے ہوں۔ آپ اس حقیقت کو قبول کریں کہ بچوں کا لڑائی جھگڑا تو ایک فطری سی بات ہے۔ لڑائی تو بڑوں میں بھی ہو جاتی ہے۔ ایک گھر میں بچوں سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہمیشہ آرام و

سکون سے بیٹھے رہیں اور کبھی لڑائی جھگڑا نہ کریں۔ بچے تو شدید ہوتے ہی ہیں۔ وہ جلدی پھر آپس میں گھل مل جاتے ہیں بڑوں کی طرح دیر تک ایک دوسرے سے منہ بسورے بیٹھے نہیں رہتے۔ ایک ماہر نفسیات اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ یہ بات ہمیں سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ ایک گھر، اس میں چند بچے بھی ہوں مگر وہ ہمیشہ مل جل کر رہیں کبھی لڑیں کبھی نہیں۔ ہم نے جس بچے سے بھی بات کی ہے وہ یہ کہتا ہے کہ امی ابو یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم بہن بھائی جب اکٹھے ہوں تو ہمیں بہت زیادہ اتفاق و آرام سے رہنا چاہیے۔ اگر آپ حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی اس توقع سے تھوڑا سا پیچھے ہٹ جائیں تو بچوں کے اس لڑائی جھگڑے سے اتنا پریشان نہیں ہوں گے۔

ہمیں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ بچوں کی یہ عادت ہمیشہ نہیں رہے گی بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اگر ماں باپ ان کے بچپن کے طرز عمل کو ایک حقیقت کے طور پر مان لیں تو پھر کسی حد تک انہیں اطمینان ہو جائے گا اور کم از کم وہ ان کے بچپن کے لڑائی جھگڑے خود ان تک نہیں پہنچنے دیں گے۔

ایک ماہر نفسیات لکھتے ہیں:

شاید بچوں کے بہت سارے کام مثلاً آپس میں مذاق کرنا۔ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرنا۔ کشتی کرنا۔ صرف دقت کے ساتھ ساتھ اور ان کے بڑے ہونے سے ختم ہو جاتے ہیں۔

ہاں یہ درست ہے کہ زیادہ تر موقع پر ماں باپ بچوں کے لڑائی جھگڑوں کو ختم نہیں کر سکتے لیکن عقل اور تدبیر سے ان میں کمی پیدا کر سکتے ہیں۔ عقل مند ماں باپ بچوں کے

۱۔ رواں شناسی کو دوک از تولد تا دو سالگی، ص ۲۸۶

۲۔ رواں شناسی کو دوک - رفتار کو دوکان از تولد تا دو سالگی ص ۲۸۶

اطوائی جھگڑے پر بالکل تماشائی نہیں بنے رہ سکتے۔ بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ عقل و تدبیر سے اس کے عوامل کو ختم کریں۔ انہیں اجازت نہ دیں کہ وہ ایک دوسرے کو اذیت پہنچائیں۔ ماں باپ کو چاہیے کہ پہلے وہ اختلاف کے عوامل کو سمجھیں اور ان اسباب کو پیدا ہونے سے روکیں وگرنہ بعد میں مسئلہ مشکل ہو جائے گا۔ بچوں کے درمیان اختلاف کی ایک اہم وجہ ان کا آپس میں حسد ہے نظر انداز نہ کرنے سے حسد ختم نہیں ہو سکتا۔ اور ڈانٹ ڈپٹ بھی اس کا علاج نہیں ہے۔ چاہیے کہ حسد پیدا ہونے کے اسباب کو روکا جائے۔

بچہ خود پرست ہے وہ چاہتا ہے کہ فقط وہی ماں باپ کا محبوب ہو اور کوئی اور ان کے دل میں جگہ نہ پاسکے۔ پہلا بچہ عموماً ماں باپ کو لاڈلاتا ہوتا ہے۔ وہ اس سے پیار محبت کرتے ہیں۔ اس کی خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن جب دوسرا بچہ دنیا میں آتا ہے تو حالات بدل جاتے ہیں۔ ماں باپ کی پوری توجہ نومولود کی طرف ہوجاتی ہے اب بڑا بچہ خطرہ کا احساس کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ ننھا بن بلا یا جھان اب اس کا رقیب بن گیا ہے۔ اور ماں باپ کو اس نے اپنا بنا لیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے انتقام لینا چاہیے۔ لیکن نومولود پر ماں باپ کی شفقت ہوتی ہے لہذا اسے قبول کیے بغیر چارہ بھی نہیں ہوتا۔ ان حالات میں ممکن ہے بڑا بچہ اپنے آپ کو میدظاہر کرے، زمین پر گر جائے، کھانا نہ کھائے، غصہ کرے۔ روئے یا اپنے کپڑوں کو خراب کر دے تاکہ اس طرح سے وہ ماں باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکے یہ بچہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا ہے اور اسی وقت سے بھائی یا بہن کے بارے میں اپنے دل میں کینہ پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس موقع کے انتظار میں رہتا ہے کہ اس سے انتقام لے سکے۔ اس کیفیت میں سب بچے پیدا ہوتے ہیں اور گھر کے دوسرے بچوں سے آتے ہیں۔ انہیں حالات میں حسد اور کینہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ماں باپ شروع ہی سے اپنے طرز عمل پر توجہ رکھیں۔ اور بچوں میں حسد کے اسباب پیدا نہ ہونے دیں۔ سمجھا رہاں باپ نومولود کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی بڑے بچوں کو ذہنی طور پر اس کے استقبال کے لیے اور قبول کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں۔ انہیں پہلے ہی سمجھاتے ہیں کہ جلد ہی تمہارا ننھا بھائی یا ننھی بہن پیدا ہوگی۔ جب وہ بڑی ہوگی تو

تم سے پیار کرے گی۔ تمہارے ساتھ مل کے کھیلے گی۔

اگر وہ نومولود کے لیے کوئی چیز تیار کریں تو بڑے بچوں کے لیے بھی کوئی چیز خریدیں جب ماں نئی پیدائش کے لیے کسی میڈیکل سینٹر میں داخل ہو جائے تو باپ بچوں کے لیے تحفہ لاسکتا ہے اور ان سے کہہ سکتا ہے کہ یہ تحفے کی آمد کی خوشی میں تمہارے لیے تحفہ لایا ہوں۔ جب نومولود گھر آئے تو زیادہ شور شراب نہ کریں اور دوسرے بچوں کی موجودگی میں اسی کی زیادہ تعریف نہ کریں۔ پہلے کی طرح بلکہ پیسے سے بھی زیادہ ان کا خیال کریں۔ ان سے محبت کریں ایسا سلوک کریں کہ بڑے بچے مطمئن ہوں وہ بھی اس کے بچے کے آنے سے اُن کی زندگی کو نقصان نہیں پہنچا۔ اس طرح سے وہ نئے بچے کے لیے اپنی گود بچھلا سکتے ہیں اور خوشی خوشی اس کا استقبال کر سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر ماں باپ چاہیں کہ ان کے بچے آپس میں دوست ہوں اور ان میں لڑائی جھگڑا نہ ہو تو ان میں حسد کے اسباب پیدا نہ ہونے دیں اور ان کو ایک آنکھ سے دیکھیں۔ سب سے ایک جیسا سلوک کریں تاکہ وہ آپس میں دوست ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

انصاف اختلاف کو ختم کر دیتا ہے اور دوستی کا سبب بنتا ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

عادلانہ سلوک بہترین تدبیر ہے۔

ممكن ہے بعض بچوں میں واقعتاً ایسی خصوصیت ہو کہ جس کی وجہ سے ماں باپ کی محبت

ان سے زیادہ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے بعض بچے زیادہ ذہین ہوں زیادہ خوبصورت ہوں۔ بعض

کا اخلاق بہتر ہو۔ ہو سکتا ہے زیادہ معنی ہو۔ ہو سکتا ہے بعض زیادہ خوش زبان ہوں، ہو

سکتا ہے کسی کا سلوک دوسرے سے ماں باپ سے بہتر ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی کلاس سے

دوسروں کی نسبت نمبر اچھے لائے۔ ہو سکتا ہے ماں باپ بیٹی یا بیٹے کو زیادہ پسند

۱۔ غرضالحکم، ص ۶۴

۲۔ غرضالحکم، ص ۶۴

لاتے ہوں۔

ممکن ہے اس میں کوئی حرج بھی نہ ہو کہ ماں باپ قبلاً کسی ایک بچے کو زیادہ پسند کرتے ہوں لیکن ان کا سلوک سب سے ایک جیسا ہونا چاہیے اور اس میں فرق نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ بچے ذرا بھر بھی دوسرے کے بارے میں ترجیحی سلوک نہ دیکھیں۔ یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ بچے ماں باپ کی محبت کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ اور اس پر بہت توجہ دیتے ہیں اور حقیقت کو جلد سمجھ لیتے ہیں۔ لہذا ماں باپ کو بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

بعض ماں باپ بچوں کی تربیت کے لیے ایک کی خصوصیات دوسرے کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں احسن؛ خوب سبق پڑھو تا کہ عباس کی طرح اچھے ممبر حاصل کر سکو۔ کہتے ہیں؛ زہرا! تم بھی اپنی بہن زینب کی طرح ماں کی مدد کرو، زینب کتنی اچھی بچی ہے۔ کہتے ہیں؛ رضا! تم بھی اپنے بھائی علی کی طرح دس ترخان پر سیتے سے بیٹھو۔ دیکھو وہ کتنا باادب بچہ ہے۔ ایسے ماں باپ کا طرز عمل بالکل غلط ہے کیونکہ اس کا نہ فقط مثبت تربیتی نتیجہ نہیں ملتا بلکہ اس سے بچوں میں رقابت اور حسد پیدا ہو جاتا ہے اور انہیں انتقام اور دشمنی پر ابھارتا ہے۔ کبھی بچے خود بھی ایسی باتوں کا اظہار کرتے ہیں۔

بچوں کے لڑائی جھگڑے کی ایک وجہ ماں باپ کی اُن سے بے جا توقع ہے۔ بچہ چاہتا ہے کہ اپنے بھائی یا بہن کے کھلونے سے کھیلے لیکن وہ اسے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ لہذا لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت ماں یا باپ دخالت کرتے ہیں اور پیار کے ساتھ سمجھاتے ہیں اور اگر پیار کا اثر نہ ہو تو سختی سے انہیں سمجھاتے ہیں کہ وہ اپنے کھلونے اپنے بھائی کو دے دیں۔ مثلاً کہتے ہیں؛ یہ تمہارا بھائی ہے؛ کیوں اسے کھلونے نہیں دیتے ہو؟ کھلونے لائے تو ہم ہی ہیں، کیا یہ تمہاری ملکیت ہے کہ جو اسے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے ہو؟ اگر تم نے ایسا کیا تو پھر تم سے ہم پیار نہیں کریں گے اور نہ ہی آئندہ تمہیں کھلونے خرید کر دیں گے۔

بچہ بیچارہ مجبور ہو جاتا ہے۔ کھلونے دے تو دیتا ہے لیکن ماں یا باپ کو سخت مزاج

اور بھائی کو خاتم سمجھنے لگتا ہے اور دلوں میں دونوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور جب بھی اسے موقع ملتا ہے پھر وہ اس کا اظہار کرتا ہے کیوں کہ بچہ ان کھلونوں کو اپنا مال سمجھ رہا ہوتا ہے اور اس کا خیال ہوتا ہے کہ کسی کو حق نہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر انہیں ہاتھ لگائے لہذا وہ اپنے آپ کو مظلوم اور اپنے بھائی اور باپ کو ظالم سمجھتا ہے۔ ایسے موقع پر یہ بچہ حق پر ہے کیوں کہ ماں باپ کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ ان کی مخصوص چیزوں کو کوئی چھیڑے۔ پھر یہ حق وہ بچوں کو کیوں نہیں دیتے اور شخص کی کچھ اپنی چیزیں ہوتی ہیں کہ جن کے استعمال سے وہ دوسروں کو روک سکتا ہے۔ البتہ عقل مندا اور باتدبیر ماں باپ آہستہ آہستہ بچوں کے اندر تعاون اور ایثار کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ایسی فضا پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ خوشی خوشی اپنے بہن بھائیوں کو اپنے کھلونوں سے کھیلنے اور اپنی چیزوں کے استعمال کی اجازت دیں۔

کبھی اختلاف کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی ماں باپ کوئی کام ایک بچے کے سپرد کر دیتے ہیں اور دوسروں کو ایسے ہی چھوڑ دیتے ہیں اس صورت میں لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ماں باپ اسی طرح کی کشمکشوں سے بچنا چاہیں تو انہیں چاہیے کہ سب بچوں کو ایک نظر سے دیکھیں اور ان میں کوئی تفریق برقرار نہ رکھیں۔ یا تو کسی سے کوئی کام نہ کہیں۔ یا پھر ان کی صلاحیت کو سمجھ کر ہر کسی کے لیے کوئی کام متعین کریں اور ان کے ذمہ لگائیں تاکہ اختلاف پیدا نہ ہو بیکاری بھی خرابیوں کی ایک وجہ ہے بچوں کی مشغولیت کے لیے کوئی کام ہونا چاہیے تاکہ ان میں جھگڑا کم سے کم ہو۔ خاص طور پر اگر ہو سکے تو انہیں کسی ایسے کھیل پر ابھاریں کہ جسے وہ مل جل کر کھیل سکیں۔ یہ ان کے لیے بہت مفید ہوگا۔

کبھی ماں باپ کی آپس کی لڑائی بھی بچوں میں جھگڑے کا باعث بن جاتی ہے جب معصوم بچے دیکھتے ہیں کہ ان کے ماں باپ ہمیشہ ایک دوسرے سے توڑکار اور لڑائی جھگڑا کرتے رہتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید لڑائی جھگڑا زندگی کے لازمی امور میں سے ہے۔ اور ایک ایسا کام ہے جس سے بچا نہیں جاسکتا۔ اس لحاظ سے وہ ماں باپ کی تقلید کرتے ہیں۔ اور یہی کام وہ آپس میں کرتے ہیں۔

لہذا جو ماں باپ بچوں کے لڑائی جھگڑے سے تنگ ہوں انہیں پہلے اپنی اصلاح

کرنا چاہیے۔ آپس کے نزاع اور کشمکش کو ترک کر دینا چاہیے پھر بچوں کی اصلاح کے درپے ہونا چاہیے۔ شاید ایسا کوئی خاندان کم ہی ہو کہ جس میں کبھی کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوا ہو۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ بچوں کی عدم موجودگی میں وہ آپس میں اس سلسلے میں بات کریں۔ اور اگر کوئی بات بچوں کے سامنے ہو جائے تو وہ بچوں سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی مسئلے پر ہمارا اختلاف ملائے ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے حل کریں۔

آخر میں ہم اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ممکن ہے آپ ان تمام امور کو ملحوظ خاطر رکھیں لیکن پھر بھی بچوں کے لڑائی جھگڑے سے کامل طور پر نہ بچ سکیں۔ آپ کو یہ توقع نہیں ہونی چاہیے۔ نہ ہی ہم نے اس کی ضمانت دی ہے۔ آپ کے بچے بھی عام بچوں کی طرح ہیں۔ بچوں کے جھگڑے ایک فطری سی بات ہے۔ بچوں میں تو انائی زیادہ ہوتی ہے۔ جو وہ ایسے کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ آپ متوجہ رہیں کہ وہ ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں اور ایک دوسرے کو شدید افیت نہ دیں بہتر یہ ہے کہ حتی الامکان بچوں کے چھوٹے موٹے جھگڑوں میں آپ شریک نہ ہوں۔ انہیں آپ رہنے دیں کہ وہ اپنے مسئلے خود حل کریں۔ نہ ہی آپ ایسی باتوں پر زیادہ پریشان ہوں۔ ان کا طرز عمل خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔



دوست اور دوستی

اچھا دوست اور مہربان رفیق اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ مصیبت میں دوست ہی انسان کی پناہ ہوتا ہے اور قلب و روح کے آرام کا ذریعہ۔ مشکلات سے بھری اس دنیا میں ایک حقیقی دوست کی موجودگی ہر انسان کی ضرورت ہے۔ جو شخص ایک مہربان دوست کی نعمت سے محروم ہو وہ وطن سے دور تنہائی کی سی کیفیت میں ہوتا ہے اور کوئی اس کا غمخوار نہیں ہوتا کہ زندگی کی مشکلات میں وہ جس کا سہارا لے سکے۔

حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ دنیا میں آرام کا بہترین وسیلہ کیا ہے۔ فرمایا: کھانا گھر اور زیادہ دوست۔ ۱

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَعْجِزُ النَّاسِ مَنْ عَجِزَ عَنْ إِكْتِسَابِ الْإِخْوَانِ۔

کمزور ترین شخص وہ ہے جو کسی کو دوست اور بھائی نہ بنا سکے۔ ۲

حضرت علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

دوستوں کا نہ ہونا ایک طرح کی غریب الوطنی اور تنہائی ہے۔ ۳

۱۔ بحار، ج ۲، ص ۱۷۷

۲۔ نہج البلاغہ، ج ۲، ص ۱۵۲

۳۔ بحار، ج ۲، ص ۱۷۷

جیسے بڑوں کو دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے ویسے ہی بچوں کو بھی یا دوست کی ضرورت ہوتی ہے جس بچے کا کوئی دوست نہ ہو وہ ہر جگہ تنہا تنہا سا، مر جھایا مر جھایا سا اور افسردہ افسردہ سا رہتا ہے۔ بچے کو فطری طور پر دوست کی خواہش ہوتی ہے اور اس فطری خواہش سے اسے محروم نہیں رکھا جاسکتا۔ دوست اور ہم بھولی میں فرق ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ہم بھولی تو ہو مگر دوست نہ ہو۔ کبھی بچہ ہم بھولیوں اور کلاس فیلوز میں سے کسی دوست کا انتخاب کرتا ہے۔ شاید دوستی کا اصلی محرک اور عامل زیادہ واضح نہ ہو۔ ہو سکتا ہے وہ افراد کی باہمی روحانی ہم آہنگی انہیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں،
لوگوں کے دل جھٹکتے ہوئے جنگیوں کے مانند ہیں جو بھی ان سے محبت کرے
اسی میں کھو جاتے ہیں۔

دوست کسی پر ٹھونسنائیں جاسکتا کہ ماں باپ اپنی اولاد سے کہیں کہ فلاں بچے کو دوست بناؤ اور فلاں کو نہ بناؤ۔ دوست کے انتخاب میں بچے کو آزادی ملنا چاہیے البتہ ہر طرح کی آزادی نہیں دی جاسکتی کیونکہ دوستوں کا اخلاق و کردار ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور ایک دوست دوسرے کے اخلاق اور طرز عمل کو اپناتا ہے۔ اگر بچے نے ایک خوش اخلاق اور اچھا دوست بنالیا تو وہ اس سے اچھائیاں اپنائے گا اور بُرا دوست مل گیا تو اس کی برائیاں اس پر اثر انداز ہوں گی۔ بہت سے معصوم بچے اور نوجوان ہیں کہ جو اپنے بُرے دوستوں کے باعث گناہ کی ولوی میں جا پھنسے ہیں اور ان کی دنیا و آخرت تباہ ہو چکی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
انسان اپنے دوست کے مذہب، طریقے اور روش کا خوگر بن
جاتا ہے۔

۱۔ بحار، ج ۲، ص ۱۸۵

۲۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۲۷۵

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

لوگوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ ہے کہ جس کا میل بول اچھے
لوگوں کے ساتھ ہو۔

اسی وجہ سے اسلام اپنے ماننے والوں کو اس امر کا حکم دیتا ہے کہ وہ بُرے
دوست سے اجتناب کریں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

فاسقوں اور گنہ گاروں کے ساتھ دوستی سے بچو کیونکہ بُرائی کی تاثیر بُرائی
ی ہے۔

امام سجاد علیہ السلام نے اپنے فرزند ولید نام محمد باقر علیہ السلام سے فرمایا :
اے میرے بیٹے ! پانچ طرح کے لوگوں سے رفاقت نہ کرو۔

۱۔ جھوٹے کے ساتھ رفاقت نہ کرو کہ وہ سراب کے مانند ہے۔ وہ تجھے فریب
دے گا۔ دور کو نزدیک اور نزدیک کو دور تر لائے گا۔

۲۔ فاسق اور بدکار کو دوست نہ بناؤ کہ وہ تجھے بہت کم قیمت پر یہاں تک کہ ایک
روزا لے کے مول بیچ دے گا۔

۳۔ کنجش کو دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ ضرورت پڑنے پر بدنہی کرے گا۔

۴۔ کسی احمق کو دوست نہ بناؤ کیوں کہ وہ اپنی بے وقوفی کے باعث تمہیں نقصان
پہنچائے گا بلکہ یہ تک ممکن ہے کہ وہ فائدہ پہنچا چاہے مگر نقصان پہنچا دے۔

۵۔ قطع رحمی کرنے والے کو دوست نہ بناؤ کیونکہ قطع رحمی کرنے والا خدا کی رحمت
سے دور اور بے رحم ہے۔

۱۔ غرضالحکم، ص ۱۸۹

۲۔ بحار، ج ۴، ص ۱۹۹

۳۔ اصول کافی، ج ۲، ص ۳۷۶

لہذا سمجھدار اور فرض شناس ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دوستوں سے لاتعلقی نہ رہیں کیونکہ ایسا کرنا نہ بچوں کے فائدے میں ہے اور نہ ماں باپ کے۔ البتہ ماں باپ کی اس معاملے میں بلا واسطہ دخالت بھی درست نہیں ہے۔

اگر ماں باپ اپنے بچوں کے لیے ایک اچھا اور نیک دوست مہیا کر سکیں تو انہوں نے بچے کی بھلائی کا انتظام کیا ہے اور اُسے تباہی کے راستے سے بچا رہا ہے۔ لیکن یہ بھی کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جب اچھے بڑے کی کچھ تمیز کرنے لگے تو اُسے پیار محبت سے لگا لے اچھے اور بُرے دوست کی صفات بتائیں۔ بُرے بچوں کے ساتھ دوستی کے نتائج بھی اُس پر واضح کریں۔

پھر بچوں کے دوستوں اور ان کے طرز عمل پر کچھ فاصلے سے نگاہ رکھیں۔ اگر ماں باپ دیکھیں کہ ان کے دوست اچھے ہیں تو ان کی تائید و تشویق کریں اور انہیں ملنے جلنے کے مواقع فراہم کریں لیکن اگر دیکھیں کہ اُن کے بچے دھوکا کھا گئے ہیں اور بُرے بچوں کو دوست بنا رہے ہیں تو پیار محبت سے اُن کی خامیوں کی طرف متوجہ کر کے اپنے بچوں کو ان سے میل ملاقات سے روکیں۔ پیار محبت سے یہ کام نہ ہو سکے تو کچھ سختی سے منع کیا جاسکتا ہے۔

ایک اور طریقے سے بھی ماں باپ بچے کے لیے اچھے دوست کے انتخاب میں مدد کر سکتے ہیں۔ اس کے سببوں، محلے والوں، ہمایوں وغیرہ میں سے کسی اچھے دوست کو تلاش کریں اور ان کے درمیان بہتر رابطے کا وسیلہ فراہم کریں۔ اس طرح اگر وہ آپس میں دوست ہو جائیں تو ان کی تشویق کریں۔ اس طرح ماں باپ بہت اچھی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں اور بچوں کی بہت سی خامیاں اچھے دوست کے انتخاب سے دور کر سکتے ہیں۔ مثلاً وہ ماں باپ جن کا بیٹا بزدل ہے وہ اس کے لیے کوئی شجاع بچہ انتخاب کریں کہ جس سے دوستی کے ذریعے اس کی بزدلی جاتی رہے۔

بہر حال ماں باپ کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے دوستوں بالخصوص نوجوانی کے دور میں ان کے دوستوں سے غافل رہیں اور انہیں ان کے حال پر بھروسہ نہ کریں کیونکہ بچہ اور نوجوان کے لیے بدلنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ عجیب کہ عمومی اخلاق اور معاشرے کی حالت

بھی ٹیک نہ ہو تو ممکن ہے ٹھوڑی سی غفلت سے آپ کا فرزند دہلند بڑائی اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔ لہذا یاد رکھیں کہ پرہیز علاج سے کہیں بہتر ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

ہر چیز کے لیے ایک آفت ہے اور نیکی کے لیے آفتِ بڑا دوست ہے ایک صاحب لکھتے ہیں :

میرے ماں باپ مجھے دوستوں سے ملنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اگر دوست مجھے گھر پر ملنے آئے تو میں مجبور ہوتا کہ ایک دو باتیں کر کے انہیں رخصت کر دوں۔ ایک دوست ہمارے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ امی ابو اسے جانتے تھے لیکن وہ ہمیں ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کی اجازت نہ دیتے۔ مجھے بہت خواہش ہوتی کہ دوستوں سے ملوں، ان کے ساتھ بیٹھوں اور ان سے بات چیت کر دوں لیکن کیا کتا امی ابو معاملہ تھے۔ مجھے اس کا بہت غم تھا۔ ایک روز میں نے ارادہ کر لیا کہ بیسے بھی ہو دوستوں سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ میں نے امی سے کہا : یہ امتحان ہے اس کے لیے مجھے جانا ہے اجازت تو امتحان کے لیے لی لیکن اپنے دوست کے ہاں جا بیٹھا۔ اس دوست کا گھر کچھ دُور تھا۔ ایک دیگن پر بیٹھا اور اس کے ہاں چلا گیا۔ وہاں اور دوست بھی تھے۔ دن ان کے ساتھ خوب خوش گیمیں میں گزرا۔ شام واپس آیا تو امی نے کہا بہت دیر سے آئے ہو۔ پھر ایک بھوٹ کو چھانسنے کے لیے مجھے اور کئی بھوٹ بولنا پڑے۔

آج سوچتا ہوں کہ کیا امی جان کو معلوم نہ تھا کہ دوست اور رفیق کی کسی شے کو کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے اس قدر پابندیوں کو رکھا تھا۔

ایک لڑکی لکھتی ہے :

ایک مرتبہ میں نے اپنی کچھ سیلیوں کو گھر بگایا۔ اور میرے پاس جو پیسے گئے میں جمع تھے۔ وہ نکالے۔ جہاں جہاں گئی اور ان کے لیے اس کریم لائی۔ امی کہیں

لگئی ہوئی تھیں۔ سبیلیاں آئس کریم کھا رہی تھیں اور پے سے امی گھر میں داخل ہوئیں۔
 مجھے بہت خوف ہوا، خدا جانے اتنی کیا کہیں! کہیں کہ وہ تو ہمیشہ مجھے سپیلیوں
 سے ملنے سے منع کرتی رہتی تھیں۔ انہوں نے بالکل میری عزت کا خیال نہ کیا
 اور میری سپیلیوں سے کہنے لگیں، اتم نے معاملہ سے فضول خرچہ کروائی ہے۔
 سبیلیاں چلی گئیں۔ لیکن بات یہاں تک تمام نہ ہوئی۔ اتنی اگلے دن سکول جا پہنچیں۔
 میری استانی سے جاڑو سکائیت کے لمبے میں میری سپیلیوں کے بارے میں کہا
 یہ ہمارے گھر آتی ہیں اور میری بیٹی کو فضول خرچہ پر مجبور کرتی ہیں۔ کل میری بیٹی سے
 آئس کریم کھا رہی تھیں۔ سبیلیاں جو میری ہم کلاس بھی تھیں وہ کہنے لگیں۔ آنٹی کل
 والی آئس کریم کے پیسے ہم دے دیتی ہیں۔ مجھے اتنی شرم آئی دل چاہتا تھا کہ
 زین چھٹ جائے اور میں غرق ہو جاؤں۔ وہ دن اور آج کا دن پھر میں سکول نہیں
 جاسکی۔ سبیلیاں اگلی کلاسوں میں جا پہنچیں۔ اور میں پشیمان پشیمان سی۔ سہمی سہمی سی۔
 اداس اداس سی آج ان سے کہیں پیچھے رہ گئی ہوں۔

بچہ اور دینی تعلیم

اللہ اور دین کی طرف توجہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اس کا سرچشمہ انسان کی اپنی سرشت ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے،

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا

اپنا رخ دینِ سقیم کی طرف کرلو — وہی دین کہ جو فطرتِ الہی کا حامل ہے اور

وہی فطرت کہ جس کی بنیاد پر اس نے انسان کو خلق فرمایا ہے۔ (روم - ۳۰)

ہر بچہ فطری طور پر خدا پرست ہے لیکن خارجی عوامل اثر انداز ہو جائیں تو صورت بدل جاتی ہے جیسا کہ

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمایا ہے،

كُلُّ مَوْلُودٍ يُفْطَرُ عَلَى فِطْرَةِ الْإِسْلَامِ

ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے مگر بعد ازاں اس کے ماں باپ اسے

یہودی، عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں یہ

ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے ایسا ماحول پیدا کریں کہ اس میں

فطری طور پر ودیعت کیے گئے عقائد نشوونما پاسکیں۔ انسان بچپن ہی سے ایک ایسی قدرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ جو اُس کی ضروریات پوری کر سکے۔ لیکن اُس کا ادراک اس حد تک نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مرکوز شدہ توجہ کو جان کر سکے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ توجہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو بچہ ایک مذہبی گھرانے میں پرورش پاتا ہے وہ کوئی چار سال کی عمر میں اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور یہ وہ عمر ہے جس میں بچے کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات ابھرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اللہ کا نام زبان پر لاتا ہے۔ اس کے سوالوں اور باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت بیدار ہو چکی ہے اور وہ اس سلسلے میں زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

بچہ سوچتا ہے کہ :

- سورج کس نے بنایا ہے ؟
- چاند تارے کس نے پیدا کیے ہیں ؟
- کیا اللہ تعالیٰ مجھ سے پیار کرتا ہے ؟
- کیا اللہ تعالیٰ میٹھی چیزیں پسند کرتا ہے ؟
- بارش کون برساتا ہے ؟
- ابو کو کس نے پیدا کیا ہے ؟
- کیا اللہ ہماری باتیں سنتا ہے ؟
- کیا ٹیلی فون کے ذریعے اللہ سے باتیں کی جاسکتی ہیں ؟
- اللہ کہاں رہتا ہے ؟
- اس کی شکل کس طرح کی ہے ؟
- کیا خدا آسمان پر ہے ؟

چار سال کے بعد بچے اس طرح کے ہزاروں سوال کرتے اور سوچتے ہیں۔

ان سوالات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی فطرت خدا پرستی بیدار ہو چکی ہے اور وہ یہ باتیں پوچھ کر اپنی معلومات مکمل کرنا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ننھا ننھا بچہ خدا کے بارے میں کیا تصور رکھتا ہے۔ شاید وہ یہ سوچتا ہے کہ خدا اُس کے ابو کی طرح ہے لیکن اس

سے بڑا اور زیادہ طاقتور ہے۔ بچے کا شعور جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے، خدا کے بارے میں اس کی شناخت بڑھتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ماں باپ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے عقائد کی تکمیل میں بہت اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر انہوں نے کوتاہی کی تو روز قیامت ان سے باز پرس کی جائے گی۔ ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کے تمام سوالوں کا جواب دیں اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو بچے کی روح تحقیق مر جائے گی۔ لیکن بچے کے سوالوں کا جواب دنیا کوئی انسان کام نہیں۔ جواب صحیح، مختصر اور سچے کے لیے قابل فہم ہونا چاہیے۔ بچے کا شعور جس قدر ترقی کرتا جائے جواب بھی اسی قدر عین ہونا چاہیے۔ یہ کام ہر ماں باپ نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے سے اس کے لیے تیاری کریں زیادہ گہرے اور صبر آزا مطلب بیان نہ کریں کیونکہ یہ نہ فقط بچے کے لیے سودمند نہ ہوں گے بلکہ ناقابل فہم اور پریشان کن بھی ہوں گے۔ چھوٹا بچہ مشکل مطالب نہیں سمجھ پاتا لہذا اس کی طبیعت اہم اور صلاحیت کے مطابق اسے دینی تعلیم دی جانا چاہیے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

بچہ تین سال کا ہو جائے تو اسے "لا الہ الا اللہ" سکھائیں۔ پھر اسے چھوڑ دیں۔ جب اس کی عمر تین سال، سات ماہ اور بیس دن ہو جائے تو اسے "محمد رسول اللہ" یاد کروائیں پھر چار سال تک اسے چھوڑ دیں جب چار سال کا ہو جائے تو اسے پیغمبر خدا پر درود بھیجا سکھائیں۔

بچوں کو چھوٹے چھوٹے اور سادہ دینی اشعار یاد کروانا ان کے لیے مفید اور لذت بخش ہوتا ہے۔ اسی طرح انہیں آہستہ آہستہ نبوت اور امامت کے بارے میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بتائیں کہ اللہ نے انہیں نبی بنا کر بھیجا تاکہ ہماری ہدایت کریں۔ پھر ان کی خصوصیات اور کچھ واقعات بتائیں۔ پھر عمومی نبوت کا مفہوم بتائیں اور نبوت کی ضروری ضروری شرائط سے انہیں آگاہ کریں اور یوں ہی امامت کے بارے میں بھی سمجھائیں۔

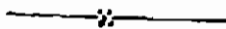
پھوٹے پھوٹے واقعات کے ذریعے کہانی کی صورت میں پیار سے یہ باتیں کریں گے تو بہت خوش ہوں گی۔

ماں قیامت کے بارے میں بچہ جلد ہی متوجہ نہیں ہوتا وہ سوچتا ہے کہ وہ اور اس کے ماں باپ ہمیشہ یوں ہی رہیں گے۔ مرنے کو وہ ایک لمبے سفر کی طرح خیال کرتا ہے۔ جب تک بچہ موت کی طرف متوجہ نہ ہو تو ضروری نہیں ہے بلکہ شاید مناسب بھی نہیں کہ اس سے اس سلسلے میں بات چیت کی جائے۔ البتہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں کہ ماں باپ کو مجبوراً ان کے سامنے موت کی حقیقت کے بارے میں کچھ اظہار کرنا پڑ جاتا ہے۔ ممکن ہے کسی رشتے دار، دوست یا جان پہچان والے شخص کی موت بچے کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ مثلاً خدا نخواستہ بچے کے دادا وفات پا جائیں اور وہ پوچھے کہ:

امی دادا اب کہاں چلے گئے ہیں؟

ایسے موقع پر بچے کو حقیقت بتا دینی چاہیے۔ بھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ بچے سے یہ کہا جاسکتا ہے تمہارے دادا جان وفات پا گئے ہیں، وہ دوسری دنیا میں چلے گئے ہیں ہر مرنے والا اس دنیا میں چھو جاتا ہے۔ اگر کوئی نیک ہو تو جنت کے خوبصورت باغوں میں خوشی خوشی رہے گا اور اگر کوئی بُرا ہو تو جہنم کی آگ میں وہ اپنی سزا جگتے گا۔ بچے کو موت کا یہ معنی رفتہ رفتہ سمجھایا جائے کہ یہ ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف انتقال ہے۔ اُسے جنت، دوزخ، حساب کتاب اور قیامت کے بارے میں سادا سادا اور مختصر طور پر بتایا جانا چاہیے۔

تربیت عقائد کا یہ سلسلہ پرائمری، مڈل، ہائی اور پھر ہائی سطح تک جاری رہنا چاہیے۔



بچہ اور فرائض دینی

یہ درست ہے کہ بڑا کم پندرہ سال کی عمر میں اور بڑی نو سال کی عمر میں مکلف ہوتے ہیں اور شرعی احکام ان پر لاگو ہو جاتے ہیں۔ لیکن دینی فرائض کی انجام دہی کو بلوغت تک ٹالا نہیں جاسکتا۔ انسان کو بچپن ہی سے عبادت اور دینی فرائض کی انجام دہی کی عادت ڈالنی چاہیے تاکہ بالغ ہوں تو انہیں شوق سے بجالائیں خوش قسمتی سے ایک مذہبی گھرانے میں پرورش پانے والا بچہ تین سال کی عمر ہی سے اپنے مالِ باپ کی تقلید میں بعض مذہبی کام بجالاتا ہے۔ کبھی ان کے یہ جائے نماز بچاتا ہے، کبھی ان کے ساتھ سجدے میں جاتا ہے، اُمّ اکبر اور لا الہ الا اللہ کہتا ہے چھوٹے چھوٹے مذہبی اشعار مزے مزے سے پڑھتا ہے۔ فرض شناس اور سمجھ دار مالِ باپ بچے کی ان فطری حرکات سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان پر مسکرا کر اور اظہارِ مسرت کر کے اسے تقویت کرتے ہیں۔ اگر زبردستی یہ چیزیں بچے پر ٹھونس دی جائیں تو بہت مفید ہوتی ہیں۔ اس عمر میں مالِ باپ کو نہیں چاہیے کہ بچے کو سکھانے اور نماز پڑھانے وغیرہ کے امور میں جلدی کریں یا ان پر دباؤ ڈالیں۔ پانچ سال کی عمر کے قریب بچہ سورۃ فاتحہ وغیرہ یاد کر سکتا ہے آہستہ آہستہ یاد کروانا شروع کریں اور پھر سات سال کی عمر میں اسے حکم دیں کہ وہ باقاعدہ نماز پڑھا کرے۔ اول وقت میں خود بھی نماز پڑھا کریں اور بچوں کو بھی اس کی نصیحت کریں۔ نو سال کی عمر میں انہیں حتمی طور پر نماز پڑھنے کی تلقین کریں۔ انہیں سمجھائیں کہ سفر حضر میں نماز پڑھا کریں۔ عمل نہ کرے تو سستی بھی کریں اور اس سلسلے میں کوئی سستی نہ کریں۔ اگر مالِ باپ خود نمازی ہوں تو آہستہ آہستہ بچوں کو بھی اس کا عادی بنا سکتے ہیں اور چھوڑ دینا سن بلوغ تک پہنچ کر خود

بخود شوق و ذوق سے نماز پڑھنے لگیں گے۔ اگر ماں باپ نے یہ غدر سبھا کہ بچہ ابھی چھوٹا ہے، بالغ نہیں ہوا اور اس پر نماز ابھی فرض نہیں ہوئی لہذا اسے کچھ نہ کہیں تو پھر بالغ ہو کر بچے کے لیے نماز پڑھنا مشکل ہو گا۔ کیوں کہ جس عمل کا انسان بچپن میں عادی نہ ہوا ہو بڑے ہو کر اسے اپنا مشکل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہارؑ نے چھ یا سات سال کی عمر میں بچے کو نماز پڑھنے کا عادی بنانے کا حکم دیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:
ہم اپنے بچوں کو پانچ سال کی عمر میں نماز پڑھنے پر آمادہ کرتے ہیں اور سات سال کی عمر میں انہیں نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں۔
پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

جب آپ کے بچے چھ سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دیں اور سات سال کے ہو جائیں تو انہیں اس کے لیے زیادہ تاکید کریں اور اگر ضرورت ہو تو مار پیٹ سے بھی انہیں نماز پڑھوائیں۔

امام باقر علیہ السلام یا امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:
جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے کہیں کہ منہ ہاتھ دھوئے اور نماز پڑھے لیکن جب ۹ سال کا ہو جائے تو اسے صبح اور مکمل وضو کھائیں اور سختی سے نماز پڑھنے کا حکم دیں۔ ضرورت پڑے تو اسے مار پیٹ کے ذریعے بھی نماز پڑھنے پر مائل کیا جاسکتا ہے۔
امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

جب بچہ چھ برس کا ہو جائے تو ضروری ہے کہ وہ نماز پڑھے اور جب وہ روزہ

۱۔ وسائل، ج ۳، ص ۱۲

۲۔ مستدرک، ج ۱، ص ۱۱۱

۳۔ وسائل، ج ۳، ص ۱۳

رکھ سکتا ہو تو ضروری ہے کہ روزہ رکھتے رہے۔

روزے کے مسئلے میں بچے کو آہستہ آہستہ عادت ڈالنا چاہیے۔ جو بچہ سن تیز کو پہنچ چکا ہو اسے سحری کے لیے بیدار کریں تاکہ وہ ناشتے کی جگہ سحری کھائے اور اس کا عادی ہو جائے۔ جب بچہ روزہ رکھ سکتا ہو تو ضروری ہے کہ اسے اس کی ترغیب دی جائے اور اگر وہ روزہ رکھ کر اسے بھانڈا پارہا ہو تو اسے درمیان میں کچھ کھانے پینے کو دیا جاسکتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے روزوں کی تعداد بڑھائی جائے البتہ اس کی طاقت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے بچہ بالغ ہو جائے تو اسے کہا جائے کہ تم پر فرض ہے کہ روزہ رکھو اور غار پڑھو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گنہگار ہو گے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے روزے کی فضیلت اور ثواب بھی بتایا جائے تاکہ اس میں برداشت کرنے کی قوت بڑھے۔ رمضان المبارک کے آخری ایام میں بچے کی دیگر ذمہ داریوں میں کمی کی جانا چاہیے تاکہ وہ آرام سے روزہ رکھ سکے۔ آخر رمضان المبارک میں اسے انعام کے طور پر بھی کچھ دیں۔ دن میں دھیلا رکھیں کہ کہیں چھپ چھپا کر روزہ تو پڑے۔

ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ بلوغ سے پہلے بچے کو احکام کی علامتوں سے آگاہ کریں۔ غسل اور استنجاء کے بارے میں اسے بتائیں۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ اگر ماں باپ کی خواہش ہے کہ ان کے بچے اہل مسجد ہوں اور دینی محافل کی طرف راغب ہوں تو پھر بچپن ہی سے انہیں اس کا عادی بنائیں۔ مسجد اور دینی محفل میں انہیں اپنے ہمراہ لے جایا کریں تاکہ ان میں بھی اس کا شوق پیدا ہو جائے ورنہ بڑے ہو کر وہ رغبت سے ایسی محفلوں میں نہیں جایا کریں گے۔

آخر میں اس بات کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ بچہ بالغ ہونے سے پہلے مکلف نہیں ہوتا اور مذہبی فرائض اس پر جائز نہیں ہوتے اور اس میں ترک کرنے پر اسے گناہ نہیں ہوگا مگر ماں باپ کو حتیٰ نہیں پہنچتا کہ وہ بلوغ سے پہلے بچوں کو آزاد چھوڑ دیں کہ وہ جو چاہیں کرتے چلیں۔ کیونکہ نماز روزہ اس پر واجب نہ ہی ہو تو اگر وہ کسی کاشیہ شہ توڑا اُسے کسی کے جہانی معصوم کو نقصان

پہنچائے شلگسی کا کان کاٹ دے، آنکھ اندھی کر دے یا ہاتھ توڑ ڈالے تو واجب ہے کہ بالغ ہو کر اس کی شرعی دیت ادا کرے۔

دوسری طرف اگر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو اس کے جی میں اُسے کرے تو پھر بڑا ہو کر صحت مند گناہ اور غلط کاموں کا عادی ہو گا کیونکہ بالغ ہو کر پھر وہ بچپن کا طرز عمل نہیں چھوڑے گا۔ لہذا ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ اُسے بچپن ہی سے واجبات اور محرمات کی حدود سے آگاہ کریں۔ حرام کام انجام دینے سے روکیں اور واجب کام کی انجام دہی میں اس کی مدد کریں۔

سیاسی اور سماجی تربیت

آج کے بچے کل کے جوان ہیں۔ ملک انہیں کا مال ہے۔ اور انہیں کو کل ملک کا نظام چلانا ہے۔ ان کی سیاسی آگاہی اور شعور ملک کے مستقبل پر اثر انداز ہو گا۔ یہی ہیں کہ جنہیں ملک کی ثقافتی اور اسلامی دولت کی پاسداری کرنا ہے۔ اور ملک کی عظمت و سر بلندی کے لیے انہیں کو کوشش کرنا ہے۔ انہیں کو سماجی اور استعماری قوتوں کے ظلم و ستم کا مقابلہ کرنا ہے۔ بچوں کو آج ہی اس مقصد کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ ان کی تربیت کرنا چاہیے اور یہ بھاری ذمہ داری بھی ماں باپ کے کندھوں پر عائد ہوتی ہے۔

سیاسی و سماجی تربیت کی بنیاد بھی بچپن ہی میں رکھی جانا چاہیے تاکہ وہ زیادہ تر بخش ہو۔ جب بچہ سن تیز کو پہنچے تو اُسے اُس کے فہم و شعور کی حد تک سیاسی و سماجی مسائل کو سمجھنا چاہیے۔ اُسے اقتصادی اور سیاسی حالات کو آہستہ آہستہ جاننا چاہیے۔ ملک کے فقر محرومیت اور پسماندگی کی وجوہات تدبیر کیا جائے سمجھائی جانا چاہئیں۔ حکمرانوں کی اچھائیاں اور بُرائیاں بچوں سے بیان کی جاسکتی ہیں۔ اور نظام کس طرح سے چلتا ہے انہیں سمجھایا جاسکتا ہے گاؤں، شہر اور ملک کی عمومی حالت اس سے بیان کی جاسکتی ہے۔ بچہ انتخابات میں شرکت نہیں کر سکتا، لیکن ماں باپ انتخابات میں شرکت کی خصوصیات اور شرائط کی اُس کے سامنے وضاحت کر سکتے ہیں۔ اور اسے سمجھا سکتے ہیں کہ کس طرح کے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیے۔ مثلاً اس سے کہہ سکتے ہیں ہم نے فلاں شخص کو ووٹ دیا ہے کیونکہ اس میں فلاں خوبی ہے۔ بچہ بھی جیسے جیسے بچوں میں شرکت کر سکتا ہے۔ وہ بھی نمبر لگا سکتا ہے۔ تقریریں سن سکتا ہے۔

استبدادات تقسیم کر سکتا ہے۔ اور دیوار فریسی (وال چانگ) کر سکتا ہے۔ اور یہ کام اس کے لیے فوٹر بھی ہوں گے۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ بچے اور نوجوان بھی سیاسی امور میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہی تو تھے کہ جنہوں نے اپنے نعروں، جلسے جلوسوں اور ہڑتالوں سے طاغوت کی آکر کار خود غرض حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں نے انقلابیوں کو تقویت بخشی اور ایران کی مسلمان ملت کی مظلومیت اور شاہی حکومت کے لہجہوں کے ظلم و خیانت کو دنیا والوں کے کانوں تک پہنچایا۔ سب جانتے ہیں کہ ایران کے عظیم انقلاب کی کامیابی کا اہم حصہ نوجوانوں ہی کی فعال اور متحرک قوت اور انہیں کی جانثاریوں کا مرہون منت ہے۔

چاہیے کہ بچے سیاسی واقعات کا مطالعہ کر کے، اخبارات و جرائد کو پڑھ کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سیاسی اور سماجی پروگرام سن اور دیکھ کر ماں باپ اور دوسرے بچوں سے بات چیت کر کے تدریجاً سیاسی رشد پیدا کریں۔ اور اپنے اور اپنے ہم وطنوں کے مستقبل کے بارے میں دہشی پیدا کریں۔ انہیں جاننا چاہیے کہ مستقبل میں ان کے وطن کی تقدیر ان کے اور ان کے ہم سن بچوں اور نوجوانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ بچے کو سمجھنا چاہیے کہ دنیا آخرت سے اور دین سیاست سے جدا نہیں ہے۔ اور لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے سماجی اور دنیاوی امور میں غفلت رہیں تاکہ ملک آباد اور ملت باشعور بنے۔

نوجوانی اور جوانی میں اولاد کو نسبتاً زیادہ آزادی ملنی چاہیے تاکہ وہ خود باتا ہو سیاسی اور سماجی امور میں شہرت کریں۔

بچہ اور ریڈیو۔ ٹی۔ وی

ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما بہت ہی سودمند ایجادات ہیں۔ ان کے ذریعے سے تعلیم و تربیت کی جاسکتی ہے۔ لوگوں کے انکار کو جلا بخشی جاسکتی ہے۔ دینی و اخلاقی اقدار کو رائج کیا جاسکتا ہے زرعی اور صنعتی شعبوں میں راہنمائی کی جاسکتی ہے صحت و صفائی کے امور پر رشد پیدا کیا جاسکتا ہے۔ سیاسی اور سماجی حوالے سے عوام کی سطح معلومات کو بلند کیا جاسکتا ہے۔

انسان عوامی رابطے کے ان وسائل سے سینکڑوں قسم کے فائدے اٹھا سکتا ہے البتہ یہ وسائل جس قدر مفید ہو سکتے ہیں اُسی قدر ان سے سوء استفادہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ وسائل نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں آجائیں تو وہ غلط راستے پر ڈال دیں گے اور ان کے ذریعے سے عوام کو صحت، ثقافت، دین، اخلاق، اقتصاد اور سیاست کے حوالے سے سینکڑوں قسم کے نقصانات پہنچائیں گے۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی تقریباً عمومی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اب ہر گھر میں جا پہنچا ہے۔ بیشتر لوگ اسے ایک تفریح اور مشغولیت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور انہیں دیکھنا اور سننا پسند کرتے ہیں خصوصاً بچے اور نوجوان ان سے بہت دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

باخبر لوگوں کی رائے کے مطابق ایرانی بچے امریکہ، فرانس، برطانیہ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ملکوں کے بچوں کی نسبت ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایران میں ۲۰۷ کے ناظرین میں سے چالیس فیصد بچے ہیں تیس فیصد نوجوان ہیں جب کہ بچپن

اور نوجوانی کی عمر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے حساس ترین دور ہوتا ہے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن کے پروگرام اچھے ہوں یا بُرے ہاں شک ان کی حساس روح پر بہت اثر کرتے ہیں۔ اور انہیں سطحی اور بے اثر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بچے کو آزادی نہیں دی جاسکتی کہ وہ ہر طرح کا پروگرام دیکھے یا سنے۔ کیونکہ بعض پروگرام بچے کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کاش ریڈیو اور ٹی وی کے اہل کار یہ جانیں کہ وہ کس حساس منصب پر کام کر رہے ہیں اور کتنی عظیم ذمہ داری ان کے دوش پر ہے۔ افراد ملت خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا حصہ انہیں کے ذمہ ہے۔ ماں باپ بھی اس سلسلے میں متعلق نہیں رہ سکتے اور بچوں کو ہر طرح کا پروگرام سننے اور دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

ریڈیو، ۲۰۷ کے پروگراموں کا ایک حصہ ایسی کہانیوں اور فلموں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں قتل، ڈاکہ، چوری، جرم، اغوا، لڑائی جھگڑا، تشدد، فریب، دھوکا وغیرہ جیسی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ بچے ایسی کہانیوں اور فلموں کے شوقین ہوتے ہیں اور ان سے بہت لطف اٹھاتے ہیں۔ جب کہ ایسی فلمیں اور کہانیاں بچوں کے لیے کئی جہات سے نقصان دہ ہیں۔ مثلاً ۱۔ بچوں کی حساس اور لطیف روح کو بڑی شدت سے تحریک کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی وجہ سے بچوں کے اندر ایک اضطراب اور خوف و دہشت کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ہو سکتا ہے وہ رات کو ڈراؤنے خواب دیکھیں اور سوتے میں چیخ ماریں۔ ہو سکتا ہے انہیں سرور دلاحتی ہو جائے اور یہاں تک ممکن ہے کہ وہ ایسی فلمیں دیکھتے ہوئے بے ہوش ہو جائیں یا ان پر سکتہ قاری ہو جائے۔

۲۔ ایسی فلموں سے ہو سکتا ہے کہ اخلاق کے حوالے سے نقصان دہ اثرات مرتب ہوں۔ اور بچوں کی پاک طبیعت کو وہ گناہ اور برائیوں کی طرف کھینچ لائیں۔ ہو سکتا ہے کہ بچے ان سے اس قدر متاثر ہوں کہ ان کے ہیر وکی تقلید کریں۔ اور جرم، قتل اور چوری کرنے لگیں۔

یونیسکو نے اس سلسلے میں جو تفصیل جاری کی ہے اس کے مطابق اسپین میں ۱۹۴۴ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک سزا پانے والے بچوں میں سے ۲۷ فیصد نے جرائم پر مبنی فلموں سے متاثر

ہو کر جرم کیا ہے۔

امریکہ میں وسیع پیمانے پر ہونے والی تحقیقات کے مطابق مجرم بچوں میں سے دس فیصد لڑکے اور پچیس فیصد لڑکیاں جرائم سے بھرپور نہیں دیکھ کر مجرم بنتی ہیں۔ یہ اعداد و شمار واقعات پر کر رکھ دینے والے ہیں۔

بلا مرد و پانزر کے نظریے کے مطابق ۷۴.۹٪ مجرم فلموں سے متاثر ہو کر اپنے ساتھ اسلحہ رکھتے ہیں۔ ۲۸٪ چوری کرنے اور ۲۱٪ فیصد قانون کی گرفت سے بھاگنے اور پولیس کو چکر دینے کے طریقے انہی فلموں سے سیکھتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ۲۵٪ عورتیں بڑی فلموں کے زیر اثر برائی اور بدکاری کی راہ پر چل پڑی ہیں نیز ۵٪ عورتیں لاپرواہ فلمی ستاروں کی تقلید میں قحبہ خانوں اور برائی کی فلموں کی زینت بنی ہیں۔

یونیورسٹی لاس اینجلس کے ایک پروفیسر واکس مین کہتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹی وی کی سکرین سے نکلنے والی ایکٹر کی مغناطیسی لہریں (MAGNETIC WAVES-MAGNETIC) انسانی آرگنزم (MAGNETIC)

پر بہت اثر کرتی ہیں۔ ٹیلی ویژن یا ریڈیو یا گھر کی ضرورت کی بجلی کی چیزوں سے نکلنے والی لہریں شارٹ ویوز کی قسم میں سے ہیں۔ اور اس کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کے سر میں درد ہوتا ہے اور سر چکرانے لگتا ہے۔ اس سے انسان کی فکری صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ تبدیل ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں سبجان پیدا ہوتا ہے اور خون کے سفید خلیوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ لہریں انسان کے نظام اعصاب پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہیں اور مختلف بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں۔

۱۔ مجلہ، مکتب اسلام، جلد ۵، شمارہ ۱۱

۲۔ مجلہ، مکتب اسلام، جلد ۵، شمارہ ۱۱

۳۔ مجلہ، مکتب اسلام، جلد ۱۸، شمارہ ۱

ڈاکٹر الکسز کارل لکھتے ہیں:

ریڈیو۔ ٹی وی اور نا سب کھیل ہمارے بچوں کے جذبات کو تباہ کر دیتے ہیں۔

روزنامہ اطلاعات اپنے شمارہ ۲۳، ۱۵ میں ایک یورپی طالب علم کے بارے میں لکھتا ہے:

کالج کے ایک اٹھارہ سالہ طالب علم کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس پر الزام ہے کہ اُس نے ایک فلمی اداکار والٹر کاٹر کے بیٹے کو اغوا کیا اور پھر دھکی دی کہ اُسے ایک لاکھ پچاس ہزار ڈالر ہینچا دیے جائیں ورنہ وہ اسے قتل کر دے گا۔ مزم نے عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ قتل کی دھمکی دے کر خندہ نمیکس وصول کرنے کا خیال اس کے ذہن میں ٹیلی ویژن کی ایک فلم دیکھتے ہوئے پیدا ہوا۔

اس سلسلے میں پولیس کا کہنا یہ ہے کہ ایسے بہت سے کیس ہمارے پاس پہنچے ہیں کہ نوجوانوں نے ٹیلی ویژن سے جرم کا ارتکاب کرنا سیکھا ہے مثلاً یہی ایک دس سالہ بچے نے کراٹے کی ایک فلم دیکھنے کے بعد اپنے اٹھ سالہ دوست کو گلوگ مار کر مار ڈالا۔

تعلیم و تربیت کے نائب وزیر جناب صفی نیا کہتے ہیں:

جب ٹی وی بڑی کادرس دے رہا ہو تو بہترین استاد بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

کیوبا کے ایک پندرہ سالہ لڑکے رونی نامور نے ایک ۸۳ سالہ بوڑھی عورت کو قتل

۱۔ کتب اسلام، جلد ۱۵، شمارہ ۳

۲۔ کتب اسلام، جلد ۱۵، شمارہ ۱۱

۳۔ کتب اسلام، جلد ۱۵، شمارہ ۱

کر یا اس نے یہ جرم فلورڈین انجام دیا۔ اور اب وہ اس شہر کی ایک جلی میں اس جرم کی سزا کے طور پر عر قید کاٹ رہا ہے۔ اس کے والدین نے اس کی ٹیلی ویژن کے تین چینلوں کے خلاف دو کروڑ پچاس لاکھ ڈالر ہرجانے کا دعویٰ دائر کیا ہے۔ انہوں نے عدالت میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جو شواہد پیش کیے ہیں ان کے مطابق بچے نے آدم کشی کا سبق اسی ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے سیکھا ہے۔ گذشتہ ستمبر عدالت میں اس کیس کی سماعت ہوئی اس موقع پر یہ بات سامنے آئی کہ مدم جب بچہ تھا تو آیا اسے چپ کرانے کے لیے ٹی۔وی کے سامنے بٹھا دیتی۔ اس سے اس میں ٹیلی ویژن دیکھنے کا بہت شوق پیدا ہو گیا وہ روزانہ آٹھ آٹھ گھنٹے ٹیلی ویژن پروگرام دیکھتا رہتا۔ اسے ٹی۔وی کے پروگراموں سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی خاص طور پر پولیس کو جاک "نامی سیریز سے وہ بہت متاثر تھا از کتاب جرم سے ایک رات پہلے اس فلم میں دکھایا گیا کہ کس طرح سے ایک امیر عورت کو لوٹا گیا۔

ایک لڑکی جس کا نام رضائیہ تھا۔ پندرہ سال اس کی عمر تھی بہت خوبصورت لڑکی تھی ٹیلی ویژن پر ایک پریسجیا فلم دیکھتے ہوئے اس پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ زمین پر گری اور سر گئی۔ جب اس نے فلم میں دیکھا کہ ایک سفید فام شخص ایک سیاہ فام کے سر کی چوڑی ادھیڑ نے لگا ہے تو اس نے ایک چیخ ماری۔ پھر اس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔

اعصاب اور نفسیات کے ماہر ڈاکٹر جلال بریلانی کہتے ہیں :

خوفناک، ڈراؤنی اور ہیجان انگیز فلمیں بچوں کی نفسیات پر نامطلوب اثر ڈالتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک بچہ مار دھاڑ سے بھر پور فلم دیکھنے کے بعد فلم کے ہر ایک تقلید میں اپنے چھوٹے بھائی یا بہن کو قتل کر دیتا ہے۔ ایسی فلمیں بچے کی آئندہ شخصیت پر بڑے اثرات مرتب کرتی ہیں خوفناک فلموں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے ہو کر ان کے اندر بڑی پیدا ہو جاتی ہے، مار دھاڑ کی فلمیں آئندہ کی زندگی میں ماہنیں بھی ایسا ہی بنا دیتی ہیں۔ ان کے اثرات انسان کی روح پر رہتے ہیں اور پھر جہاں موقع ملتا ہے کسی غلط واقعہ کی صورت میں

نودار ہوتے ہیں اور انسان کو بُرائی کی طرف کھینچتے ہیں۔

نقیات کے ڈاکٹر شکر اللہ طریقتی کہتے ہیں:

بُری فلموں کا اثر بچے کے مستقبل پر ناقابل انکار ہے۔ یہ فلمیں بچوں کی نقیات پر ایسا نامطلوب اثر ڈالتی ہیں کہ باغ ہو کر حبس مناسب موقع ملتا ہے اور دوسرے اسباب بھی فراہم ہو جاتے ہیں تو وہ خطرناک کاموں کی انجام دہی کی صورت میں اس کی مدد کرتا ہے۔ لہذا میں ماں باپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو ہرگز اجازت نہ دیں کہ وہ غلط فلمیں دیکھیں۔ خاص طور پر وہ فلمیں جو بڑے دل کے لیے مخصوص ہیں خصوصاً رات کے دس بجے کے بعد آنے والی فلموں کی اجازت نہ دیں۔ اگر بچے ایسی فلمیں دیکھنے کے لیے مذکوریں اور والدین انہیں اس کی اجازت نہ دیں تو اولاد کے حق میں یہ ان کی محبت ہے۔

تہران یونیورسٹی کے ایک استاد اور جرم شناس ڈاکٹر رضا مظلومی کہتے ہیں:

ٹیلی ویژن اور سینما گھروں میں دکھائی جانے والی بہت سی فلمیں ہمارے معاشرے کے لیے خطرناک ہیں۔ ان کے خطرات اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ گیارہ سالہ بچی کو انہوں نے زندگی سے محروم کر دیا اور اس کے دل کو دھڑکن کو بند میں جلا کر مندی کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ میرے حاضرین دنیا میں ہونے والے بہت سے جرائم اور مظالم انہیں فلموں کے بُرے اثرات کی وجہ میں ملے۔

نیو یارک کے ایک ہسپتال میں کام کرنے والے ڈاکٹر ارنالڈ فریانی نے جدید ترین الیکٹرونک آلات اور تجربات سے یہ ثابت کیا ہے کہ روحانی اور فکری کمزوری اور شدید سر درد ریڈیو پر نشر ہونے والی موسیقی کے سننے سے پیدا ہوتے ہیں۔

اخبار ٹائمز اپنے ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں لکھتا ہے:

بچوں کی بیماریوں کے ماہر ڈاکٹر نے فضا ئیہ کی دو چھاؤنیوں میں اس بات کو محسوس کیا کہ اس علاقے میں کام کرنے والے افسران کے بچے کہ جن کی عمر ۳ سال سے بارہ سال کے درمیان ہے ہمیشہ در دسہا بے خوابی، معدہ کی گڑبڑ، تھکے، پیمیش اور دیگر بیماریوں میں گھرے رہتے ہیں۔ طبی نقطہ نظر سے اس بیماری کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ لیکن مکمل طور پر تحقیق کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ تمام بچے نیلی ویشن کے طویل پروگرام دیکھنے کے عادی ہیں اور ہر روز سہ گھنٹے سے سہ گھنٹے تک ٹی۔ وی پروگرام دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ول نے ان کے لیے صرف یہی علاج متعین کیا کہ ان کو ٹی۔ وی پروگرام دیکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ علاج کیا اور ٹوٹ بھی رہا۔ سر درد، تھکے، پیمیش اور باقی تمام بیماریاں ختم ہو گئیں۔

لہذا جن والدین کو اپنے بچوں سے محبت ہے وہ انہیں دن رات ریڈیو اور ٹیلی ویژن سننے اور دیکھنے کی اجازت نہ دیں۔ صرف ان پروگراموں کو دیکھنے کی اجازت دیں جن سے بچوں کو کوئی نفسیاتی، روحانی اور اخلاقی نقصان نہ پہنچے۔

جنسی مسائل

جنسی قوت انسان کی انتہائی قوی اور حساس جبلتوں میں سے ہے۔ یہ قوت انسان کے لیے بہت تعمیری ہے۔ انسان کی نفسیاتی اور جسمانی زندگی کے لئے اس کے اچھے یا بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں انسان کے بہت سے اعمال ، یہاں تک کہ متعدد جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کی بنیاد یہی جبلت ہوتی ہے اگر انسان کی پرورش کا فائدہ اور درست ہو تو یہ قوت انسان کی خوشی اور آرام کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور اگر تربیت میں افراط یا تفریط ہو تو ممکن ہے سینکڑوں جسمانی اور نفسیاتی نقصانات کا سبب بنے۔ اور انسان کی دنیا و آخرت کو تباہ کر دے۔

ایسا نہیں ہے کہ جنسی قوت بلوغت کے زمانے میں پیدا ہوتی ہو۔ بلکہ یہ بچپن ہی سے انسانی طبیعت میں خوابیدہ ہوتی ہے۔ اور مختلف شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ چھوٹے بچے اپنے اَلَمَناسل کو چھو کر لذت محسوس کرتے ہیں اور اس سے ان کے اندر ایک تحرک کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ والدین کے اظہار محبت اور بوسوں سے لذت محسوس کرتے ہیں۔ وہ خوبصورتی اور بد صورتی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کبھی زبان سے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ دو تین سال کی عمر میں وہ لڑکے اور لڑکی میں فرق سمجھنے لگتے ہیں اور بڑی توجہ اور جستجو سے ایک دوسرے کی شرم گاہ کو دیکھتے ہیں۔ جب کچھ بڑے ہو جائیں تو وہاں تصویریں انہیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ وہ حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتے ہیں۔ زبان سے فحش اور گندے مذاق کرتے ہیں اور ان پر خوش ہوتے ہیں جس مخالف کی طرف انہیں کچھ کچھ میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انہیں اپنی طرف

متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ تصریحاً یا اشارۃً جنسی امور کے بارے میں والدین سے سوال کرتے ہیں۔ ماں باپ کی سسرگویشوں کی طرف وہ کان دھرتے ہیں اور ان کے کاموں پر نظر رکھتے ہیں۔ اپنے دوستوں اور ہم عمروں سے گوشہ و کنار میں بیچ کر راز دنیاد کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جنسی قوت نابالغ بچوں میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن بہم اور تاریک صورت میں۔ بغیر آگاہی اور کامل شعور کے ان کی توجہ اس کی طرف کھینچی ہے لیکن انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اس امر کی طرف ان کی توجہ ہوتی ہے کہ لذت کہاں سے حاصل ہوتی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ لذت کیسے حاصل کریں؛ دس بارہ سال کی عمر تک بچے اسی حالت میں ہوتے ہیں اور ان کی جنسی جبلت پوری طرح سے بیدار نہیں ہوتی اور ایک ایسا م کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن بارہ سے پندرہ سال کی عمر میں وہ بڑی تیزی سے پروان چڑھتی ہے اور تقریباً بیدار ہو جاتی ہے۔

فرنشناس ماں باپ اپنے بچوں کی جنسی جبلت سے لا تعلق نہیں رہ سکتے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس بارے میں کوئی حکمت عملی وضع نہ کریں۔ کیونکہ جنسی اعتبار سے تربیت و نگہار ترین اور حساس ترین تربیتوں میں سے ہے۔ اس سلسلے میں ذرہ بھر اشتباہ یا غفلت بھی ممکن ہے بچوں کو برائی اور تباہی کی وادی کی طرف کھینچ لے جائے۔

ماں باپ کی توجہ اس امر کی طرف ہونی چاہیے کہ بلوغ سے پہلے بدنی اور فکری رشد کے اعتبار سے بچے تولید نسل اور جنسی قوت کو عمل میں لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بلوغ سے پہلے ان کی جنسی جبلت کو ان کی طبیعت میں خفہ و خوابیدہ رکھا ہوتا ہے۔ بچوں کی انفرادی اور اجتماعی بھلائی بھی اس میں ہے کہ بلوغ سے پہلے ان کی جنسی قوت بیدار اور متحرک نہ ہو کیونکہ اگر جنسی قوت بلوغت سے پہلے اور جلد ہی بیدار ہو جائے تو اس سے بچے کی زندگی بہت سی مشکلات کا شکار ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے وہ اس کی بدبختی اور انحراف کے اسباب فراہم کرے۔

لہذا ماں باپ کو ہر اس عمل سے سخت پرہیز کرنا چاہیے کہ جس سے بچوں کی جنسی جبلت کو تحریک ہو سکے اور وہ بیدار ہو سکے۔ اور ان کے لیے ایسے حالات فراہم کریں کہ ان کی

نشو و نما تدربھی طور پر اور قطری لحاظ سے ہو۔ والدین اگر عقل منداھر باتدبیر ہوں تو وہ خود اس ضمن میں تمیز کر سکتے ہیں کہ کون سے کام مفید ہیں اور کون سے مضر۔ لیکن ہم یاد دہانی کے طور پر کچھ باتیں بیان کرتے ہیں بچوں کی شرمگاہ پر ہاتھ پھیرنا، وہاں پیار کرنا۔ اخبار و جرائد کی خوبصورت اور رنگی تصویروں کو دیکھنا، عشقیہ اور تحرک انگیز گانوں اور کہانیوں کو سننا، دوسروں کی شرم گاہ کی طرف دیکھنا یا اس پر ہاتھ پھیرنا، دوسروں کے حسن اور خوبصورتی کی تعریف کرنا۔ اور دوسروں کے ہر حصہ بدن اور رنگی ٹانگوں کی طرف دیکھنا۔ ماں باپ کی آپس میں یاد دوسروں سے عاشقہ بازی اور جنسی مذاق، شہوت انگیز مناظر کو دیکھنا یا ان کے بارے میں سننا اور اس طرح کے دیگر امور کو سرا انجام دینا سچے کی جنسی قوت کو تحریک کرنے اور بیدار کرنے کا سبب بنتا ہے اور بچہ بھی ایسی لذت کے حصول کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

پانچ چھ سال سے اوپر کی عمر کے بچوں کو تنہا نہ رہنے دیں۔ جو سکتا ہے وہ ایک دوسرے کی شرمگاہ سے کھلیں اور اس سے ان میں تحریک پیدا ہو۔ بچوں کو اجازت نہ دیں کہ وہ بستر پر ایسے ہی پڑے رہیں اور جاگتے ہیں پانچ چھ سال کے بچوں کے بستر جدا کر دیں اور انہیں ایک بستر پر نہ لٹائیں کیونکہ ممکن ہے ایک دوسرے سے مس ہونے سے ان میں تحریک پیدا ہو۔ پانچ چھ سال کے بچوں کو خود اپنے بستر پر نہ لٹائیں خاص طور پر مخالف جنس کے بچوں کو یہاں تک کہ ماں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا بدن اپنی چھ سالہ بیٹی کے بدن کے ساتھ ملے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

جب بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے بستر جدا کر دیں

۱۱۴۱ مصادیق ۱۳ اپنے بزرگوں سے نقل فرماتے ہیں:

عورتوں اور دس سالہ بچوں کے بستر جدا ہونے چاہئیں

۱۱۴۱ مصادیق طیبہ السلام فرماتے ہیں:

ہواں اپنی چھ سالہ بیٹی سے اپنا بدن ملتی ہے ایک طرح کے زنا کا ارتکاب کرتی ہے لہ

امام صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

مرد اپنی چھ سالہ بیٹی کو نہ چومے اور عورت اپنے سات سالہ بیٹے کو نہ پوچھے بلکہ بہت سے گھرانوں میں معمول ہے کہ عورتیں عریاں یا نیم عریاں بدن کے ساتھ گھروں میں چلتی پھرتی ہیں۔ بعض مرد بھی اس سلسلے میں عورتوں سے پیچھے نہیں رہتے۔ وہ اپنے گھر دل میں نیم عریاں بدن یا ننگی پنڈلیاں اپنے پھوٹے بڑے بیٹے بیٹیوں کو دکھاتے رہتے ہیں۔ ان گھروں کی بیٹیاں اور بیٹے بھی اپنے ماں باپ کی پیروی کرتے ہیں اور گھر میں نیم عریاں بدن کے ساتھ رہتے ہیں۔ اپنے تئیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک خاندان کے افراد ہیں۔ اپنے میں حرم ہیں۔ محرموں کے درمیان کوئی پابندی اور حجاب نہیں ہے۔

یاماں باپ سمجھتے ہیں کہ ان کے نیم عریاں بدن اور ان کی ننگی ٹانگیں ان کے بچوں پر کوئی اثر نہیں ڈالتے کیوں کہ اولاً تو وہ محرم ہیں اور ثانیاً بچے بھی ابھی کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی بیٹی کا کھلا سینہ اور ننگی ٹانگیں ان کے پیٹے پر کوئی اثر نہیں ڈالتی اور اس سے ان کی جنسی جبلت کو کوئی تحریک نہیں ہوتی کیوں کہ وہ آپس میں بھائی بہن ہیں۔ جب کہ یہ بات درست نہیں۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے بچے ان واقعات کی طرف توجہ دیں۔ لیکن یہ بات اتنی اطمینان بخش نہیں ہے۔ جنسی جبلت ایک بہت طاقتور قوت ہے اور محرم و نامحرم ہونا، بھائی اور بہن ہونا، ماں اور باپ ہونا اس کے سر میں نہیں سماتا۔ ہو سکتا ہے ایک نظر دیکھنے سے ان میں تحریک پیدا ہو جائے اور جنسی لذت کے حصول کی فکر ان میں بیدار ہو جائے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

۱۔ رسائل، ج ۱۴، ص ۱۶۰

۲۔ رسائل، ج ۱۴، ص ۱۶۰

بہت ممکن ہے کہ ایک ہی نظر سے عشق اور جنسی خواہشات بیدار ہو جائیں لہ
 ایسی زود رس تحریکات ممکن ہے سادہ روح، نا تجربہ کار اور نادان بچے کے لیے
 بہت بڑے نتائج کی حامل ہوں۔ ہو سکتا ہے نا تجربہ کار بچہ یا نوجوان ان کے باعث دنیا لواط کی
 طرف کھینچ جائے۔ ہو سکتا ہے اس کے نتیجے میں استمناء کی ہولناک بیماری میں مبتلا ہو جائے۔
 اس سلسلے میں ایسے بچوں کے ماں باپ ذمہ دار ہیں کہ جن کی بے احتیاطیوں اور غیر عاقلانہ طرز عمل
 کی وجہ سے ان کے بچوں کی اس قوت کو تحریک ملی۔

اس مقام پر بڑا نہیں ہے کہ ایک دانشور کی اس تحریر کی طرف توجہ فرمائیں؛
 اپنے بچوں کی نفسیاتی سلامتی کے لیے چاہیے کہ ہم اپنا جسم ان کے سامنے
 عریاں نہ کریں۔ اور حتی المقدور اس سے احتیاط کریں۔ بعض اوقات ممکن ہے
 ہمارے بچے چوری چھپے جب ہم ہمارے ہوں یا کپڑے تبدیل کر رہے ہوں
 ہماری طرف دیکھیں۔ ہمیں نہیں چاہیے کہ اس کام پر ان کی تشریق کریں لہ
 یہ صحیح ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کے لیے محرم ہیں اور گھر میں جیسے ہی چاہے ہیں لیکن
 اپنے اور اپنے بچوں کے اجتماعی فائدہ کو اپنی بے جا ہوس اور آزادی کی نذر نہیں کر دینا چاہیے
 اور اپنی اولاد کی زندگی کو تباہی کے خطرے سے دوچار نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس
 کے نتیجے میں زندگی محض وندامت کی نذر ہو جائے گی۔

ایک شخص کی رائے تھی۔ رسول اکرم کی نظر پڑی تو فرمایا:
 اپنی رائے کو ڈھانپ لو کیونکہ یہ بھی چھپانے کی چیز ہے لہ
 مناسب نہیں ہے کہ چار سال سے زیادہ عمر کا بیٹا ماں کے ساتھ مل کے نہائے۔
 اسی طرح چار سالہ بیٹی کو بھی باپ کے ساتھ نہیں نہانا چاہیے۔ بچوں اور بالخصوص نوجوانوں کو

لہ غزال حکم، ص ۱۶ م

لہ پیوند ہای کودک و خانواده، ص ۱۷۷

لہ۔ مستدرک حاکم، ج ۳، ص ۱۸۱

تہا اور بیکار نہ رہنے دیں کہ کس دن حصول لذت اور استمنا کی فکر میں نہ بڑ جائیں۔ منہ بچے کی شرم گاہ کو حتی المقدور اس کے بہن بھائیوں سے پوشیدہ رکھیں۔ کبھی بھی بچوں کو نمش گالی نہ دیں۔ میاں بیوی کو نہیں چاہیے کہ بچوں کی موجودگی میں ایک بستر پر سوئیں اور ان کی موجودگی میں ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کریں۔

ایک خاندان کی مشکلات میں سے میاں بیوی کے جنسی روابط کا مسئلہ بھی ہے میاں بیوی کا حتی ہے کہ وہ اکٹھے سوئیں اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے مگر اگر گھر میں چند ایک چھوٹے بڑے پتے ہوں تو ماں باپ کے لیے آپس میں لاپتگی کی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہر حال اس مسئلے میں ان کی ذمہ داری ہے کہ یہ عمل اپنے طریقے سے انجام دیں کہ ان کے بچے بالکل اس طرف متوجہ نہ ہوں، درجہ ملن کے کہ ان کے جذبات بھٹک اٹھیں اور وہ بڑائی، تباہی اور لڑائی کی طرف مائل نہ ہوں۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :
مرد کو نہیں چاہیے کہ جب سوچ کر کے یہ موجود ہو تو وہ اپنی بیوی کے قریب ہو
کہ وہ نہ بچوں کا باپ نہ ہو نہ بچوں کا

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :
واللہ الا کوئی شخص ایسی بیوی سے مباشرت کرے جب کہ پچھ کرے میں
جاگ رہا ہوں وہ انہیں دیکھے اور ان کی آواز اور ماموں کی صدا سنے تو وہ بچہ
کبھی فلاح نہیں پائے گا۔ مرد کا ہویا لڑکی کو وہ زنا ہو جائے گا۔

جب کبھی امام سجاد علیہ السلام اپنی زوجہ کے قریب ہونا چاہتے تو خدمت گزاروں کو
باہر بھیج دیتے دروازے بند کر لیتے اور پردے گرا لیتے تھے
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے کہ مرد اپنی بیوی کے نزدیک ہو جبکہ

نصائح گوارے میں ان کی طرف دیکھ رہا ہو

ہذا جن میاں پوری کا بچہ ہوا انہیں پہلے کی سی آزمائش اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے بچوں کی عفت کی حفاظت کی خاطر ان کے ایسے ضروری شے کہ وہ جنسی تعلق بالکل مخفی طریقے سے کریں اور اس طرح سے چھپ کر کہ بچے کو بالکل گونہ آئے جب کہ ایسا کرنا کوئی آسان نہیں ہے۔ یہ نہ کہئے گا کہ بچے تو نادان ہیں انہیں کسی چیز کا کیا پتہ۔ جب کہ بچے بڑے تیز اور شیطان ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے کاموں پر بڑی نظر رکھتے ہیں۔ انہیں بڑی خواہش ہوتی ہے کہ ماں باپ کی پوشیدہ باتیں معلوم کریں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے تئیں نوناظا ہر کرتے ہیں تاکہ ماں باپ کے مخفی کاموں کا انہیں پتہ چلے۔ دروازے اور دیوار کی اوٹ سے کبھی بڑی توجہ سے کان لگا لے ماں باپ کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں ہذا ایک خاندان کی شکایت ہے کہ ایک سال پہلے بھی گھر کے کمرے کا حل کوئی آسان بھی نہیں ممکن ہو تو اچھا ہے کہ میاں بیوی کی خلوت کا کمرہ بچوں کے سونے کے کمرے کے نزدیک نہ ہو اور بچوں کو وہ ایسی عادت ڈالیں کہ جب وہ سو رہے ہوں یا آرام کر رہے ہوں تو ان کے خاص کمرے میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں اور جنسی عمل ان اوقات میں انجام دیں جب بچے پوری طرح سو رہے ہوں لیکن ایسا کرہ کرہ ہی کا پتہ نہیں چلے گا۔

ایک مغربی والدین کہتے ہیں:

دور حاضر کی عمارتوں میں بچے گھر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ بناتے وقت جنسی مسائل کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہو گا اور حقیقت آج کل کے گھروں کو جنسی تقاضوں کے مخالف گھر قرار دینا چاہیے بہت کم ایسے گھر یا فلیٹ ملتے ہیں کہ جن میں والدین کے لیے جدا کمرے کی ضرورت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ اکثر ایسے گھروں کی دیواریں باریک ہوتی ہیں اور بچے ان کے گرد اگر دوہرتے ہیں۔ یہ ایک تلخ اور ناگوار حقیقت ہے کہ ان نکات کو ملحوظ خاطر نہ رکھنے کی وجہ سے

جن والدین کے لیے الگ گوشہ آرام نہ ہو ان والدین کی طبی خواہشات گھٹی رہتی ہیں۔

البتہ مخصوص کمرے کا ایک نقصان یہ ہے کہ والدین سوتے ہوئے اپنی اولاد سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ انہیں بھی اکیلا پھوڑ دیتے ہیں خصوصاً جب ان میں کوئی بڑا بچہ ہو۔ اور بیٹا اور بیٹی ہر تویہ کام بے احتیاطی سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ کم خطرہ ہے بہر حال احتیاط ضروری ہے۔ خود ماں باپ جیسے بھی ہوشکل کو حل کریں۔ البتہ اس صورت میں جب ماں باپ مجبور ہوں کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں سوئیں تو وہ مجبور ہیں کہ وہ آپس میں تعلق کو مخفی رکھیں اور اس سلسلے میں زیادہ توجہ اور احتیاط سے کام لیں۔ اولاً ماں باپ کو ایک بستر پر نہیں سونا چاہیے بلکہ ان کا بستر جدا جدا ہونا چاہیے۔ ممکن ہو تو وہ آپس میں اسی وقت میں جب بچے گھر پر نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو تو نصف شب جب یقین ہو کہ بچے بالکل سو رہے ہیں تو چپکے سے کمرے سے نکل جائیں اور کسی غلوت کی جگہ پر چلے جائیں اور پھر سونے کے کمرے میں لوٹ آئیں۔ بہر حال اگر ماں باپ مسئلے کی اہمیت جانتے ہوں اور اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوں تو ہر مسئلے کو حل کر ہی لیں گے یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ

خداوند کریم قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے،
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ
الْأَرْشَادَ ۖ إِنَّكُمْ لَعَالَمُونَ
بِهِ ۖ وَتِلْكَ مَرْثِيَةٌ مِّنْ قَبْلِ مَلَكُوتِ
الْفَجْرِ ۖ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ
النَّوْمِ فَمِنْ قَبْلِ مَلَكُوتِ الْعِشَاءِ ۖ ثُمَّ

لے پڑنا ہی کو دک و خانوادہ، ص ۱۷۸

عَوْرَتِ نَحْمُط

اے ایمان والو! تمہارے خادموں اور خدامینہ بچوں کو تین اوقات میں اجازت
نے کہ تمہارے پاس آنا چاہیے۔ ایک تو نماز صبح سے پہلے دوسرے
دوپہر کو جب (سوئے وقت) کپڑے بدلنے میں اور تیسرے نماز عشاء کے
بعد یہ تین وقت تمہارے پردوں کے وقت ہیں۔

(سورہ نور۔ آیت ۵۸)

بالغ ہونے سے پہلے بچے عموماً ماں باپ سے بلا واسطہ یا بلا واسطہ جنسی مسائل کے بارے
میں سوال کرتے ہیں بعض ماں باپ پر وہ پوشی کے لیے سوال کو ٹال دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں :
چُپ رہو، فضول باتیں نہ کرو، یہ بات تم سے متعلق نہیں ہے، بڑے ہو کر سمجھ جاؤ گے۔
یوں وہ بچوں کو چپ کروا دیتے ہیں۔ لیکن بعض ماں باپ بچوں کے سوالوں کا جواب
تو دیتے ہیں لیکن غلط اور خلاف حقیقت۔ بچے بھی سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے ماں باپ ہمیں
دھوکا دے رہے ہیں۔

یہ دونوں طرز عمل درست نہیں ہیں کیوں کہ بچے سمجھنے کے لیے سوال کر رہا ہے اگر آپ
نے اس کی صحیح راہنمائی نہ کی تو ممکن ہے دوسرا سے بھلا کا دیں۔ خوش قسمتی سے بلوغ سے
پہلے جنسی امور سے متعلق بچوں کے سوال کوئی ایسے پیچیدہ اور ناقابلِ جواب بھی نہیں ہوتے
بلکہ ان کے سادہ سے سوالوں کا آسانی سے جواب دیا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی بات
جو بچے کو ایک عرصے تک سوچ میں ڈالے رکھتی ہے وہ بچے اور بچی کی شرمگاہ میں فرق ہے
ایک چھوٹا بچہ خوب سمجھتا ہے کہ اُس کی اور لڑکی کی شرمگاہ میں فرق ہے لیکن اُسے اس
کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ وہ کبھی اپنے آپ کو ناقص سمجھتا ہے اور کبھی لڑکی کو۔ اس کا دل چاہتا
ہے کہ اس فرق کو سمجھے، اسی لیے وہ ماں باپ سے اس کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

ماں باپ کا فرض ہے کہ اس سلسلے میں اس سے صراحت سے کہیں کہ تمام لڑکے اسی طرح
سے پیدا ہوتے ہیں اور تمام لڑکیاں بھی اسی طرح سے پیدا ہوتی ہیں پھر بعد میں لڑکے باپ بن
جائیں گے اور لڑکیاں ماں بن جائیں گی اور پھر ان کی اولاد ہوگی اور یوں انسان دنیا میں آتے

رہیں گے اور یوں یہ دنیا آباد رہے گی۔

آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کا بچہ تمام حقائق جاننا چاہتا ہے۔ وہ جتنا پوچھتا ہے اتنا ہی جاننا چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ بلوغ سے پہلے بچے کو اس کی فکری سطح کے مطابق تدریجاً جنسی مسائل سے آگاہ کریں۔ اگر آپ نے اسے کچھ نہ بتایا تو اسکول یا گلی محلے کے بچوں سے اسے معلوم ہو جائے گا۔ یوں یہ راز کی باتیں اس کے لیے لازم نہیں رہیں گی۔ ماں باپ سے یہ باتیں سننا گلی محلے کے گندے بچوں سے سننے کی نسبت بہتر ہے۔ اگر آپ نے اس کی صحیح راہنمائی کی تو وہ گندے بچوں کی گمراہی سے بچ سکتا ہے۔

جب آپ کا بچہ بالغ ہو جائے اور آپ کو یہ احساس ہو کہ اس کی جنسی قوت کسی حد تک بیدار ہو چکی ہے اور اس میں مسلسل تبدیلی پیدا ہو رہی ہے تو آپ کسی مناسب موقع پر اسے کہہ سکتے ہیں:

جب بچے جوان ہو جاتے ہیں تو انہیں خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی کو اپنا رفیق بنالیں۔ لڑکیاں لڑکوں کو اور لڑکے لڑکیوں کو چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی عیب کی بات نہیں۔ البتہ اگر کوئی پاک بازار اور نیک رفیق ہو تو انسان کی خوش نصیبی ہے ورنہ بڑا رفیق تو انسان کی دنیا و آخرت کو تباہ کر دیتا ہے.....

... شادی کے بعد انسان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں بیوی کے اخراجات جدا اور اولاد ہو جاتی ہے تو اس کے اخراج بھرا۔ یہ سب کچھ مرد کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ تم بھی تعلیم پوری کرو اور کمانے لگو تو تمہاری بھی شادی کر دیں گے۔ خوب بدل لگا کر پٹھو، لائق بن جاؤ تو اچھے لوگ تم سے پیار کریں اور تمہیں بھی کوئی اچھی سی بیوی مل جائے.....

... استناد سے بچنا، یہ بہت بڑی بات ہے۔ گناہ ہے، خدا دیکھتا ہے اس کی نظر میں یہ بڑا جرم ہے پھر انسان کی صحت کے لیے بھی تباہی کا باعث ہے شاید پھر انسان شادی کے بھی قابل نہ رہے۔

بڑے دوستوں سے بچنا، ان کی بڑی باتوں سے بچنا، وہ انسان کو تباہ کر دیتے ہیں....

بچے بانج ہر جائیں تو ان کے زیر بغل اور زیر ناف بال اُگنے لگتے ہیں۔ انہیں ہو سکتا ہے وہ اپنا کوئی عیب سمجھیں۔ ان کی راہنمائی کیجئے گا۔ بال صاف کرنے کا طریقہ اور اس کی اہمیت انہیں سمجھائیے گا۔ بچی کو خون آنے لگے تو ہو سکتا ہے وہ خون زدہ ہو جائے اور چھاتی پھرے۔ ماں کو اس سلسلے میں پیار سے اس کی راہنمائی کرنا چاہیے۔ اسی طرح اس کی چھاتیاں ابھرنے لگیں تو ہو سکتا ہے وہ بہت عجیب محسوس کرے۔ ان کو اس بارے میں بھی پیار سے اُسے ضروری امداد کی راہنمائی کرنا چاہیے۔

اسی طرح بیٹھے میں جب علامت بلوغ پیدا ہوتی ہے تو وہ سوتے ہوئے اُلٹے اُلٹے خواب دیکھتا ہے۔ جس سے اس کو تحریک ہوتی ہے اور احتلام ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ اس کو نقص سمجھنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو گنہگار، اضطراب کی وجہ سے اس سلسلے میں کسی سے بات نہ چیت بھی نہیں کرتا۔ ایسے ایسے موقع پر والدین کی ذمہ داری ہے کہ اسے سمجھائیں، اس کی شکل حل کریں۔ ماں بھی بیٹی کی شکل حل کرے اور اس سے کہے تیرے زیر ناف و بغل بالوں کا اُگنا، یا خون بانج ہونے کی علامت ہے لڑکیوں میں اس عمر میں اسی طرح کی علامات ہوتی ہیں خون کے ایام میں تجھ پر ناز واجب نہیں ہے، روزہ بھی نہ رکھو بعد میں تضا کر لینا۔ پھر اسے ماہواری کے احکام اور غزل و لطافت وغیرہ کا طریقہ بتائے۔ باپ بھی بیٹے سے اس طرح کہے کہ اب تو بانج ہو گیا ہے، تیرے زیر ناف و بغل بال اُگیں گے۔ تحریک کنندہ خواب دیکھو گے۔ تمام لڑکوں سے ایسی عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس سے کوئی پریشانی محسوس نہ کرو۔ اگر مختل ہو جاؤ تو اس سے تمہارا لباس نجس ہو جائے گا۔ غسل بھی تم پر واجب ہو جائے گا۔ غسل کرنے کا طریقہ یہ ہے۔۔۔۔۔ اس طرح ماں باپ بچوں کے اضطراب اور پریشانی کو دور کر کے انہیں زمانِ بلوغ کے واقعات کے لیے پہلے سے آمادہ کر دیتے ہیں جس سے بچے اس دور کو ایک طبیسی دور سمجھ کے چھپاتے نہیں۔

کتاب کا مطالعہ

کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کا ایک بہترین طریقہ ہے۔ اچھی کتاب قاری کی روح پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی روح اور نفس کو کمالی عطا کرتی ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو بلند کر دیتی ہے۔ اس کے علم میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کی معلومات بڑھاتی ہے۔ اخلاقی اور اجتماعی خرابیاں دور کرتی ہے۔ خصوصاً دورِ حاضر کی مشین زندگی میں کہ جب انسان کے پاس فرصت کم ہو گئی ہے اور علمی و دینی محافل میں شرکت کی شکل ہو گئی ہے کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لیے اور بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے مگر اسے کتاب کے مطالعے سے انسانی روح پر جو اثرات مترتب ہوں وہ دیگر حوالوں سے مترتب ہونے والے اثرات سے عمیق تر اور زیادہ گہرے ہوں کبھی انسان کا مطالعہ اس کی شخصیت کو تبدیل کر کے دکھ دیتا ہے علاوہ انہی مطالعہ کتاب بہترین مشغولیت بھی ہے اور ایک صحیح تفریح بھی۔ جو لوگ اپنی فراغت کے اوقات کتاب کے مطالعہ میں گزارتے ہیں وہ علمی اور اخلاقی استفادہ کے علاوہ اعصابی کمزوری اور روحانی پریشانی سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور ان کی زندگی زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ کتاب ہر نظر سے زیادہ خوبصورت اور ہر باغ اور ہر چمن سے زیادہ فرحت بخش ہے لیکن جو اہل ہوا اس کے لیے۔ کتاب دلوں کو پاکیزگی اور نورانیت عطا کرتی ہے اور غم بھلا دیتی ہے اگرچہ دلتی طور پر ہی ہوتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

جو شخص اپنے آپ کو کتابوں کے ساتھ معروت رکھتا ہے اس کا آرام خاطر

ضائع نہیں ہوتا۔

امیر المؤمنین علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

تازہ بہ تازہ علمی مطالب حاصل کر کے اپنے دلوں کی کسات اور خشکی کو دور
کر دو کیوں کہ دل بھی بدن کی طرح خشک جاتے ہیں۔

سرشت کی ترقی اور تمدن کا معیار ان کی کتابوں کی کیفیت، تعداد و اشاعت اور مطالعہ کرنے
والوں کی تعداد کو قرار دیا جاسکتا ہے پڑھا لکھا ہونا ترقی کی علامت نہیں بلکہ مطالعہ اور تحقیق علوم
کی ترقی کی علامت ہے۔ ہمارے پاس پڑھے لکھے بہت ہیں لیکن یہ بات باعث افسوس ہے کہ
محقق اور کتاب دوست زیادہ نہیں۔ زیادہ تر لوگ کےڑکیاں جب فارغ التحصیل ہو جاتے ہیں تو
کتاب کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں وہ کاروبار اور زندگی کے دیگر امور میں مشغول ہو جاتے ہیں
لہذا ان کی معلومات کا سلسلہ وہیں پر رک جاتا ہے۔ گویا حصول تعلیم کا مقصد بس حصول معاش
ہی تھا۔ جبکہ حصول تعلیم کو انسان کے کمال اور علمی پیش رفت کے لیے مقدم ہونا چاہیے۔
انسان ابتدائی تعلیم کے حصول سے مطالعہ اور تحقیق کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس
کو چاہیے کہ وہ مطالعہ کرے۔ تحقیق کرے اور کتاب پڑھے تاکہ اپنے آپ کی تکمیل کر سکے
اور پھر ایک مرحلے پر انسانی علوم کی ترقی میں مدد کر سکے اور یہ کام توانائی اور وسائل کے مطابق
آخر تک جاری رکھے۔ دین مقدس اسلام نے بھی اپنے پیروکاروں کو حکم دیا ہے کہ بچپن
سے لے کر موت کی دہلیز تک حصول علم کو ترک نہ کریں۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

حصول علم ہر مسلمان کا فرائض ہے اور اللہ طالب علموں کو پسند
کرتا ہے۔

۱۔ غزالی، ص ۶۲۶

۲۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۲۸

۳۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۲۰

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :
 میرے اصحاب کو اگر تازیانے سے بھی حصولِ علم کے لیے آمادہ کیا جائے تو مجھے
 یہ بھی پسند ہے ۱
 رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :
 دو افراد کے عداوتِ زندگی میں کسی کے لیے بھلائی نہیں پیداوہ عالم کہ جس کی اتباع
 کی جائے اور دوسرا کہ جو حصولِ علم میں مشغول ہو ۲
 امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :
 لوگ تین طرح کے ہیں :

۱۔ عالم ،

۲۔ طالبِ علم اور

۳۔ باقی کوڑا کرکٹ کا ڈھیر ۳

امام صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں :
 حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا : بیٹا اپنے شبِ درویشی کچھ وقت
 مطالعہ اور حصولِ علم کے لیے مختص کر دو کیونکہ اگر تم نے مطالعہ ترک کر دیا تو تمہارا
 علم ضائع ہو جائے گا ۴
 امام جعفر صادق علیہ السلام ہی نے ارشاد فرمایا :
 حصولِ علم ہر حال میں واجب ہے ۵

۱۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۳۱

۲۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۳۳

۳۔ اصول کافی، ج ۱، ص ۳۲

۴۔ بحار، ج ۱، ص ۱۶۹

۵۔ بحار، ج ۱، ص ۱۷۲

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:
 طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ۔

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و ہر مسلمان عورت پر فرض ہے۔
 امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر لوگوں کو علم کے فائدے معلوم ہوتے تو اس کے حصول کے لیے کوشش
 کرتے اگرچہ اس کام میں ان کی جان خطرے میں پڑ جاتی یا انہیں حصول علم کیلئے
 سمنہ یا کافر کرنا پڑتا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
 اگر میرا کوئی ایک دن ایسا گزر جائے کہ جس دن میرے علم میں کچھ بھی اضافہ نہ ہو
 تو وہ دن نامبارک ہے۔

ماں باپ کی ابتدائی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھنے لکھنے کے لیے اسکول
 بھیجیں اسلام نے اس سلسلے میں بھی بڑی تاکید کی ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:
 بچہ سات سال کھیتا ہے؛ سات سال پڑھتا ہے اور سات سال حلال و
 حرام کے متعلق جانتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
 بیٹے کے باپ پر تین حق ہیں۔

۱۔ اُس کا اچھا سا نام رکھے،

۲۔ بھاری حج، ۱، ص ۱۴۴

۳۔ بھاری حج، ۱، ص ۱۴۴

۴۔ مجمع الزوائد، ج ۱، ص ۱۳۷

۵۔ مستدرک، ج ۲، ص ۶۲۵

۱-۲۔ اسے پڑھنا لکھنا سکھائے اور

۳۔ جب بڑا ہو جائے تو اس کی شادی کرے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

جب بچے کو مدرسے لے جاتے ہیں اور استاد اُسے بسم اللہ پڑھاتا ہے

تو خدا اُس کے والدین کو جہنم کی آگ سے بچا لیتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

افسوس ہے در آخر کے بچوں پر کہ جو ان کے ابا کے ہاتھوں ان پر گئے

گی۔ اگرچہ وہ مسلمان ہوں گے لیکن انہی اولاد کو وہی فرائض سے آگاہ نہیں

کریں گے۔

مال باپ کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اس طریقے سے پرورش

کریں کہ وہ علم و دانش حاصل کرنے، کتاب پڑھنے اور بحث و تحقیق کے شیدا بنیں۔ ان کے

گھر کا ماحول علمی بننا چاہیے۔ اور وہ اپنے بچوں کو قول و عمل سے مطالعہ کرنے کا شوق دلائیں۔

بہتر یہ ہے کہ یہ طریقہ کار بچپن ہی سے شروع کر دیا جائے۔ اور بچے کے سکول جانے سے

پہلے اسے اس طرز عمل کا عادی بنا دیا جائے۔ پہلے آپ بچوں کو کتاب پڑھ کر سنائیں

پھوٹے چھوٹے، سادہ اور قابل فہم قصوں اور کہانیوں کی کتابیں انہیں لکھ دیں۔ اگر یہ کتابیں

تصویروں والی ہوں تو اور بھی بہتر ہے۔ پھر ہر روز ان باپ یا بڑی بہن یا بھائی اس کتاب

کا کچھ حصہ چھوٹے بچے کو پڑھ کر سنائیں اور اگر اس کتاب میں تصویریں بھی ہوں تو کتاب کے

مطالب کی ان تصویروں کے ساتھ تطبیق کر کے بچوں کو بتائیں۔ پھر اس سے کہا جائے کہ اس

کہانی کا خلاصہ بتائے۔ اور اگر اُس میں چھوٹے چھوٹے شعر بھی ہوں تو اسے وہ شعر یاد کرانے

۱۔ مستدرک، ج ۲، ص ۶۲۵

۲۔ مستدرک، ج ۲، ص ۶۲۵

۳۔ مستدرک، ج ۲، ص ۶۲۵

جائیں۔ البتہ اس سلسلے میں جلدی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ یا بچے کی استعداد اور خواہش کے مطابق اسے کہانیاں پڑھ کر سنائی جائیں نہ کہ اس کی استعداد سے زیادہ۔ کیوں کہ اگر اس کی استعداد اور فہم سے زیادہ اس پر ٹھونسے کی کوشش کی گئی تو وہ مسترد ہی سے کتاب پڑھنے سے بیزار ہو جائے گا۔

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک بچہ خود پڑھنا اور لکھنا سیکھ نہیں جاتا۔ اس کے بعد کتاب پڑھنے کی ذمہ داری خود بچے پر ڈال دی جائے کبھی کبھی کتاب کے تعلق اس کی رائے معلوم کی جائے کتاب کے مطالب کے بارے میں اس سے گفتگو کی جائے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھیں جب بچہ خود بخود کتاب پڑھنے کا عادی ہو جائے۔

یہاں پر والدین کی خدمت میں چند نکات کی یاد دہانی ضروری ہے۔

۱۔ بچے کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ اور ان کے مطالب کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ البتہ کلی مطالب کو وہ اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ اس لحاظ سے بچوں کی کتابیں حتی المقدور کہانیاں کی صورت میں ہونی چاہیے۔

۲۔ ہر بچہ ایک الگ شخصیت کا مالک ہے۔ تمام افراد کی استعداد اور ذوق برابر نہیں ہوتے۔ مختلف عمر میں ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ لہذا ماں باپ پہلے اپنے بچے کی استعداد اور ذوق کو سمجھیں اور پھر اس کے مطابق اس کے لیے کتابیں لائیں۔ مشکل اور بورت سے بھرپور مطالب اس پر ٹھونسے سے پرہیز کریں۔ کیوں کہ ممکن ہے ایسا کرنا اسے کتابیں پڑھنے سے بیزار کر دے۔

۳۔ بچہ نہ بچے کی شخصیت کی تعمیر ہو رہی ہوتی ہے۔ اور کتاب اس پر گہرا اور عمیق اثر چھوڑتی ہے۔ لہذا اسے ہر طرح کی کتاب نہیں دی جاسکتی۔ ماں باپ پہلے خود وہ کتاب پڑھیں، اس کے مطالب پر مطمئن ہونے کے بعد وہ بچے کے سپرد کریں۔ اگر بچے نے کوئی گندی کتاب پڑھی تو یہ اس کی روح پر بڑا اثر ڈالے گی۔ جب کہ اس کی دوبارہ تربیت کرنا اور اسے سدا صدنا بہت مشکل کام ثابت ہوگا۔

۴۔ بچے جرائم کی کتابیں جن میں پولیس، قتل، اور چوری ڈاکہ کی باتیں ہوں ان سے بچنا چاہیے۔

پڑھتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی کتابیں نہ نقطہ یہ کہ بچوں کے لیے سودمند نہیں ہیں بلکہ انہیں قتل، جرم اور چوری وغیرہ کے طریقے سکھاتی ہیں۔ جس سے اُن کی سلامتی اور روحانی و نفسیاتی سکون تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح جنسی قوت کو تحریک دینے والی کتابیں بھی بچوں کے لیے نقصان دہ ہیں کیوں کہ ممکن ہے ان کتابوں سے اُن کی جنسی قوت وقت سے پہلے بیدار ہو جائے اور انہیں تباہی و بربادی کی داوی میں دھکیل دے۔ ایک صاحب اپنی یاداشتوں میں لکھتے ہیں:

..... میری داوی اداں تھیں جو مجھ سے بہت محنت کرتی تھیں۔ رات کو میں ان کے پاس سوتا اور ان سے کہانی سنانے کی ضد کرتا۔ وہ مجھے سلائے کے لیے ہر رات ایک کہانی سناتیں۔ وہ مجھے جن بابا کی کہانی سناتیں اور اسی طرح دوسری ڈراؤنی کہانیاں۔ ان کہانیوں نے میری روح اور نفسیات پر اپنا اثر چھوڑا۔ میں اُسی پریشان کن حالت میں سو جاتا۔ اور خواب میں بھی یہ انکار مجھے پریشان کرتے رہتے۔ میں ان تحریک آمیز اور فرضی کہانیوں اور افسانوں کو بہت پسند کرتا انہوں نے میری روح کو بہت حساس اور پریشان کر دیا۔ میں بزدل اور ڈر لوک بن گیا۔ تنہائی سے مجھے خوف آتا۔ میں غصیلہ اور زرد درخت ہو گیا یہ کیفیت ابھی بھی مجھ میں باقی ہے۔ کاش والدین اس طرح کی جھوٹی اور تحریک آمیز کہانیاں اپنے بچوں کو نہ سنائیں۔ میں نے یہ پکارا وہ کیا ہوا ہے کہ اپنے بچوں کو اس طرح کی کہانیاں نہیں سناؤں گا۔ میں عموماً انہیں قرآنی قصے اور دیگر سچی کہانیاں سناتا ہوں۔

۵۔ کتاب پڑھنے کا مقصد صرف وقت گزاری نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد اس کے مطالب کو سمجھنا اور ان سے استفادہ کرنا ہے۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ بچہ کتنی کتاب پڑھتا ہے بلکہ اہم یہ ہے کہ اس نے یہ کتاب کس طریقے سے پڑھی ہے۔ کیا سرسری طور پر پڑھ کر گزر کیا ہے یا غور فکر سے اور سمجھ کر اُس نے پڑھی ہے ماں باپ کو اس سلسلے میں پوری توجہ رکھنی چاہیے۔ بچے سے کبھی کبھی کتاب کے مطالب کے متعلق

سوال کرتے رہنا چاہیے۔ ادران مطالب کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں بھی اس کی رائے معلوم کرتے رہنا چاہیے۔ نیز چاہیے کہ اس سے دریافت کیا جائے اس سے اس نے کیا نتیجہ حاصل کیا ہے۔

۶۔ بچوں کو انسانوں اور جھوٹ پر مشتمل حیرت انگیز کتابیں بھی بہت اچھی لگتی ہیں بچوں کی ایسی کتابوں سے محبت کی ہی بعض دانشور تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس طرح کی کتابیں بچے کے وسعت تخیل کے لیے بہت مفید ہیں۔ لیکن راقم کی رائے یہ ہے کہ غیر حقیقی اور افسانوں کی کہانیاں بچوں کو جھوٹ کا عادی بنادیتی ہیں اور اس کے داغ میں بھوٹے اور غیر حقیقی افکار جاگزیں ہو جاتے ہیں جب وہ بڑا ہو جائے گا تو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بھی غیر حقیقی راستے تلاش کرے گا۔

۷۔ یہ صحیح ہے کہ بچہ کہانیوں کو باقی سب چیزوں کی نسبت زیادہ پسند کرتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ فقط کہانیاں پڑھنے کا عادی ہو جائے۔ بلکہ کبھی کبھی علمی، اخلاقی اور اجتماعی اور پر مشتمل فائدہ بخش کتب بھی اسے دی جائیں تاکہ وہ آہستہ آہستہ گہرے اور دقیق علمی مطالب سمجھنے کے لیے آمادگی پیدا کرے اور بعد میں فقط علمی کتابیں پڑھنے کا عادی ہو جائے۔

۸۔ ایسا نہیں ہے کہ بچہ فقط افسانوی اور جھوٹی کتابوں کو پسند کرتا ہو بلکہ بڑی شخصیات اور تحقیقی تاریخ ساز انسانوں کی زندگی پر مشتمل کتابیں بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔ اور اس طرح کی کتابیں پڑھنے سے کئی شخصیت کو اپنا آئیڈیل اور نمونہ عمل قرار دیتا ہے اس طرح کی کتابیں بچے کے لیے دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی ہیں۔



ناقص الخلقیت بچے

بعض بچے پیدائشی طور پر ناقص الخلقیت ہوتے ہیں یا بعد میں کسی حادثے کی وجہ سے ای کے بدن میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ اندھے لڑکے، گونگے بہرے اور اسی طرح کے دوسرے نقائص میں بہت سے افراد مبتلا ہوتے ہیں بعض بچے اگرچہ بدن کے کسی عضو کے اعتبار سے تو نقص نہیں رکھتے لیکن مناسب قیامت اور مکمل خوبصورتی سے محروم ہوتے ہیں۔ کالے پیلیے، کمزور، بہت چھوٹے، بہت بڑے، بہت موٹے، چھوٹی ناک والے، بڑے منہ والے یا چھوٹے منہ والے، اندر کو دھنی ہوئی آنکھوں والے، اور بڑے دانتوں والے، ان نقائص کے حامل افراد اگرچہ کسی عضو کے نقص میں مبتلا نہیں ہوتے لیکن دوسروں کی نسبت مکمل اور خوبصورت بھی نہیں ہوتے۔

اسی میں ان افراد کا کوئی قصور نہیں ہے خدا نے انہیں اس طرح پیدا کیا ہے نظام خلقت میں تمام اشیاء خوبصورت اور مناسب ہیں۔ یہ تو ہماری کم فہمی اور کم ذوقی کا قصور ہے کہ کسی کو خوبصورت سمجھتے ہیں اور کسی کو بدصورت۔

ناقص اور معذور افراد چونکہ اپنے نقص کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لہذا ہمیشہ غم و اندوہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر اس احساس کو ختم نہ کیا جائے بلکہ اس کی تائید کی جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے احساس کمتری اور کم گئی کا شکار ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کے دل میں احساس کمتری گھر کرے تو وہ تو اپنی شخصیت کو نابینا سمجھتے ہیں۔ اپنے تئیں بے یار و مددگار سمجھتے ہیں۔ وہ ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور کاموں کے لیے لپک

کے آگے بڑھنے سے گریز ہی رہتے ہیں گویا ذاتِ وہِ معنی کے سامنے ہتھیار چھیک دیتے ہیں ممکن ہے کبھی وہ اپنے اظہارِ وجود کے لیے قتل یا کسی دوسرے جرم کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ پانچ قابلِ جرم ہوتے ہیں۔ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے نقص کو بالکل نظر انداز کر دیں۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ جیسا وہ دیگر افراد کے ساتھ کرتے ہیں یہاں ان کے نقص کے بارے میں نہ سوچیں نہ ان پر طنز کریں نہ تمغہ لٹائیں۔ اور نہ ان کے نازک دلوں پر زبان کے چرکے لگائیں۔ دینِ مقدسِ اسلام نے عیب جوئی، تمسخر بازی، سرزنش اور دوسروں کی ذلت میں کٹڑے نکالنے کو گناہِ کبیرہ میں سے اہم قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں اس قدر تاکید کی ہے کہ اپنے پیروکاروں کو حکم دیا ہے کہ آپ ہرگز کوئی ایسا کام نہ کریں کہ ناقصِ خلقتِ افروا اپنے نقص کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

حیبت میں بھرے افراد کوڑھیوں کی طرف زیادہ نہ دیکھیں کیوں کہ ممکن ہے آپ کی نظریں ان کے لیے باعثِ حزن و غل ہوں۔

جدا ازین مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے افراد کے ساتھ زیادہ محبت اور ہمدردی کریں اور اس طرح سے ان کے احساسِ کمتری کا زائلہ کریں۔ اور ان میں احساسِ زندگی کو تقویت بخشیں۔ ایسے بچوں کے ماں باپ کی ذمہ داری بھی سنگین تر ہے۔ اس امر پر ان کی توجہ دینا چاہیے کہ ناقصِ افراد بھی ترقی اور کمال کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کی صلاحیتوں کا اظہار لگایا جائے اور ان کی دیگر قوتوں کو اجاگر کر تقویت پہنچائی جائے تو وہ کسی علمی، سائنسی یا فنی شعبے میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح سے اپنے نقص کا ازالہ کر سکتے ہیں اور معاشرے میں بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ کتنے ہی ناقصِ افراد ہیں کہ جو کوشش اور محنت سے ایسے بلند مقام پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ان کا نقص بہت ہی پیچھے رہ گیا ہے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ اپنی اولاد کے نقص سے بالکل چشم پوشی کریں اور اس بارے میں بالکل بات نہ کریں یہاں تک کہ مذاق، اظہارِ ہمدردی یا ہنسنے

کی صورت میں بھی ذکر نہ کریں۔ ایسے بچوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک بالکل ایسا ہو جیسا دوسرے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر خود بچہ اس سلسلے میں پریشانی کا اظہار کریں تو کوشش کریں کہ اس نقص کو غیر اہم قرار دیں۔ اور اُسے اس کی دوسری صلاحیتیں یاد دلائیں اور ان کی تعریف و ستائش کریں۔

ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ پوری توجہ سے تحقیق کریں کہ بچوں میں کیا کیا استعداد اور صلاحیت موجود ہے اور اس سلسلے میں جاننے والے افراد سے مشورہ کریں۔ اور پھر بچے کو اس طرف متوجہ کریں۔ اور اس بارے میں ان کی تائید کریں اور انہیں ترغیب دیں۔ اگر ماں باپ اس سلسلے میں کچھ توجہ کریں تو وہ اپنے ناقص بچے کی اور معاشرے کی بہت بڑی خدمت سرانجام دیں گے۔

اس صورت میں اسی طرح کا شخص گویا اپنی کھوئی ہوئی صورت کو پالے گا اور اپنی خدا داد صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے گا۔ اور معاشرت میں بھی وہ ایک اہم مقام حاصل کر سکے گا۔

ایک لڑکی اپنے خط میں لکھتی ہے۔

... میری ایک سہیلی نے اپنی زندگی کی راستان مجھے اس طرح سنائی تھی تیرہ سال کی تھی۔ ایک دفتر میں چھت سے گڑ بڑی۔ میری ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگی جس کی وجہ سے میں معذور ہو گئی۔ کچھ عرصہ ہسپتال میں میرا علاج ہوتا رہا۔ اگرچہ مجھے تکلیف تھی لیکن مجھے ہمدردی سمجھ آئی کہ یہ دن میرے لیے بہت بہتر تھے جب مجھے ہسپتال سے چھٹی ملی اور میں گھر پہنچی تو میرے والدین نے مجھے زلی دشمنوں کی طرح دیکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا: تم ہمارے لیے باعث ننگ و عار ہو۔ ہم لوگوں کو کیسے بتائیں کہ ہم ایک معذور بیٹی کے والدین ہیں۔ تم ہمیشہ ہم پر سوار ہو گئی۔ وہ مجھے دلاسا دینے کی بجائے دن رات ایسی ہی باتیں کرتے اور میری چڑمردہ روح کو اور چر کے (رزم) لگاتے۔ وہ یہ نہیں سوچتے تھے کہ میں بے قصور ہوں۔ میں روزانہ کئی مرتبہ خدا سے اپنی موت کی دعا کرتی تاکہ

اس سخت زندگی سے میری جان چھوٹ جائے۔ میں اپنے مخلصوں کے ساتھ سداونہ مہر میں کام کرتی۔ لیکن کوئی میری دلجوئی نہ کرتا مجھے اصلہ اپنی بیٹی ہی نہ سمجھتے میری جوانی کے بہترین ایام رنج و درد کے عالم میں گزرے۔ پندرہ سال کی عمر میں ایک پچاس سالہ بوڑھی کی طرح نظر آتی جب میرے ماں باپ مر گئے۔ میرے بہن بھائی بھی بچپن ہی سے مجھ سے متنفر تھے وہ بھی میری احوال پڑی نہ کرتے۔ پھر میری شادی کر دی گئی۔ میرے شوہر بہت مہربان شخص تھے۔ مجھ سے بہت محبت کرتے اس وقت تک مجھے محبت کی ٹھنڈی چھاؤں نصیب نہیں تھی اب میری حالت دن بدن اچھی ہونے لگی اب میں بالکل تندرست ہو گئی ہوں۔ خدا نے مجھ اور بھی عطیہ کیا ہے اور میں خوش خرم اور صحت و سعادت کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں۔



جسمانی سزا

بہت سے والدین بچوں کی تربیت کے لیے جسمانی سزا ضروری سمجھتے ہیں اور اکثر امتداد کے ذہن میں بھی یہ سودا سمایا ہوتا ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ "ہاتوں کے جھوٹ باتوں سے بنیں" مانتے پگڑشتہ زمانے میں اس طرز عمل کے حامی بہت افراد تھے۔ اور یہ طریقہ کھرا کج بھی تھا۔ سکول کی ضروریات میں سے دُعا، زنجیر اور گڑا وغیرہ بھی تھا۔ جو والدین اپنی اولاد کی تربیت کے خواہش مند ہر تہہ و انیس مارنے سے دریغ نہ کرتے۔ لیکن بہت سے دانشور بالعموم اور ماہرین نفسیات بالخصوص اس طرز عمل کو بچے کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اور اس سے منع کرتے ہیں دنیا کے ترقی یافتہ ملک میں جسمانی سزا پر تقریباً تقریباً پابندی ہے اور اس سلسلے میں کئی قوانین منظور اور نافذ ہو چکے ہیں۔ دانشور کہتے ہیں۔

جسمانی سزا سے بچے کی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔ ممکن ہے ظاہری طور پر اس کا تصور بہت اثر ہو لیکن یہ ناقابلِ کافی نقصان کی حامل بھی ہوتی ہیں مثلاً

۱۔ مار کھا کھا کر بچہ اس بات کا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ زور اور طاقت کے سامنے ہار چوں و چرا سر جھکا لے۔ اور ہو سکتا ہے اس طریقے سے وہ یہ سمجھنے لگے کہ طاقت ہی کامیابی کی کلید ہے۔ اور جب بھی غصہ اُسے آتا چاہیے۔ اور اس سلسلے میں کچھ لڑائی کا نہیں رکھنا چاہیے۔ مار پیٹ کے ذریعے ماں باپ جگل کے خندانہ قوانین اپنے بچے پر لاگو کر دیتے ہیں۔

۲۔ مار کھانے والے بچے کے دل میں والدین کے بارے میں کینہ اور نفرت پیدا ہو

باقی ہے اور زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ وہ آخر تک اُسے فراطوش نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی رد عمل کا مظہر ہو کرے اور سرکشی ہو جائے۔

۳۔ بار پٹائی بچے کو بزدل بنا دیتی ہے۔ اسی کے ذریعے سے بچے کی شخصیت بھی کھلی جاتی ہے اور اس کا رد عمل توازن پر چڑھتا ہے اور وہ غصے اور دوسری نفسیاتی بیداریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۴۔ جملانی مار پیٹ زیادہ تر بچے کی اصلاح نہیں کرتی اور اس کے اندر اصلاح کا جذبہ نہیں ابھارتی۔ ممکن ہے مار پیٹ اور ڈنڈے کے خوف سے ظاہر اُردو بڑا کام نہ کرے اور دوسروں کی موجودگی میں وہ کچھ نہ کرے لیکن اس کی حقیقی بڑائی اس طرح سے دور نہیں ہوتی اور باطن میں جو درد رہتی ہے اور بھانناں کسی دوسری صورت میں آشکار ہوتی ہے۔

ایک صاحب کہتے ہیں:

میرے بارہ سالہ بیٹے نے امدادی سہا کے پیسے اٹھالے۔ اسی کام پر میں نے اس کی ڈنڈے سے پٹائی کی اس کے بعد وہ خوف کے مارے امدادی کے قریب نہیں جاتا تھا۔

اور یہ درست ہے کہ بچے نے اس کے بعد امدادی سے پیسے نہیں اٹھائے اور اس لحاظ سے باپ نے اپنا قصہ پایا ہے لیکن سارا اتنا سادہ نہ تھا۔ یہ قصہ اُگے بڑے صاحبان کا وہ نہیں کا لایا اور نہ کرتا۔ ماں کو دھتکے کے لیے پیسے دیتی تو اسی میں سے خرچ کرتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اپنے دوستوں کے بھی پیسے چھوئے ہیں۔ گویا دار نے بچے کو چھو کیا وہ ایک کام کا تکرار نہ کرے۔ لیکن اس کام کی اصل حقیقت تو ختم نہ ہوئی تھی۔

ایک دانشور کہتے ہیں:

جن بچوں کی مار پٹائی ہوتی رہتی ہے وہ بعد ازاں ڈھیلے ڈھالے اور بیکار سے

شخص بن سکتے ہیں یا پھر وحوش و جانور بن جاتے ہیں گویا پوری زندگی اپنے
افسردہ بچپن کا انتقام لیتے ہیں۔ لہ
مستزحل کہتے ہیں:

میرے نظریے کے مطابق بدنی سزا کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے لہ
اسلام نے بھی جسمانی سزا کو نقصان دہ قرار دیا ہے اور اس سے روکا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،
عقل منادوب کے ذریعے نصیحت حاصل کرتا ہے۔ یہ تو صرت حیوانات
ہیں جو مد کے بغیر ٹھیک نہیں ہوتے۔ لہ

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:
جو شخص بھی دوسرے کو ایک تازیانہ مارے گا۔ اللہ تعالیٰ اس پر آگ کا تازیانہ
برمائے گا لہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تعلیم و تربیت میں پیار و محبت سے کلاں اور سخت گیری نہ کریں کیونکہ دانش مند
استاد سخت گیر استاد سے بہتر ہوتا ہے لہ

ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے اپنے بیٹے کی شکایت
کی تو آپ نے فرمایا:

اے ماں! البتہ اس سے کچھ درد ہو لیکن تمہاری یہ حدی اور ناراضی زیادہ

لہ دہلیں شامی تجربی کو ردک، ص ۲۹۹

لہ و تربیت، ص ۱۶۹

لہ غزالی حکم، ص ۲۳۶

لہ رسائل، ج ۱۹، ص ۱۲

لہ بحار، ج ۷، ص ۱۷۵

دیر کے لیے نہ ہو۔

بہر حال بدنی سزاؤں تربیت کے لیے نہایت ہی خطرناک ہیں اور حتیٰ الامکان ان سے بچنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا طریقہ مؤثر نہ ہو اور مار کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہو تو ایک ضرورت کی حد تک اس سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اسلام نے بھی اس کے لیے اجازت دی ہے مثلاً رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اپنے بچوں کو چھ سال کی عمر میں نماز کے لیے کہو اور اگر نصیحت اور ڈانٹ مؤثر نہ ہو اور وہ تمہارے حکم کی خلاف ورزی کریں تو سات سال کی عمر میں تم انہیں مار کر نماز کے لیے کہہ سکتے ہو۔

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

جب بچہ نو سال کی عمر کو پہنچے تو اسے دھتور کا کھاؤ اور اس سے کہو کہ وضو کرے اور نماز پڑھے۔ اور اگر وہ نہ مانے تو مار کر نماز پڑھاؤ۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اگر تمہارا خادم خدا کی نافرمانی کرے تو اسے مارو اور اگر تمہاری نافرمانی کرے تو اسے سزا کر دو۔

امیر المومنین علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

جس طرح سے اپنے بیٹے کو سرزنش کرنا اسی طریقے سے تیم کو سرزنش کرو اور جس مقام پر اپنے بیٹے کو سرزنش کے لیے مارا اس مقام پر تیم کے لیے بھی اس سے کام لو۔

لے بحار، ج ۱۲، ص ۹۹

لے مستدرک، ج ۱، ص ۱۷۱

لے وسائل، ج ۳، ص ۱۳

لے غرر الحکم، ص ۱۱۵

لے وسائل، ج ۱۵، ص ۱۹۷

ایک شخص نبی اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کی ایک یتیم بچہ میری سرپرستی میں ہے
کیا میں اسے سرزنش کے لیے مار سکتا ہوں فرمایا:

جس مقام پر تم اپنے بیٹے کو تربیت کے لیے مار سکتے ہو اس مقام پر یتیم کی
تربیت کے لیے بھی مارے کام لے سکتے ہو۔

ہر حال جب تک غصہ نہ پڑ جائے اس حساس اور خطرناک وسیلے سے کام نہیں لینا
چاہیے۔ اور جب غصہ ہی ہو اس وقت بھی احتیاط کا واسا تھوڑا سا نہیں چھوڑنا چاہیے اور
مزاحمتی اور کڑی بھی ہونی چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اکرمؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی میرے گھر والے
میری نافرمانی کرتے ہیں میں کس طریقے سے انہیں توبہ کروں۔ فرمایا:
انہیں معاف کر دو۔

اس نے دوسری اور تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو حضورؐ نے یہی جواب دیا۔
اور اس کے بعد فرمایا:

اگر تم انہیں سرزنش نہ کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں دعویٰ رکھنا چاہیے کہ مرزاؤں
کے جرم سے زیادہ نہ ہو اور جہرے پر مارنے سے اجتناب کرنا۔
حضرت عاتق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ضرورت کے موقع پر نیچے اور خادم کو تہیہ کے لیے پانچ یا چھ غزوں سے زیادہ
نہ لاؤ اور زیادہ زور سے بھی نہ لاؤ۔

تہیہ کے موقع پر کوشش کریں کہ دو سرسوں کی موجودگی میں نہ ہو کیونکہ روحانی طور پر
نیچے پر اس کے بڑے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اسے وہ عمر بھی نہیں بچتا۔ اور اسے

لے مسندک ج ۲، ص ۲۱۵

لے مجمع الزوائد، ج ۱۸، ص ۱۰۶

لے وسائل ج ۶، ص ۵۸۱

بڑھ جائے تو اسلام میں اس کے لیے دیت اور ہر ماہ مقرر کیا گیا ہے۔ لہذا اس حد تک نہیں مارنا چاہیے۔ اسلام کے قوانین کے مطابق اگر مارنے کے نتیجے میں کسی کا چہرہ سیاہ پڑ جائے تو مارنے والے کو اسے چھ طلائی دینا دینا ہوں گے۔ اور اگر چہرہ سبز پڑ جائے تو تین دینار اور اگر سرخ ہو جائے تو ڈیڑھ دینار۔

مال باپ کو حتیٰ نہیں پہنچتا کہ وہ پاگلوں کی طرح بیمار سے بچے کی جان کے درپے ہو جائے۔ اور اُسے کوئی اور لاقوں سے ماریں۔ یا زنجیر اور ڈنڈے سے اس کا بدن بیاہ کر دیں۔ بہر حال ضرورت کے موقع پر اسلام نہ فقط بدنی سزا کو مفید سمجھتا ہے بلکہ اس کا حکم دیتا ہے۔ کیونکہ بے حد حساب اور مطلق آزادی کا بھی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ یہی بے حساب اور غلط آزادی ہے کہ جس نے مغرب کے بچوں اور نوجوانوں کو بگاڑ دیا ہے۔

غیر جسمانی سزاؤں

بہت سے والدین اپنے بچوں کی تربیت کے لیے غیر بدنی سزاؤں سے استفادہ کرتے ہیں مثلاً بچے کو کسی اندھیرے کمرے میں بند کر دیتے ہیں۔ یا تہ خانے میں بند کر دیتے ہیں یا کسی صندوق وغیرہ میں۔ کبھی اس کو غصے کے ساتھ گالی بکتے ہیں۔ اس طرح کی وجہانہ سزاؤں کا نقصان بدنی سزاؤں اور مار پیٹ سے کم نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

بہت سی سزائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اثر حملے سے زیادہ ہوتا ہے۔

اور ممکن ہے یہ بدنی سزاؤں سے بھی زیادہ نقصان دہ ہوں۔ اس طرح کی سزائیں بچے کی شخصیت کو مجروح کر دیتی ہیں اور خوف و اضطراب کے عوامل اس میں پیدا کر دیتی ہیں۔ ایسا بہت دفعہ ہوا ہے کہ کسی کمرے میں بند بچے کے اعصاب پر اتنا شدید خوف طاری ہوا ہے جس سے وہ پوری زندگی نجات حاصل نہیں کر سکا کبھی اس خوف کے زیر اثر اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ لہذا والدین کو اس طرح کی سزائیں دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ بد زبانی اور گالی حرام ہونے کے ساتھ ساتھ بچے کی تربیت پر بھی بُرے اثرات مرتب کرتی ہیں اور اسے اس بُرے عمل کا عادی بنا دیتی ہیں۔

لیکن بعض غیر جسمانی سزاؤں میں اس طرح کا نقصان نہیں ہے جیسے بچے کے ساتھ

مردان ہر جانا، اسے سیر و تفریح کے لیے نہ لے جانا۔ اسے دعوت پر نہ لے جانا اسے ایک وقت کا کھانا نہ دینا۔ اس کے جیب خرچہ میں کمی کر دینا، اسے کھیلنے سے روک دینا۔ اس کے ذرہ شکل کام لگا دینا یا گھر کے بعض کام اس کے سپرد کر دینا اور اسی طرح کی دوسری سلاہ اور بے ضرر قسم کی سزائیں بہت سے والدین اپنے بچوں کی تنبیہ کے لیے اس طرح کی سزائیں دیتے ہیں۔ بکلوں میں بھی کم و بیش اسی طرح کی سزائیں ملتی ہیں۔ اس طرح کی سزائوں کا استعمال اگر صبح اور عاتقہ طریقے سے کیا جائے تو یہ بچے کی تربیت کے لیے کسی حد تک سودمند ہوتی ہیں۔ اور کسی قسم کا نقصان بھی نہیں رکھتیں۔ سزائیں یہ ایک عمومی نقص ہے کہ یہ بچے کی باطنی اور اندرونی اصلاح کیلئے موثر نہیں ہوتی اور اس میں اصول کا رجحان پیدا نہیں کرتی۔ سزا کے ڈر سے ممکن ہے وہ کلمے عام اس بڑے کام کے انجام دینے سے باز رہے لیکن ناس بڑائی کو وہ بڑے نہیں کاٹ چیکا بلکہ ظاہری طور پر وہ اس بڑائی کے جذبے کو چھپاتا ہے اور پھر یہ جذبہ کسی دوسری جگہ پر اپنا کام دکھاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سزا کے خوف سے وہ غریب کاری، جھوٹ اور بیکاری سے کام لے۔ ان سزائوں سے بہتر استفادہ کرنے کے لیے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

۱۔ سزا سچ بچہ کو دینا چاہیے۔ لازمی مقدار سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ سزا جرم سے زیادہ نہ ہو۔ کیونکہ بچے نے اس سزا کو اپنے خفا کا ایک جگہ بھجوا کر وہ رد عمل کے طور پر اپنا دفاع کرے گا اور تا فراموشی دوسرے گناہ کا مظاہرہ کرے گا۔

۲۔ سزا اس طریقے سے نہیں ہونی چاہیے کہ بچہ والدین کو اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دے یا وہ یہ سوچے کہ والدین مجھ سے محبت نہیں کرتے۔

۳۔ بچے سے اگر غیر ارادی طور پر ایک فعل سرزد ہو گیا ہے تو اسے سزا نہ دیں۔ کیونکہ اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر اسے سزا دی گئی تو یہ اس کے جذبات و احساسات پر منفی اثرات مرتب کرے گی۔

۴۔ سزا کبھی کبھی دینا چاہیے۔ تاکہ اس سے مثبت نتائج حاصل کیے جاسکیں۔ کیوں کہ اگر اسے مسلسل سزا دی گئی تو وہ اس کا مادی بن جائے گا۔ اور یہ سزا اس پر کسی قسم کا

اثر نہیں ڈالے گی۔

حضرت علیؓ طہرہ اسم نے فرمایا،

امت اور سرزنش کی زیادتی ڈھیٹ پن کا باعث بنتی ہے۔

۵۔ کسی انفرادی واقعے میں بچے کو سرزدینی چاہیے نہ کہ کچی طور پر تاکہ بچہ سزا کی وجہ سمجھ سکے۔ اور پھر اس کا اعادہ نہ کرے۔ عورت بے نظمی پر بچے کو مزادیں بلکہ ایک خاص مقام پر بے نظمی کی وجہ سے بچے کو سزا دیں۔

۶۔ حتیٰ المقدور اس امر کی کوشش کرنا چاہیے کہ ایسی سزا کا انتخاب کیا جائے جو بچے کے جرم سے مناسبت رکھتی ہو۔ مثلاً اگر اُس نے ریاضی کا کام نہیں کیا تو ریاضی کی مشق ہی اس سے سزا کے طور پر عمل کرائی جائے۔ نہ یہ کہ اس سے حساب کی کتاب کو اہل سے آٹھ ترکہ کھینے کی سزا دے دیں۔ اگر اس نے اپنا بستہ اور کپڑے پھینک دیے ہیں تو اسے اُن کو اٹھا کر مرتب طریقے سے رکھنے کا حکم دیا جائے نہ یہ کہ اسے دعوت پر نہ لے جایا جائے۔ یا اُسے گھمانے پھرانے سے محروم کر دیا جائے۔ اگر کسی دعوت پر اس نے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ہے تو اُسے اور دعوت پر نہ لے کر جائیں۔ تاکہ اس کا جیب خراج کم کر دیں۔ اگر اُس نے فضول خرچی کی ہے تو اسے جیب خراج نہیں دیں تاکہ اسے سزا پر نہ لے جائیں۔ اگر اس نے اپنی پینل یا قلم بے احتیاطی کی وجہ سے گم کر دیا ہے تو اتنے پیسے ہی اس کے جیب خراج سے کم کر دیئے جائیں۔

۷۔ سزا کے بعد بچے کی غلطی کو بھول جائیں۔ اور دوبارہ اُس کا ذکر نہ کریں۔ ایک شخص کہتا ہے میں نے حضرت موسیٰ بن جعفرؑ اسم کی خدمت میں اپنے بیٹے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا:

اسے مارو پٹو نہ۔ اُس کے ساتھ ناراضی ہو جاؤ لیکن تمہاری یہ ناراضگی زیادہ

دیر تک نہیں رہنی چاہیے۔

۱۔ غرضاً حکم، ص ۱۰

۸۔ اگر آپ بچے کو سزا دینا چاہتے ہیں تو اس کا دوسرے بچوں کے ساتھ مقابلہ نہ کریں۔
اور دوسروں کی خوبیاں اُس کے سامنے بیان نہ کرنے بیٹھ جائیں کیونکہ اس طریقے سے
آپ اُسے مدد نہیں دیتے بلکہ اس میں حسد پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔
ایک صاحب اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

..... بچپن میں میرے والد مجھے بہت مجرا بھلا کہتے تھے۔ رشتہ داروں اور
میرے ہم جو بیوں کے سامنے میری بے عزتی کرتے اور مجھے ڈانٹتے ڈپٹتے
ہمیشہ دوسروں کے گنہگار میرے سامنے لگاتے رہتے اور مجھے تفریح سے
رہتے میرے والد میری جتنی بھی بے عزتی کرتے میں بھی اتنا ہی دُعا دیتا
بننا گیارہ مجھ میں سبق پڑھنے کا سوسہ نہ رہا۔ میں اپنے آپ کو ایمینز سمجھنا کام
اور سبق سے بھاگتا۔ کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہ کرتا۔ میرے والد کی مسلسل ڈانٹ
ڈپٹ نے میری شخصیت کو مجروح کر دیا اب میں ایک کام چوراہہ گزرتے نشین
فوجوں۔

میرا

۳

۴

حوصلہ افزائی اور انعام

تربیت کا ایک ذریعہ بچے کے اچھے کاموں پر اس کی تعریف اور حوصلہ افزائی ہے۔ بچے کی حوصلہ افزائی اس کی تربیت کا بہترین اور موثر ترین ذریعہ ہے یہ بچے کی روح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور اسے اچھا بننے کی ترغیب دلاتی ہے۔ ہر انسان اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی تکمیل چاہتا ہے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کی شخصیت سے آگاہ ہوں، اُس کی قدر و قیمت پہچانیں۔ اور اس کا شکریہ ادا کریں۔ اگر اس کی حوصلہ افزائی کی گئی تو پھر اس کا رجحان اچھائی کی طرف اور بڑھے گا اور وہ مکالمے کے راستے پر گامزن ہوگا۔ لیکن اگر اس کے برعکس اُس کی حوصلہ شکنی کی گئی تو وہ نیکی اور اچھائی سے دور بھاگے گا۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنے سے اچھے نتائج کے حصول کے لیے چند باتوں کی یاد دہانی ضروری ہے۔

۱۔ اس کی حوصلہ افزائی کبھی کبھی اور بڑے کاموں پر کی جانی چاہیے۔ زیرِ کہمیشہ اور ہر کام پر کیوں کہ اگر ایسا کیا گیا تو بچے کی نظر میں حوصلہ افزائی اپنی اہمیت کھو بیٹھتی۔

۲۔ اس کی حوصلہ افزائی کسی خاص مقام پر ہونی چاہیے تاکہ وہ یہ سمجھ سکے کہ اس کو داد کس لیے دی جا رہی ہے۔ لہذا وہ دوسرے مقام پر بھی اسی طرح کے ثنائے طویل کا مظاہرہ کرے گا۔ ویسے ہی عمومی طور پر اس کی حوصلہ افزائی فائدہ مند نہیں ہو سکتی تھا اگر بچے کو اس لیے شاباش دی جائے کہ وہ ایک اچھا اور پابند بچہ ہے

تو یہ حوصلہ افزائی کسی کام نتیجے کی حامل نہیں ہوگی۔ اچھے بچے کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس کو کیوں شاباش دی جا رہی ہے۔

۲۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بچے کے اچھے کام یا اخلاق کی تعریف کرنا چاہیے نہ کہ خود بچے کی۔ تاکہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکے کہ اہمیت اچھے کام کی ہے نہ کہ کسی شخص کی۔ اور ہر آدمی کی اہمیت اس کے اچھے کام کی وجہ سے ہے۔

۳۔ بچے کی حوصلہ افزائی کرتے وقت اس کا دوسرے بچوں کے ساتھ مقابلہ نہ کریں مثلاً باپ کا اپنے بچے سے یہ کہنا اچھا نہیں ہے کہ تجھ پر آفرین کرتا ہوں ایک بچہ بچے ہو اور حسن کی طرح جھوٹے نہیں ہو۔ حسن بڑا بچہ ہے کیوں کہ جھوٹ بولتا ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے بچہ دوسرے بچے کو حقیر سمجھے گا۔ اور یہ بھی بذات خود ایک بُری تربیت ہے۔

۵۔ شاباش اور حوصلہ افزائی حد سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ممکن ہے اس سے بچہ معزور اور خود بین ہو جائے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

بہت سے لوگ اس تعریف کی وجہ سے معزور ہو جاتے ہیں جو ان کی شان میں کی جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں :

کسی کی تعریف و ستائش میں زیادہ آروی اور مبالغہ نہ کرو۔

تعلیم و تربیت کا ایک اور وسیلہ انعام دینا ہے۔ انعام دینا بُری بات نہیں ہے بشرطیکہ غیر متوقع ہو کسی بچے کو انعام دیا جائے اور اچھا کام کرنے پر دیا جائے۔ پہلے سے اگر انعام کا وہی کر دیا جائے تو یہ بچے میں بُرے اثرات مرتب کرے گا کیونکہ ممکن ہے ایسا کرنے سے بچہ اس بات کا کوئی احساس نہ کرے کہ وہ ہر نیک کام کے انعام کا منتظر ہے۔

اور یہ ایک طرح کی ثروت ہو جائے۔ وہ اس انعام اور ثروت کے بغیر اس کام کی انجام دہی پر راضی نہ ہو۔

انسان کو نیک کاموں کا عادی ہونا چاہیے۔ اور وہ ان کو خدا کی رضا اور بندگان خدا کی خدمت کے لیے انجام دے۔ مزید کر ہر کام پر اس کی آنکھیں لوگوں سے انعام کی منتظر رہیں۔ اس طرح کا بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ کوتاہ فکر ہو جاتا ہے، اور لوگوں کے کاموں کی انجام دہی اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔ حتیٰ المقدور دوسروں کے کام آئے سے فرار کرتا ہے۔ مگر یہ کہ اُسے کسی انعام یا ثروت کا لالچ دیا جائے۔ یہ ایک بہت بڑی اجتماعی بُرائی ہے۔ لہذا اس لیے کہ انعام اس بُرائی کا باعث نہ بنے ضروری ہے کہ انعام اتنی مقدار کا ہونا چاہیے کہ وہ انعام یافتہ شخص کی عادت ثنائی نہ بن جائے۔ جب بچہ کاموں کا عادی ہو جائے تو آہستہ آہستہ انعام و اکرام کا سلسلہ ختم کر دیں۔ اور اسے کاموں کی انجام دہی کی ترغیب دلائی جائے۔ ضروری ہے کہ بچہ آہستہ آہستہ اپنی ذمہ داری پر عمل پیرا ہونے کا عادی ہو جائے تاکہ وہ اس کی انجام دہی سے لذت و خوشی محسوس کرے۔ بہت سے مال باپ اپنے بچوں کو امتحان میں سو فیصد نمبر لینے پر انعام دیتے ہیں اور اس فریضے سے وہ انہیں سبق پڑھنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ لیکن یہ کسی حد تک مؤثر بھی ہو۔ لیکن اس میں ایک بہت بڑا نقصان بھی ہے وہ یہ کہ یہ پروگرام بچے کے احساس ذمہ داری پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ یہ بچہ اس لیے پڑھتے ہیں تاکہ اچھے نمبر حاصل کر کے انعام لے سکیں۔ حالانکہ یہ ضروری ہے کہ بچے اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کو سمجھ کر پروان چڑھیں ناپ کہ ہر کام کے مقابلے میں کسی مادی انعام کے خواہش مند۔ ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں :

چوتھی کلاس سے مجھے ایک دینی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ میں قرآن کا سبق یاد کرنے میں بہت پیچھے تھا یہاں تک کہ مجھے قرآن کا ایک کلمہ بھی یاد نہیں تھا لیکن میرے ہم جماعت بہت اچھی طرح قرآن پڑھتے تھے۔ قرآن کے پہلے پریڈ میں ہی ہمارے قاری صاحب نے خندہ پیشانی کے ساتھ مجھ سے پوچھا کیا تم قرآن پڑھ لیتے ہو؟ میں نے پریشان ہو کر کہا! نہیں۔ تو انہوں نے کہا! کوئی حرج

نہیں۔ میں تجھے سبق دوں گا اور مجھے معلوم ہے کہ تم کلاس کے لائق ترین بچے بن جاؤ گے۔ جو کچھ بھی تمہارا دل چاہے مجھ سے پوچھ لیا کرو۔ اپنے استاد کی باتوں سے مجھ میں پڑھنے کا اتنا شوق پیدا ہوا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں سبق میں کمزور رہنے کی تدافی کروں گا میں نے خوب محنت کی۔ اور سال کے آخر میں قرآن کے سبق میں بہترین ہو گیا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی قاری صاحب کی جگہ میں کلاس کو پڑھاتا۔ اور صبح کی اسمبلی میں قرآن کی تلاوت کرتا۔ ایک رطلی اپنی یادداشتوں میں تحریر کرتی ہے۔

..... میرے والد ایک روشن خیال شخص تھے۔ ایک دن میری ماں کی غیر موجودگی میں ماہیوں نے میرے چند اساتذہ کی دعوت کر دی۔ کھانے پینے کا سامان لاکر میرے سپرد کر دیا میں نے بھی خوشی خوشی کھانا پکانا شروع کر دیا۔ دوپہر کو میرے ابو مہمانوں کو اپنے ساتھ لے آئے۔ جب میں نے کھانا برتنوں میں ڈالا تو معلوم ہوا کہ یہ تو اچھی طرح پکا ہی نہیں ہے۔ مرغ بھی کچا تھا اور چاول بھی خراب ہو چکے تھے چونکہ مجھے کھانا پکانے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ لہذا میں بہت غلغلی تھی۔ اور کسی متوقع ڈانٹ ڈیپٹ کی منتظر۔ لیکن میری توقع کے برخلاف میرے والد نے مہمانوں کے سامنے تعریف کی اور کہا: یہ کھانا میری بیٹی نے پکایا ہے اور کتنا لذیذ پکایا ہے۔ مہمانوں نے بھی ان کی تائید کی۔ اور میری سلیقہ شناسی کی تعریف کی۔ بعد میں باپ نے مجھے شاباش دی۔ اپنے باپ کی حوصلہ افزائی سے میں کھانے پکانے کے امور کی طرف متوجہ ہوئی اور اب میں مزید ارقم کے کھانے پکانے اور دسترخوان کے باقی لوازمات میں پوری طرح ماہر ہو چکی ہوں۔

تفسیر فصل الخطاب کمپیوٹری ڈی

(از سید العلماء حضرت علامہ سید علی نقی النقویؒ)

خصوصیات فصل الخطاب کا مکمل اردو متن دیکھا جائے گا۔ قرآن کی تمام آیات کا صحیح اردو ترجمہ مطالعہ کیا جائے گا۔ عبادین کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہوگی۔ گیات کی تربیت کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہوگی۔ عربی الفاظ کے انڈکس کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہوگی۔ اردو الفاظ کے انڈکس کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہے۔ صفحہ نمبر کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہے۔ اردو ترجمے اور عربی عبارت میں سے کوئی بھی لفظ تلاش کیا جاسکے گا۔ ہر لفظ کی کل تعداد استعمال اور کہاں کہاں استعمال ہوا ہے معلوم کیا جاسکے گا۔ تلاش کئے گئے لفظ کے مقام استعمال صفحہ کو دکھایا بھی جائے گا۔ قرآن حکیم کی مکمل تلاوت شامل ہے۔ خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں بنایا گیا ہے۔ مٹانے والے اور اے کا نام اردو اور انگریزی زبان میں شامل کیا جائے گا۔ پر تنگ کی سہولت: مختلف انداز میں پر تنگ کی سہولت موجود ہوگی۔ چوں کی دلچسپی کے لئے تصویریں پزل (۱۰ اعداد) شامل کئے ہیں۔ چوں کی معلومات میں اضافے کیلئے قرآن کے متعلق معلومات (۱۰ صفحات) شامل کئے گئے ہیں۔ چوں کی معلومات میں اضافے کیلئے قرآن کے متعلق معلومات میں سے سوال نمبر چار جوابات (۵۰ سوالات) پوچھے جاسکتے ہیں۔ دوسری بننے والی اسلامک سی ڈیز کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دیگر متفرق خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

فوائد اس سی ڈی سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔ سی ڈیز پر آنے سے ڈیٹا زیادہ قابل استعمال ہو جائے گا۔ حجم میں کمی ہو جائے گی ہے۔ قیمت میں کمی ہو گئی ہے۔ انٹرنیٹ اور ویب (web) پر بھیجا آسان ہو جائے گا۔ زمان و مکان کے لحاظ سے دائرہ کار میں وسعت آجائے گی۔ عوامی شعور و آگہی میں اضافہ ہوگا۔ تفسیر قرآن میں عمومی دلچسپی بڑھے گی۔ کمپیوٹر جیسے نئے میڈیا پر اس طرح کے پروگرامز کے مثبت اثرات ہونگے۔ عوام الناس کو قرآن فیسی میں مدد ملے گی۔ علماء، محققین اور دانشمندان کو فصل الخطاب پر تحقیق میں مدد ملے گی۔ اردو ادب اور اردو زبان کی ترقی میں مدد ملے گی۔ مختلف مکاتب فکر اس علمی ذخیرے سے فائدہ اٹھائیں گے۔

مباح القرآن نمبر 10۔ نگار امپلڈنگ فون: 7320571

قرآن سنٹر 24 الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور فون نمبر 7312133-7314311